آمریت کے سائے
مُمتاز حُسین شاہ (ایڈووکیٹ)

مصنّف ———— ممتاز حسین شاہ ایڈووکیٹ

مرتّب و معاون ———— اشتیاق احمد خان پاکستانی

شائع کردہ ———— شاہین انٹرپرائزز

شاہین لاء بک ہاؤس

۲۸ - ...ی بلڈنگ نزد لائٹ ہاؤس سینما

ایم اے جناح روڈ کراچی فون ۷۳۶۳۱۰

تاریخِ اشاعت ـــــــــــ اپریل ۱۹۸۹ء بمطابق رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ
تعداد اشاعت بار اوّل ـــــــــ ایک ہزار
مصنف ـــــــــــــ ممتاز حسین شاہ ایڈوکیٹ
طابع ـــــــــــــ اشتیاق احمد خان پاکستانی
ناشر ـــــــــــــ شاہین انٹرپرائزز
(شاہین لاء بک ہاؤس)

۲۸۔ سیفی بلڈنگ نزد لائٹ ہاؤس سینما ایم اے جناح روڈ کراچی۔ پاکستان
فون نمبر ۱۰ ۶۳ ۷۳

طباعت ـــــــــــ کیف پرنٹنگ پریس، کراچی / سٹی پرنٹرز، کراچی
کتابت ـــــــــــ عاصم لطیف
قیمت ـــــــــــ ۱۵۰ روپے

میں اپنی زوجہ ممتاز نگہت کا انتہائی ممنون و مشکور ہوں کہ اُن کے خلوص اور محبّت نے نہ صرف مجھے تکلیف دہ حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دیا بلکہ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں اپنی گھریلو مصروفیات کے باوجود میری بھرپور اور پرخلوص معاونت کی۔

(سیّد ممتاز حسین شاہ ایڈوکیٹ)

اِنتساب

تیسری دُنیا کے عظیم رہنما جناب ذوالفقار علی بھُٹوّ کے نام
جن کا عالمگیر پیغام دُنیا بھر کے مزدوروں، کسانوں اور مظلوم
انسانوں کے دلوں میں تا اَبد زندگی کی حرارت اور توانائی پیدا
کرتا رہے گا۔

سیّد مُمتاز حسین شاہ ایڈوکیٹ

قائدِ عوام شہید ذوالفقار علی بھٹوؒ

فہرست مضامین

صفحات نمبر	عنوانات	نمبر شمار
۱۸۶	یحییٰ خان کا قوم سے خطاب	۱۲۵
۱۸۷	شیخ مجیب کی شرائط	۱۲۶
۱۸۷	متوازی حکومت کے قیام کا اعلان	۱۲۷
۱۸۷	مشرقی پاکستان کے فسادات اور غیر بنگالیوں کا قتلِ عام	۱۲۸
۱۸۸	بربریت کی چند ایک مثالیں	۱۲۹
۱۸۹	بنگالی طلباء کے بین الاقوامی احتجاجی مظاہرے	۱۳۰
۱۸۹	حمود الرحمٰن کمیشن میں ولی خان کا بیان	۱۳۱
۱۹۰	شیخ مجیب کا یکطرفہ اعلانِ آزادی	۱۳۲
۱۹۰	یحییٰ، مجیب، بھٹو ملاقات	۱۳۳
۱۹۰	مذاکرات کا ایجنڈا	۱۳۴
۱۹۱	یحییٰ کا قوم سے خطاب اور خانہ جنگی کا آغاز	۱۳۵
۱۹۲	چند ضروری حقائق	۱۳۶
۱۹۶	قراردادِ پاکستان	۱۳۷
۲۰۲	خود فریبی کا انجام تباہی	۱۳۸
۲۰۶	پولینڈ کی قرارداد	۱۳۹
۲۰۹	سقوطِ ڈھاکہ	۱۴۰
۲۱۵	شکست کے بعد یحییٰ خان کا منصوبہ	۱۴۱
۲۱۸	اسلامی سربراہی کانفرنس	۱۴۲
۲۱۹	ایٹمی ری ایکٹر کا معاہدہ	۱۴۳

نمبر شمار	عنوانات	صفحات نمبر

صفحات نمبر	عنوانات	نمبر شمار
۲۴۹	ضیاء الحق کا آئین سے ایک اور ظالمانہ مذاق	۱۶۳
۲۵۱	جنرل ضیاء کی عیاری و مکاری کا اہم راز	۱۶۴
۲۵۲	عبوری آئینی حکم نمبر ا ۱۹۸۱ء	۱۶۵
۲۵۶	ضیاء الحق کا نظریۂ انصاف اور اس کی چیرہ دستیاں	۱۶۶
۲۵۷	ضیاء الحق کا عدلِ گستری	۱۶۷
۲۵۷	ضیاء الحق کا سستا اور فوری انصاف	۱۶۸
۲۵۸	کوڑے بازی اور توہینِ انسانیت	۱۶۹
۲۶۰	"پی۔سی۔او" پر ماہرین کی رائے	۱۷۰
۲۶۲	ضیاء الحق اور عدلیہ کی آزادی	۱۷۱
۲۶۳	مجلسِ شوریٰ کا قیام	۱۷۲
۲۶۶	مجلسِ شوریٰ کا خاتمہ اور عام انتخابات کا اعلان	۱۷۳
۲۶۷	جنرل ضیاء الحق کا ریفرینڈم ۱۹۸۴ء	۱۷۴
۲۶۸	ایم۔آر۔ڈی کا اعلانِ بائیکاٹ	۱۷۵
۲۶۸	ریفرینڈم کے نتائج اور قومی و بین الاقوامی رائے عامہ	۱۷۶
۲۷۰	۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات	۱۷۷
۲۷۲	ایم۔آر۔ڈی کا انتخابی بائیکاٹ	۱۷۸
۲۷۲	غیر جماعتی مگر سیاسی انتخابات	۱۷۹
۲۷۴	آئین کی بحالی کا حکم	۱۸۰
۲۸۳	آئین کا آٹھواں ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۵ء	۱۸۱

نمبر شمار	عنوانات	صفحات نمبر

مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۸۹ء بروز جمعرات
بمطابق ۱۴ شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ

اشتیاق احمد خان پاکستانی
کراچی ۔ پاکستان

آغازِ تکلم

گذرتے لمحات ماضی کا حصہ بن کر تاریخ کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ اسی طرح وطنِ عزیز پاکستان کے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو عالمِ وجود میں آنے کے بعد یہاں پیش آنے والے مختلف النوع واقعات بھی تاریخ کا حصہ بنتے چلے گئے۔ آزادی کے بعد سے آج تک مختلف ملکی حالات، سیاسی و فوجی طرزِ حکومت اور دیگر موضوعات پر بے شمار کتابیں مختلف اوقات میں منظرِ عام پر آچکی ہیں جبکہ مستقبل میں بھی ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ لیکن زیرِ نظر کتاب "آمریت کے سائے" اپنی نوعیت کی شاید پہلی اور مفید کتاب ثابت ہو، کیونکہ اس کتاب میں ملکی و غیر ملکی حالات، ملکی حکمرانوں، سیاستدانوں اور علماء کے کردار کو واضح طور پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور پاکستان کی سیاست پر غیر ملکی دباؤ کے اثرات کا بے لاگ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جس طرح زیرِ نظر کتاب مصنف کی پہلی کاوش ہے اسی طرح یہ اپنے موضوعات اور طرزِ تحریر و بیان میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ جناب ممتاز حسین شاہ صاحب پیشے کے اعتبار سے ایک وکیل ہیں لیکن اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات و نظر ملکی و غیر ملکی حالات و واقعات پر کس قدر گہری اور

فکر انگیز ہے۔ موصوف نے اس کتاب کے پہلے عنوان " بنیادی حقوق اور مارشل لاء" کی ابتدا ہی ارشادِ ربّانی کے حوالے سے کی ہے۔ جس میں انسانی عظمت کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ لیکن قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ اسی انسانی طبقے کے ایک مخصوص گروہ نے جسے حکمران کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ان میں سرِ فہرست آمر حکمراں ہیں۔ آمریت کے بھی کئی انداز ہوتے ہیں جن پر مصنّف نے قلم اٹھایا ہے۔ آمریت کے مخصوص انداز جو ہمارے ملک میں روزِ اوّل ہی سے نظر آتے ہیں ان میں سردار، جاگیردار، وڈیرے، مُلک، خان اور ان میں سب سے بدترین آمر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹرز ہیں۔ مندرجہ بالا آمروں سے ہٹ کر ہمارے معاشرے میں ایک اور طبقہ بھی ہے۔ جس کا ظاہری تعلق مذہب سے ہے۔ پاکستان کی آزادی سے پہلے متحدہ ہندوستان میں بھی یہ طبقہ اپنے مذموم کاروبار میں مصروفِ عمل تھا۔ اور اس نے عام انسانوں کو خدائے واحد کی پرستش اور دینِ اسلام کی عمومی و حقیقی تعلیمات سے ہٹا کر اپنے گھناؤنے عزائم کی تکمیل کے لیے انہیں مختلف فرقوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا تھا۔ جبکہ اس کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کو بغیر کسی ہچکچاہٹ اور تردّد کے کفر کا فتویٰ صادر کرنے سے بھی دریغ نہ کیا گیا۔ جس کے باعث سر سیّد احمد خان، علاّمہ اقبال اور بابائے قوم قائدِاعظم محمّد علی جناح جیسے مفکّرین و دانشور اور رہنمایانِ قوم بھی کفر کے نام نہاد فتوؤں سے نوازے گئے لیکن قابلِ تحسین ہیں یہ لوگ کہ انہوں نے صبر کا دامن تھامے رکھا، حوصلہ نہ ہارا اور قوم کی رہنمائی کا کام اپنے اپنے انداز سے جاری رکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ ان اور ان جیسی دوسری عظیم شخصیات کی بدولت ہی پاکستان وجود میں آیا اور مسلم قوم کو

اپنا ایک علیحدہ وطن مل سکا۔ آزادی کا حصول کوئی آسان کام نہیں لیکن آزادی کو برقرار رکھنا حصولِ آزادی سے کہیں زیادہ مشکل ہے جس کی برقراری میں ہم بُری طرح ناکام رہے۔ جوکہ اس قوم کا ایک عظیم المیہ ہے۔

"حقوقِ انسانی" کے سلسلے میں اس کتاب میں مغربی مفکّرین کی گرانقدر آرا کو بھی پیش کیا گیا ہے اور اقوامِ متحدّہ کا منشور بیان کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسان اور احترامِ انسانیت کی قدر و قیمت ہمارے لیے کس قدر لازمی ہے۔ جب تک ہم انسان کی عظمت کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے پُرخلوص عملی اقدام نہیں کرتے، ہم کسی طور پر بھی مہذّب معاشرے کے افراد یا حکمراں کہلانے کے مستحق نہیں بن سکتے۔ زیرِ نظر کتاب میں مختلف موضوعات کی اہمیّت کو اُجاگر کرنے کے لیے جا بجا قرآنِ حکیم، احادیث نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، مقدّس آسمانی کتابوں، مسلم و غیر مسلم دانشوروں اور مفکّرین کے علاوہ ماضی میں شائع شدہ مختلف کتُب و رسائل کے حوالوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور اِسی اعتبار سے اُردو و فارسی کے منفرد اور خوبصورت اشعار کا بھی برمحل استعمال کیا گیا ہے۔

"امریکہ اور محمّد علی جناح" کے زیرِ عنوان شاہ صاحب نے بابائے قوم حضرت قائدِ اعظم محمّد علی جناح کی سیاسی بصیرت کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ جس سے قائدِ کی خارجہ پالیسی کا ایک خاکہ صاف طور پر نظر آتا ہے۔ پاکستان کو بابائے قوم نے ایک مسلم مملکت کی حیثیت سے دنیا میں متعارف کرایا اور یہ واضح کر دیا کہ پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ریاست ہوگا نہ وہ کسی بھی سپُر پاور امریکہ یا رُوس کی سیاسی برتری اور دیگر نظریات کو اپنے اُوپر مسلّط کرنے نہیں دے گا۔ ہندوستان جوکہ ہمارا انتہائی قریبی پڑوسی ہے

کے ساتھ بدقسمتی سے شروع ہی دن سے تعلقات ابتر رہے ہیں اور جو تنازعات ابتدا ہی سے پیدا ہو گئے تھے خوشگوار تعلقات کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے۔ ان دونوں پڑوسیوں میں بداعتمادی کی فضا قائم رہی جسے نہ صرف قائم رکھنے بلکہ اضافہ کرنے میں ہر دو جانب کے حکمرانوں اور متعصّب و تنگ نظر مذہبی و سیاسی حلقوں نے خوب خوب اپنے مفادات کے حصول کے لیے کام کیا۔ جس کے نتیجے میں دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے کے آج تک قریب نہ آسکے۔ جس کا دونوں ممالک کے سنجیدہ اور محبِ وطن طبقوں کو افسوس ہے۔ "دساتیرِ پاکستان" اس کتاب کے اہم موضوعات میں سے ایک ہے۔ اس ملک و قوم کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی کہ آزادی کے کئی برسوں بعد تک تو یہ سرزمین بے آئین ہی رہی لیکن جب ۱۹۵۶ء کا آئین کسی طرح بن بھی گیا تو اسے پوری طرح نافذ ہی نہ ہونے دیا گیا اور فوجی آمر ایوّب خان نے اس نوزائیدہ مملکت پر بزورِ طاقت قبضہ کر لیا۔ ۷ راکتوبر ۱۹۵۸ء کو رات کی تاریکی میں صدر اسکندر مرزا نے ایک سیاہ کارنامہ انجام دیا جبکہ ۲۷ راکتوبر یعنی بیس یوم بعد ہی ایوّب خان نے مکمّل طور پر اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ جس کے ذریعے ملک کا آئین منسوخ کر دیا گیا۔ مرکزی و صوبائی حکومتیں برطرف کر دی گئیں، قومی و صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئیں اور ملک میں جنگل کا قانون یعنی مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ اس طرح قوم کی نو سالہ آئینی جدّوجہد کو پامال کر دیا گیا۔ بدقسمتی سے یہ تمام ترتباہی اپنے ہی جرنیلوں کے ہاتھوں نازل ہوئی تھی۔ یہ ظالمانہ سلسلہ ایوّبی آمریت تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ اسی فوجی ڈکٹیٹر نے اپنے ہی تخلیق کردہ ۱۹۶۲ء کے آئین کا مذاق اڑاتے ہوئے اپنے اقتدار کا خاتمہ ہوتے دیکھ کر

ایک اور فوجی آمر جنرل یحییٰ خان کو اس ملک و قوم کی تقدیر کا مالک بنا دیا۔ جبکہ اس کے پاس ایک آئینی راستہ یہ تھا کہ وہ قومی اسمبلی کے اسپیکر کو اقتدار حوالے کرنا اور خود باعزّت طور پر اقتدار سے علیحدگی اختیار کر لیتا لیکن ایوب خان نے اپنے اقتدار کے خاتمے کا ملک و قوم سے یہ انتقام دانستہ طور پر لیا تھا کیونکہ وہ ہر آمر کی طرح اپنی ذات اور ملک کو لازم و ملزوم سمجھنے لگا تھا۔ یحییٰ خان نے اپنی ناعاقبت اندیشی اور عیاّشی کے باعث اس ملک کو ہی توڑ دیا۔ اور دنیا کے علاوہ عالمِ اسلام کی درخشندہ تاریخ کو داغدار کر دیا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سیاہ ترین باب کا اضافہ کیا، اسی کے حکم پر غیورّ اور بہادر افواجِ پاکستان کے ترانوے ہزار جوانوں نے غیر مسلم اور ازلی دشمن بھارت کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ یہی نہیں بلکہ ستم ظریفی یہ بھی تھی کہ پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ بھی دشمن کے تسلّط میں چلا گیا۔ یہ بدترین داغ جس آسانی سے اس ملک اور مسلم قوم پر لگایا گیا تھا اسے دھونا اسی قدر مشکل ترین بھی ہے جو شاید تاقیامت نہ دھویا جا سکے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی پلک جھپکتے ہی نہیں ہو گئی تھی بلکہ اس کا بیج آزادی کے بعد ابتدائی دور سے بونا شروع کر دیا گیا تھا۔ جس میں سیاسی، اقتصادی، معاشی اور دیگر سب ہی عوامل کار فرما تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس خطّے کے لوگوں کو کبھی بھی کھلے اور صاف ذہن کے ساتھ اقتدار میں شریک ہی نہیں کیا گیا اور بھولے سے کبھی ایسا کیا بھی گیا تو بادلِ نخواستہ اور محض دنیا دکھاوے کے لیے ہی کیا گیا۔ اوّل تو مغربی پاکستان کے حکمرانوں، سیاستدانوں، معاشی اجارہ داروں اور بیوروکریسی نے مشرقی پاکستان کے باسیوں کا ہر سطح پر فاتحانہ و فخریہ انداز میں استحصال کیا۔ یہی نہیں بلکہ اس بڑے حصّے کو خود پر عذابِ الٰہی

یا بوجھ جانا۔ انھیں "بھوکا بنگالی" ہونے کا گھٹیا طعنہ دیا اور قدرتی آفات سیلاب وغیرہ کو بھی انہی کا گناہِ عظیم سمجھا گیا۔ جوان محبِّ وطن عوام کے ساتھ سراسر زیادتی بھی تھی۔ درحقیقت یہاں یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ:۔

"نفرت سے نفرت ہی جنم لیتی ہے۔ نفرت کے بیج بونے سے محبّت کے پھول ہرگز نہیں کھل سکتے۔ جبکہ محبّت سے محبّت ہی جنم لیتی ہے اور محبّت نفرت وحقارت کی جڑیں اکھاڑ پھینکتی ہے۔" یا پھر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "کانٹے بو کر پھولوں کی تمنّا عبث ہے۔" سو ہم نے یہاں جو کچھ بویا تھا وہی کاٹ لیا۔ زیرِ نظر کتاب "آمریت کے سائے" میں ان تمام حالات و واقعات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے جس کے مطالعے سے بہت سے تلخ حقائق سے پردہ اٹھتا نظر آئے گا جس کے لیے اس سے قبل بھی مختلف مواقع پر دیگر احباب نے اپنی سی سعی کی ہے لیکن شاہ صاحب نے جس حسین پیرائے میں ان واقعات کو قلمبند کیا ہے یہ انہی کی ذات کا حصّہ ہے۔ کیونکہ اس کتاب کا اندازِ بیان انتہائی سادہ اور آسان ہے جسے پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کسی عالِم، فاضل، مفکّر یا دانشور کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہماری بدقسمتی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ایک مخصوص طبقے نے اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے ملک کے پہلے وزیرِ اعظم جناب خان لیاقت علی خان کو اپنی راہ سے ہٹانے کے لیے دن دہاڑے بھرے جلسۂ عام میں قتل کرا دیا۔ مزید ستم یہ کہ اڑتیس برس گزر جانے کے باوجود آج تک اس خفیہ ہاتھ کا پتا ہی نہ چلایا جا سکا جس نے وزیرِ اعظم کو قتل کرایا۔ یہ المناک واقعہ آج تک ایک سربستہ راز ہی کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ ایوّب خان کی حکمرانی کا دور کسی لحاظ سے بھی ایک اچھا دور

نہیں تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ بعض بدعتوں کی ابتداء ہی اس فوجی آمر کے باعث ہوئی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑی سرعت سے بڑھتی اور پھیلتی چلی گئیں بالآخر وہ ایک ناسور کی شکل اختیار کر گئیں۔ ایوب خان نے سب سے پہلے ملکی آئین توڑا، مارشل لاء نافذ کیا جبکہ عدلیہ کو مفلوج کرنے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔ تمام تر بنیادی اور سیاسی اداروں کی شکست و ریخت بھی اسی فوجی آمر کا کارنامہ ہے۔ ایوب خان کی زر پرستی بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں جس کا تذکرہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ سیاست اور سیاستدانوں سے نفرت ہر آمر بالخصوص فوجی آمروں کا خاصہ ہوتا ہے۔ انہیں ان دونوں سے للّٰہی بغض ہوتا ہے جو ایوب خان میں بھی بدرجۂ اتم موجود تھا چنانچہ اسی جذبے کے تحت اس نے سیاستدانوں کو ایبڈو قرار دیا تھا کیونکہ سیاستدان ہی ہر فوجی آمر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ وطن سیاستدانوں ہی کی شب و روز کی طویل جدّ و جہد کے نتیجے میں حاصل ہوا تھا نہ کہ کسی فوجی آمر نے اس ملک کو آزادی کی نعمتِ عظمیٰ سے سرفراز کیا تھا۔ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ "بدترین سے بدترین سیاسی جمہوری و عوامی حکومت بہترین سے بہترین فوجی آمریت (حکومت) سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔"

ہمارے ملک کی تاریخ گواہ ہے کہ اس ملک پر تین فوجی آمر عرصۂ دراز تک مسلّط رہے۔ پہلے آمر ایوب خان کے زمانے میں ہی پاک بھارت جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہوئی جسے ہماری بہادر مسلّح افواج نے بڑی بے جگری سے لڑا جس پر پوری قوم انہیں خراجِ تحسین پیش کرتی ہے لیکن یہ

میدانِ جنگ میں جیتی ہوئی جنگ ایک آمر نے اپنی کم عقل اور سیاسی بصیرت سے عاری ہونے کے باعث مذاکرات کی میز پر "تاشقند معاہدے" کی صورت میں بآسانی ہار دی اور بھارتی وزیرِ اعظم مسٹر لال بہادر شاستری اسی خوشی میں حرکتِ قلب بند ہو جانے کے باعث تاشقند ہی میں اس دارِ فانی سے سِدھار گئے ۔ جبکہ اسی پہلے فوجی آمر کے مسلّط کردہ دوسرے فوجی آمر جنرل یحییٰ خان نے آدھے سے زیادہ ملک کھو دیا ۔ اور دشمن بھارت کے سامنے اپنی بہادر مسلم فوج سے ہتھیار ڈلوائے انہیں جنگی قیدی بننے پر مجبور کر دیا۔ اور پانچ ہزار مربّع میل کا علاقہ بھی دیکھتے ہی دیکھتے بھارت کے قبضے میں چلا گیا اس طرح تاریخِ عالم اور اسلامی دنیا کی تاریخ میں ایک سیاہ ترین باب کا اضافہ کر دیا گیا جبکہ ایک سیاستدان اور قوم کے منتخب نمائندے نے اس شرمناک و ذلّت آمیز شکست کو اپنے سیاسی تدّبر، فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے مذاکرات کی میز پر فتح میں بدل دیا ۔ یہ کارنامہ پاکستان کے عظیم سپوت اور وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹّو نے "شملہ معاہدہ" کا کارنامہ اقتدار میں آنے کے محض سات ماہ کے عرصے میں ہی انجام دیا۔ اور بھارت کی جہاندیدہ و تجربہ کار سیاستدان وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی سے سیاسی مذاکرات کے ذریعے بغیر کسی جنگ میں ملوث ہوئے اپنے ہتھیار ڈال دینے والے ترانوے ہزار فوج کے جوانوں کو آزاد کروایا اور ان کی باعزّت وطن واپسی کو ممکن بنایا ساتھ ہی ساتھ دشمن کے قبضے سے اپنا چھن جانے والا پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ بھی واگذار کرا لیا ۔ یہ حقیقت بھی ہم پر عیاں ہے کہ تینوں فوجی آمروں جن میں ایوّب خان، یحییٰ خان اور جنرل ضیاء الحق شامل ہیں کا تعلق ایک مخصوص طبقے ہی سے

تھا اور یہ تینوں ایک ہی عالمی سپر پاور کے پروردہ تھے انہوں نے اپنے پورے دورِ اقتدار میں انہی کے مفادات کے لیے کام کیا اور اپنے ملک و قوم کے مفادات کا کسی طور پر بھی خیال نہ کیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تیسرے فوجی آمر جنرل ضیاء الحق نے دونوں سابقہ فوجی آمروں سے بڑھ کر خود کو قوم پر مسلّط کیے رکھا اور گیارہ سال تک اِقتدار میں رہنے کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اس نے براہِ راست تو کوئی جنگ نہیں لڑی البتہ افغانستان کے مسئلے میں اپنی ٹانگ اڑا کر اپنے آقا کی خوشنودی اور اُن کے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے دوسروں کی جنگ اپنے ملک پر مسلّط کر لی۔ حقیقی طور پر افغانستان کی جنگ دو سپر طاقتوں یعنی امریکہ اور روس کی جنگ تھی۔ امریکہ نے اس جنگ کے لیے پاکستان کی سرزمین کو منتخب کیا اور اپنے پٹھو جنرل ضیاء الحق کے ذریعے یہ جنگ لڑنے میں کامیاب رہا۔ اس جنگ سے دیگر نقصانات کے علاوہ ہمیں نتیجتًا یہ حاصل ہوا کہ تیس لاکھ سے زائد افغانی ہمارے وطن میں مہاجرین کا روپ دھارے مقیم رہے۔ ان کی حکومتی سطح پر بھرپور طریقے پر امداد کے علاوہ دیگر محاذوں پر تائید و حمایت کی جاتی رہی، جس سے اپنے ہی وطن کے باسی باہمی منافرت و انتشار کا شکار ہو گئے اور آج تک مختلف النّوع مسائل میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ جن میں سرِفہرست ہیروئن کے شکار لاکھوں نوجوان موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہیں جبکہ بے شمار اپنی جان سے ہاتھ بھی دھو بیٹھے ہیں۔ کلاشنکوف، میزائل اور دیگر ہتھیار ملک بھر میں پھیل چکے ہیں جس کے نتیجے میں ایک بھائی دوسرے بھائی کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ نسل پرستی کا تحفہ بھی اسی جنرل ضیاء الحق کا اس قوم

کو ایک بہترین و نایاب تحفہ ہے، جس کی وجہ سے کراچی و حیدرآباد کے
ہزاروں خاندان اپنے جگر گوشوں اور سرپرستوں سے محروم ہو چکے
ہیں۔ آٹھ سال پہلے تک پاکستان میں کوئی بھی شخص ہیروئن کی لعنت
سے آشنا نہیں تھا نہ ہی ہتھیاروں کی آزادانہ خرید و فروخت ہوتی تھی
یہ سب کچھ انعام ہمیں افغانستان کی جنگ میں خود کو ملوّث کرنے کے
صلہ میں ہی ملا ہے۔ جس کی تمامتر ذمہ داری صرف اور صرف جنرل ضیاء الحق
پر ہی عائد ہوتی ہے اور وہی بے گناہ افراد کی اموات کا مجرم بھی ہے۔
"آمریت کے سائے" میں دوسرے فوجی آمر جنرل یحییٰ خان کی آمرانہ
حکومت کے علاوہ ان کے ذاتی کردار پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جو
ہماری قومی زندگی پر ایک بد نما اور سیاہ داغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یحییٰ خان
کی آوارگی، عیاشی اور بدقماشی کی داستانیں یوں تو گذشتہ برسوں میں مختلف
اوقات میں مختلف انداز سے ملکی و غیر ملکی اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی
ہیں اور اس موضوع پر مختلف کتابوں میں بھی طبع آزمائی کی جاتی رہی ہے
لیکن زیر نظر کتاب میں یحییٰ خان کی جن آوارگیوں، عیاشیوں اور بداعمالیوں
کا ذکر کیا گیا ہے اس میں مصنّف کے بھی کچھ ذاتی مشاہدات شامل ہیں جن
کے باعث اس موضوع کی اہمیت و دلچسپی اور بڑھ گئی ہے۔ اسی
سلسلے میں موصوف اپنے ذاتی مشاہدات کا "پریذیڈنٹ ہاؤس پر تعیناتی"
کے عنوان سے انکشاف کرتے ہیں کہ ایوانِ صدر کراچی، صدر ہاؤس کے
بجائے ایک قحبہ خانے کی حیثیت رکھتا تھا اور جن دنوں صدر گرامی یہاں
رونق افروز ہوتے تو اس کی رونقیں عروج پر ہوتیں۔ یہاں کسی شریف النفس
انسان کا خواہ اس کا تعلق کسی بھی طبقے یا فکر و نظر سے ہو، گذر نہیں ہوتا

تھا۔ البتہ ہر ہفتے، عشرے، مہینے میں یحییٰ خان کی آمد پر یہاں بے ضمیر، بے غیرت، بے حس اور ننگِ انسانیت لوگوں کا ہی جمگھٹا نظر آتا تھا اور ایوانِ صدر شراب و شباب کی رنگین محفلوں ہی کے لیے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا جب صدر گرامی کراچی سے تشریف لے جاتے تو پھر ایوانِ صدر کی صفائی و ستھرائی کے لیے شب و روز کام ہوتا اور قیمتی قالینوں پر گری ہوئی آلودگی کو صاف کیا جاتا، اس جگہ کی بھی خوب خوب دھلائی کی جاتی تھی یہاں راتوں کو جگمگانے اور یحییٰ خان نیز ان کے ساتھی جرنیلوں کے دل بھانے کے لیے آنے والی خواتین کا تعلق کسی معمولی گھرانے سے نہیں ہوتا تھا بلکہ ان محفلوں کی جان اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز افراد کی خواتین جن میں کوئی کسی کی بہن ہوتی تو کوئی کسی کی بیٹی اور بیوی۔ ان خواتین میں سرِفہرست بلیک بیوٹی عرف جنرل رانی اور ترانہ وغیرہ تھیں۔ ان پُرشباب و رنگین محفلوں کا ذکر انتہائی اختصار سے کیا گیا ہے جبکہ اس انداز کی داستانیں تو انتہائی طویل اور دلچسپ ہیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ وطنِ عزیز آگ و خون میں نہایا ہوا تھا اور دشمن کی فوجیں برسرِ پیکار تھیں۔ بالآخر مکافاتِ عمل شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نام نہاد صدر اور سپہ سالار افواجِ پاکستان اور اس کے دیگر ساتھی جرنیلوں کے شرمناک گناہوں کی بدولت مشرقی پاکستان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے علیحدہ ہو گیا جبکہ یہی صدر مغربی پاکستان کے عوام کو گمراہ کرنے کے لیے ان ہی لمحات میں جنگ جاری رکھنے اور دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی نوید دے رہا تھا۔ اگلی سطور میں یحییٰ خان کی شراب نوشی اور عیاشی کے ضمن میں اہم انکشافات کا سلسلہ یہ بھی بتاتا ہے کہ غیر ملکی سربراہان سے ملاقات کے دوران بھی ان کا رویہ کسی طرح بھی

ایک سربراہِ مملکت کے شایانِ شان ہرگز نہ ہوتا تھا جس کی چند ایک مثالیں پیش کی گئی ہیں جیسا کہ ایرانی بادشاہت کے ڈھائی ہزار سالہ جشن کی تقریب میں صدر صاحب کا فوجی وردی میں ہی پیشاب کا خطا ہو جانا، پوری پاکستانی قوم ہی نہیں بلکہ مسلم اُمّہ کے لیے بھی شرمناک بات تھی۔ اسی طرح روسی رہنما پدگورنی کے ساتھ ملاقات پر اوباشانہ گفتگو کا ذکر بھی قابلِ غور ہے جسے کوئی معمولی انسان بھی برداشت نہیں کر سکتا چہ جائیکہ کسی سُپر پاور کا سربراہ گوارا کرنا۔ اس گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سربراہ کی حیثیت سے ایک سربراہِ مملکت سے گفتگو نہیں فرما رہے بلکہ ایک بازاری انسان اپنی کسی محبوبہ یا بازاری فحاشہ عورت سے ہمکلام ہے۔ اسی طرح یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو نے یحییٰ خان سے اپنی ملاقات کے بعد اس شخصیت کے بارے میں جو تاثر بیان کیا وہ بھی اس قوم کی ذلّت کے لیے کافی تھا۔ یہ سربراہ قوم پر خدا کے بدترین عذاب سے کسی طرح بھی کم نہ تھے۔

یحییٰ خان کے تعلقات بھی امریکہ کیساتھ خصوصی نوعیت کے تھے اس لیے کہ وہ بھی ایک فوجی آمر تھے چنانچہ امریکہ نے اس سے بھی خاص نظرِ عنایت سے کام لیا کہ جمہوریت کشی اور آمریت کا دوام دیگر اقوام کے لیے امریکہ کا خاص مقصد رہا ہے۔ یحییٰ خان نے ۲ نومبر کو وَن یُونٹ کا خاتمہ کرتے ہوئے عام انتخابات کا اعلان کر دیا۔ ایک آدمی ایک ووٹ پر انتخابات کا فیصلہ کیا گیا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یحییٰ خان نے ہزار خرابیوں کے باوجود یہ انتخابات غیر جانبدارانہ، منصفانہ اور آزادانہ کرائے تھے۔ گرچہ پسِ پردہ مقاصد کچھ اور ہی کارفرما تھے۔ ملک ٹوٹنے کے بعد عوام اور افواجِ پاکستان کے غیض و غضب کا نشانہ بن کر سزا سے

بچنے کیلئے بالآخر جنرل یحییٰ خان نے مغربی پاکستان جو کہ اب مکمل پاکستان تھا کے اکثریتی جماعت کے سیاسی رہنما جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کو بیرونِ ملک سے بلا کر ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ملک کی باگ ڈور اُن کے حوالے کر دی۔ اس طرح پاکستان کی تاریخ کا ایک یادگار مگر سیاہ ترین دور ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ختم ہو گیا۔ جس کے لیے بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ :۔

"خس کم جہاں پاک"

بعد ازاں جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ نے شکست خوردہ قوم اور افواج کو نیا حوصلہ عطا کیا اور شب و روز کی محنتِ شاقہ اور بہترین خداداد صلاحیتوں کی بدولت پاکستان کے ازلی دشمن بھارت کی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی سے شملہ میں مذاکرات کیے۔ اور ترانوے ہزار ہتھیار ڈال دینے والی پاکستانی افواج کی واپسی اور پانچ ہزار مربع میل مقبوضہ علاقے کی واگذاری جو کہ بظاہر ناممکن تھی کو ممکن بنایا۔ جناب بھٹوؒ کے لیے یہ انتہائی کڑا وقت تھا۔ چنانچہ آپ نے ہر دو محاذ یعنی اندرونی و بیرونی سطح پر اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے۔ اندرونی طور پر انقلابی اقدامات کیے جن میں زرعی اصلاحات کا اعلان، بڑی بڑی صنعتوں، بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کو حکومتی تحویل میں لے کر نیشنلائزڈ کیا تاکہ عوام کو اُن کے حقوق میسر آسکیں۔ تعلیمی اصلاحات کیں، سرداری نظام کا خاتمہ کیا، اور عوام جو ان سے بے شمار توقعات وابستہ کئے ہوئے تھے کے لیے جانفشانی سے شب و روز کام کیا۔ بین الاقوامی سطح پر ملکی وقار کو بحال کرنا اگرچہ کوئی آسان کام نہ تھا لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے اس مقصد میں بہت جلد کامیابی حاصل کر لی۔ آپ نے مسلم اُمہ کو ایک

پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے اسلامی سربراہ کانفرنس شاہ فیصل مرحوم کی مساعی کے ساتھ پاکستان میں منعقد کی۔ جسمیں انہوں نے تمام چھوٹی و بڑی مسلم مملکتوں کے سربراہوں کو پاکستان بلا کر مہمانی کا شرف بخشا، جس کے باعث پاکستان کا وقار بڑی حد تک بحال ہوگیا۔ اس کانفرنس میں عالمِ اسلام کی یکجہتی، ترّقی و خوشحالی کے لیے اہم اور بنیادی فیصلے کئے گئے۔ جسے امریکی سامراج نے کسی بھی طرح اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ دوسری طرف آپ نے ملک کی ترّقی کے لیے ایٹمی ری ایکٹر کے حصول کے لیے فرانس سے معاہدہ کیا۔ یہ دونوں باتیں بالخصوص امریکی سامراج کو ایک آنکھ نہ بھائیں اور انہوں نے جناب بھٹوؔ کو ان ترّقی پسندانہ اقدام سے باز رکھنے کے لیے اپنے وزیرِ خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر کو پاکستان بھیجا۔ انہوں نے اپنی حکومت کی جانب سے پاکستان کے لیے اقتصادی امداد کی بھرپور پیشکش کی اور سیاسی حمایت کا بھرپور یقین دلایا لیکن وزیرِ اعظم پاکستان نے امریکہ کی اس امداد و حمایت کو مسترد کردیا۔ جس پر ہنری کسنجر نے اپنے اعزاز میں وزیرِ اعظم کی دی گئی ضیافت میں تقریر کرتے ہوئے تمام تر سفارتی آداب کو بالائے طاق رکھ کر میزبان وزیرِ اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ کو کھلے الفاظ میں دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر پاکستان، ہندوستان کے مقابلے میں ایٹمی توانائی کی کوشش سے دستبردار نہ ہوا تو "ہم تمہاری حکومت کا تختہ الٹ دیں گے اور تمہاری ذات کو ایک خوفناک مثال بنا دیں گے"۔ لیکن جناب بھٹوؔ نے امریکی دھمکی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ملک و قوم کی فلاح کا اپنا مشن جاری رکھا چنانچہ اگست ۱۹۷۶ء میں امریکہ کی جانب سے دی گئی دھمکی پر عمل درآمد ہوا

اور جناب بھٹو مارچ ۱۹۷۷ء میں عوام الناس کے بھرپور انتخابی اعتماد کے باوجود برسرِ اقتدار نہ رہ سکے۔ اس لیے کہ پہلے تو اپوزیشن نے انتخابی دھاندلیوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر تحریک کا آغاز کیا لیکن اُسے ٹھنڈا پڑتے دیکھ کر اس تحریک کو نام نہاد "نظامِ مصطفیٰؐ" کی تحریک کا رُوپ دے دیا اور اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلتے ہوئے توڑ پھوڑ کا بازار گرم کر کے آمریت کی راہ ہموار کر دی۔ اس طرح امریکی سامراج کے مقاصد پورے ہو گئے اور عوامی حکومت کی جگہ ایک فوجی حکومت جنرل ضیاءالحق کی سربراہی میں چار پانچ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی رات شب خون مار کر قائم ہو گئی۔ جمہوری و آئینی حکومت کا سورج غروب کر کے آمریت کا سورج ایک بار پھر طلوع کر دیا گیا۔ چنانچہ پاکستان میں ایکبار پھر آمریت کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ ہر فوجی آمر کی طرح جنرل ضیاءالحق نے بھی امن و امان بحال کرنے، فوری الیکشن کرانے اقتدار منتخب حکومت کے حوالے کرنے کا اعلان کیا لیکن اس مرتبہ مخصوص تبدیلی اس آمر میں یہ نمایاں تھی کہ اس نے مذہب کا سہارا بطورِ خاص لیا تھا۔ جنرل ضیاءالحق نے بھی سب سے پہلے ہر ڈکٹیٹر کی طرح آئین کی پامالی کی جانب قدم بڑھایا لیکن کمالِ ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے آئین کو یکسر ختم کرنے کے بجائے اسے معطّل کر دیا کیونکہ یہی وہ پہلا پاکستانی آئین تھا جسے جناب بھٹو نے تمام سیاسی جماعتوں کے تعاون سے تیار کر کے نافذ کیا تھا اور اس پہلے متفقّہ اسلامی و جمہوری آئین میں جو ۱۹۷۳ء کے آئین کے نام سے تاحال جانا پہچانا جاتا ہے اور جس کے لیے جنرل ضیاء کی آمریت کے پورے زمانے میں تمام سیاسی جماعتوں نے مشترکہ جدّوجہد کے ذریعے بحال کرنے

پر زور دیا تھا میں ایک شق یہ بھی تھی کہ جو شخص بھی اس آئین کو توڑے گا وہ سزائے موت کا مستحق ہوگا، شاید جنرل ضیاءالحق کو اپنی جان بہت پیاری تھی اور اسے کسی جانب سے یہ خوف بھی تھا کہ کہیں اس کی پاداش میں مجھے تختۂ دار کا منہ نہ دیکھنا پڑے چنانچہ اس نے اسے معطّل کرنے ہی میں اپنی عافیت تلاش کر لی۔ آگے چل کر شاہ صاحب جنرل ضیاءالحق کے آمرانہ دور کے بارے میں لکھتے ہیں کہ :۔

دراصل جنرل ضیاءالحق کا نہ تو انتخابات کا انعقاد اور نہ ہی جمہوری حکومت کا قیام ہر آمر کی طرح مقصد تھا بلکہ یہ محض وقت گزاری اور اپنے اقتدار کی طوالت کے لیے راہ ہموار کرنے کا محض ایک بہانہ تھا۔ انتخابات کی واضح بقین دہانی اور تاریخوں کے اعلان کے باوجود جنرل ضیاء نے دو بار انتخابات ملتوی کئے اور اپنے محسن سابق وزیرِ اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو ایک مقدمۂ قتل میں گرفتار کر کے انھیں ۴ اپریل ۱۹۷۹ء کو تختۂ دار پر چڑھا دیا۔ جس کے بعد ان کے لیے میدان بالکل صاف تھا۔ امریکی سامراج جو جنرل ضیاءالحق کا آقا تھا جناب بھٹوؔ کی پھانسی سے اس کے مقاصد پورے ہو چکے تھے۔ اب مردِ میدان کوئی قابلِ ذکر سیاستداں نہ رہا تھا اور جو تھا بھی تو اُسے مسلسل قیدِ تنہائی کا نشانہ بنایا گیا۔ سیاسی مخالفین پر سرِعام اور جیلوں میں کوڑے برسائے گئے، طویل ترین قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار کیا گیا۔ حتّیٰ کہ سابق وزیرِ اعظم کی بیوہ محترمہ نصرت بھٹوؔ اور جواں سال صاحبزادی آنسہ بے نظیر بھٹوؔ کو بھی قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا اور پھر جبراً جلاوطنی پر مجبور کر دیا گیا اور دونوں بیٹوں کو بھی وطن کی سرزمین سے دور کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک بیٹے شاہنواز بھٹوؔ کو زہر دے کر فرانس

بیں قتل کرادیا گیا جبکہ دوسرا بڑا بیٹا آج تک وطن کی آزاد فضاؤں میں سانس لینے کو ترس رہا ہے کیونکہ اس کے خلاف بے شمار من گھڑت مقدمات بنا دیئے گئے تھے جن کے باعث مرتضیٰ بھٹو کی وطن واپسی ناممکن تھی۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان پیپلز پارٹی کے لاکھوں کارکنوں کو جیلوں میں ٹھونس دیا گیا اور ہزاروں فدائیانِ بھٹو کو اندرونِ ملک کوڑے بازی، جیلوں اور عقوبت خانوں کی قید و بند اور تشدد کا سامنا کرنا پڑا دیگر سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور رہنماؤں کو بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلنے کیلئے ہچکچاہٹ کا سہارا نہ لیا گیا۔ بالخصوص سیاست کو ایک گالی اور سیاستدانوں کو اخلاقی مجرم کی حیثیت سے بھی پست حیثیت کے طور پر اندرونِ ملک اور بین الاقوامی سطح پر پیش کیا گیا۔ اخبارات میں سیاستدانوں کے بیانات شائع کرنے پر پابندی لگادی گئی اور ان کی تصاویر چھاپنے سے بھی قانونی پابندیوں کے اطلاق سے روک دیا گیا ان کی دانست میں شاید یہ تھا کہ اس طرح عوام اپنے محبوب رہنماؤں کو بھول جائیں گے یہ محض ضیاء الحق کی خام خیالی ہی تھی بلکہ اس سے الٹے ہی اثرات مرتب ہوئے اور یہ حقیقت سامنے آگئی کہ عوام کے محبوب رہنما کو موت کے گھاٹ اتار کر بھی ان سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور یہ کہ "مردہ بھٹو" "زندہ بھٹو" سے زیادہ طاقتور اور خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ جنرل ضیاء نے نہ صرف یہ کہ عدلیہ کے اختیارات سلب کرلیے بلکہ جج صاحبان کو بھی ہتک آمیز طریقے سے ان کے فرائضِ منصبی سے علیحدہ کردیا گیا۔ آئین کی معطلی کے بعد پی سی او ۱۹۸۱ء کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ اور ابن الوقتوں، مفاد پرستوں اور اقتدار کے بھوکے افراد پر مشتمل ایک مجلسِ شوریٰ قائم کی گئی۔ جب اس سے بھی

کام نہ چلا تو ایک نام نہاد ریفرینڈم کرا کے خود کو مزید پانچ سال کیلئے منصب صدارت پر فائز کر لیا گیا۔ ۱۹۸۳ء کی ایم، آر، ڈی کی تحریک کے دباؤ میں مارچ ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی انتخابات کا انعقاد کر کے ملک میں علاقائیت کو فروغ دیا گیا جس کے نتیجے میں قوم نسلی طور پر نفرت کا شکار ہو گئی۔ کراچی و حیدر آباد میں ڈھائی سال تک وقفے وقفے سے بے گناہ و معصوم شہری خون میں نہاتے رہے۔ اور ہزاروں ہنستے بستے گھر اجاڑ دیئے گئے۔ جبکہ روشنیوں کا شہر کراچی جو ملک کا سب سے بڑا صنعتی مرکز تھا کو خوف و ہراس کی بھینٹ چڑھا دیا گیا جہاں سرِ شام ہی بازاروں میں سناٹا چھانے لگا اور لوگ خوف و دہشت کے باعث دن کو بھی گھروں سے نکلتے ہوئے گھبرانے لگے۔ اقتصادی طور پر ملک تباہی کے کنارے پر پہنچ گیا تھا۔ ڈاکہ زنی، لوٹ مار، چوری روزمرّہ کا معمول بن کر رہ گئے تھے نہ تو کسی کی عزّت محفوظ تھی اور نہ ہی کسی کا جان و مال۔ ان تمامتر حالات پر نام نہاد جمہوری حکومت بھی قابو نہ پا سکی بلکہ اس میں روزمرّہ اضافہ ہی ہوتا گیا۔ ہر چند کہ یہ جمہوری حکومت جنرل ضیاء کی مرہونِ منّت ہی تھی لیکن جب جناب محمّد خان جونیجو نے خود کو با اختیار وزیرِ اعظم ثابت کرنے کی کوشش کی تو ان کی حکومت کو آنِ واحد ہی میں یہ کہہ کر ختم کر دیا گیا کہ یہ تمام لوگ راشی، بدعنوان، نااہل اور مفاد پرست ہیں اور انھوں نے عوام کے مفاد کے لیے کوئی بھی کام نہیں کیا بلکہ تمام عرصے پلاٹوں کے حصول اور دیگر مراعات کے چکّر ہی میں پڑے رہے۔ قومی و صوبائی اسمبلیوں کو توڑ دیا گیا اور اپنی نت نئی شاطرانہ چالوں کے تحت دو روز بعد ہی ان حرام خور، راشی، بدعنوان، نااہل اور مفاد پرستوں کے ٹولے میں سے نگراں حکومتیں

قائم کردی گئیں۔ یہ سراسر اس قوم کے ساتھ مذاق تھا جو جنرل ضیاءالحق نے حسبِ سابق کیا تھا۔ نئی حکومتوں کی تشکیل پر عوام محوِ حیرت تھے کہ کیا ان تمام لوگوں کے گناہ دو ہی روز میں دُھل گئے وہ پلک جھپکتے کیسے فرشتہ صفت اور معصوم ہو گئے۔ جنرل ضیاءالحق نے جب مجلسِ شوریٰ قائم کی تھی تو ان کے ارکان کا حسب نسب معلوم کرنے کے لیے تحقیقات پولیس سے کرائی تھی۔ یہ کارِ خیر اسی پولیس کے ہاتھوں انجام دلوایا گیا تھا جس کی شہرت سے اس ملک کے عوام و خواص سب ہی بخوبی آگاہ ہیں اور ان کے سائے سے بھی دُور رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔ جنرل ضیاءالحق نے اپنی عوامی حکومت کو تین سال سے زیادہ برداشت نہیں کیا۔ اور انھیں گھٹیا قسم کے الزامات سے نواز کر رخصت کر دیا۔ اب ایکبار پھر عام انتخابات کا اعلان کیا گیا جس میں یہ بات غیر واضح تھی کہ تمام سیاسی پارٹیاں حصہ بھی لے سکیں گی کہ نہیں۔؟ ابھی یہ گومگوں کی کیفیت طاری ہی تھی کہ ۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء کے جہاز کو حادثہ پیش آیا اور وہ غیر متوقع طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آنِ واحد میں اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اور یوں ملک میں قائم گیارہ سالہ آمریت سے نجات کے باعث قوم نے اطمینان و سکون کا سانس لیا۔ اگرچہ یہ حادثہ اس لیے زیادہ المناک تھا کہ اس میں متعدّد فوجی جرنیل جو ملک و قوم کا عظیم سرمایہ تھے جنرل ضیاءالحق کے ساتھ ہلاک ہو گئے تھے۔

اللہ کو شاید اب ہماری قوم پر بہت زیادہ رحم آ گیا تھا چنانچہ اس حادثے کے باعث اللہ اللہ کر کے "آمریت کے سائے" دُور ہوئے۔ کرب کا احساس ختم ہونے لگا۔ لوگوں نے کھُلی اور آزاد فضاؤں میں سانس

لینا شروع کیا اور نگراں حکومت نے جس کے سربراہ قائم مقام صدر جناب غلام اسحاق خان تھے اجماعتی بنیاد پر عام انتخابات کا ۱۶ ار نومبر ۱۹۸۸ئ ہی کی تاریخ کے لیے اعلان کر دیا۔ اس لیے کہ یہ تاریخ خود جنرل ضیاء الحق نے مقرّر کی تھی۔ سب سے زیادہ قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ مسلّح افواج کے نئے سربراہ جناب مرزا اسلم بیگ نے اپنے پیش رو جنرل ضیاء الحق کی راہ سے اجتناب کرتے ہوئے آئینی راہ کو اپنایا۔ اور ہوسِ اقتدار کے متمنّی ٹولے کی ایک نہ سُنی۔ جس نے آپ کو اقتدار پر غاصبانہ قبضہ کر کے ملک کو ایکبار پھر آمریت کی تاریک راہوں پر دھکیل دینے کا مشورہ دیا تھا اس مخصوص اقتدار پسند ٹولے میں اور لوگوں کے علاوہ سب سے بڑے صوبے کے نگران وزیرِ اعلیٰ جو کہ اس وقت بھی وزیرِ اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہیں نے مسلّح افواج کے پُرعزم سربراہ کو غاصبانہ قبضے کی ترغیب دینا اپنا فرضِ اوّلین جانا اور اپنے آقا کا حقِ نمک ادا کرنے کی خاطر یہ خوشامدانہ، عیّارانہ و مکّارانہ اقدام اپنے مذموم مقاصد کے لیے اٹھانا مناسب تصوّر کیا تاکہ عوام اپنا جمہوری حق حاصل نہ کرسکیں جس کے لیے وہ گذشتہ گیارہ سالوں سے مسلسل بے پناہ قربانیاں دیتے آرہے تھے۔ لیکن اس عظیم سپوتِ وطن مرزا اسلم بیگ نے ان مفاد پرست لوگوں کی ایک نہ سُنی اور اپنے مالکِ حقیقی کی بارگاہ میں رجوع ہو کر اس سے درست فیصلے کے لیے دعا کی شاید یہ لمحات ان کی زندگی کے سب سے مشکل ترین لمحات تھے چنانچہ اللہ سے رجوع کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا آزادانہ اور بھرپور موقع ملا۔ اس کے نتیجے میں پوری دنیا میں اس کا کھویا ہوا وقار پھر سے بحال ہونے میں مدد ملی اور ملک و قوم ایک بار پھر آئینی راہ پر چل نکلے۔

پوری قوم نے فوج کے سربراہ کو لائقِ تحسین جانا اور انہیں ان کے اس مستحسن اقدام پر بھرپور خراجِ عقیدت پیش کیا جس کے لیے بہر حال وہ مستحق بھی تھے۔ فوجی سربراہ کے اس اقدام سے قوم میں فوج کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے میں بڑی مدد ملی اور پوری قوم اپنی بہادر افواج اور اس کے سربراہ کو اپنے ملک کا حقیقی محافظ سمجھنے لگی۔ انتخابات آزادانہ و منصفانہ طور پر ہوئے جس کے لیے ہم ایک بار پھر جناب غلام اسحاق خان صاحب، مسلح افواج کے سربراہ جناب مرزا اسلم بیگ صاحب اور چیف الیکشن کمشنر جناب جسٹس نصرت صاحب کو اپنی اور پوری قوم کی جانب سے مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انہی انتخابات کے نتیجے میں قومی و صوبائی اسمبلیاں تشکیل پائیں۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں نے اپنا اپنا کام شروع کر کے وطنِ عزیز کی تعمیرِ نو کا کام پھر سے شروع کر دیا جو ۵/جولائی ۱۹۷۷ء سے آمریت کے باعث رک گیا تھا۔ ہم اللہ تعالےٰ کے حضور دست بدعا ہیں کہ وہ آئندہ اس وطنِ عزیز کو "آمریت کے سائے" سے محفوظ و مامون رکھے اور جمہوریت کو قائم اور پروان چڑھانے میں قوم اور رہنمایانِ قوم کی رہنمائی و مدد فرمائے (آمین ثمہ آمین)۔ "پاکستان ایک روشن حقیقت اور ہماری پہچان ہے۔"

ہم اس کتاب کی اشاعت کے ذریعے جملہ حقائق بیان کرنے میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں اس کا فیصلہ اپنے پروردگار کے بعد آپ پر چھوڑتے ہیں کہ بہترین منصف اللہ تعالےٰ کی ذات کے بعد عوام الناس ہی ہوتے ہیں۔ وَما علینا اِلّا البلاغ۔

پاکستان پائندہ باد۔	پاکستانی عوام زندہ باد
جمہوریت زندہ باد	آمریت مردہ باد

وقتِ دعا یاد آوری کا طالب :۔ اشتیاق احمد خان پاکستانی

بنیادی حقوق اور مارشل لاء

تمام آسمانی کتابیں گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس دنیا میں اپنا خلیفہ یا نائب بنا کر بھیجا تھا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

"جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں تو انہوں نے کہا۔ کیا آپ زمین پر کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو وہاں خرابیاں پیدا کرے گا اور خون بہائے گا جب کہ ہم آپ کی حمد و ثناء اور آپ کی تقدیس بیان کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم وہ نہیں جانتے جو کچھ میں جانتا ہوں۔"

(سورۂ البقر آیت نمبر ۳۰)

تخلیقِ آدم کے بنیادی مقصد کے ساتھ یہ بات از خود سامنے آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نائب یقیناً مقتدر شخصیت کا مالک ہے۔ ایسی شخصیت جس کو فرائض کے ساتھ ساتھ ایسے حقوق اور مراعات سے بھی نوازا گیا ہے کہ جن کے بغیر فطرت کے مقاصد کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ اس اعتبار سے انسان فطری اور پیدائشی طور پر حقوق کا مالک ہے۔ لیکن انسانی تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ علمائے مذہب اپنی تعلیمات کی ساری قوت فرائض کی بجا آوری پر صرف کرتے رہے۔ اور نہ صرف یہ کہ انہوں نے انسان کے حقوق و مراعات کو یکسر نظر انداز کیا بلکہ اس کے بلند و بالا منصب سے بھی چشم پوشی کرتے رہے شائد یہ ایسی ہی حقیقت کے پیشِ نظر کہا گیا ہے۔

ڈھونڈا اے فقیہہ شہر کہ شائد کہیں ملے
تیری کتب میں ذکر حقوق العباد کا

البتہ علمائے عمرانیات نے انسان کے حقوق و فرائض کے درمیان

توازن پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔

اس سلسلے میں یونان کا عظیم مفکّر ارسطو سرِ فہرست نظر آتا ہے۔ ارسطو نہ صرف انسان کے فطری حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔ بلکہ اس کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ کوئی بھی ریاست یا معاشرہ یہ حقوق سَلب نہیں کر سکتا۔ ارسطو نے جن بنیادی انسانی حقوق کی تفصیل دی ہے۔ ان میں زندگی کا حق، جائیداد کا حق، وراثت کا حق اور روزگار کا حق شامل ہیں۔ یہ حقوق ایسے ہیں کہ جن کے بغیر فرد اور معاشرہ مکمل نہیں ہو سکتے۔ انسان کے معاشرتی، فکری اور شعوری ارتقا کے ساتھ ساتھ بنیادی حقوق کی نوعیت میں بھی خاطر خواہ تبدیلی آگئی ہے اور ان کی فہرست بھی طویل ہوگئی ہے۔ جن کا مفصّل بیان آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔ بد قسمتی سے انسان کی جارحانہ جبلّت نے ہمیشہ نہ صرف اپنے ہم جنسوں کو ان حقوق سے محروم رکھا بلکہ اپنی طاقت، جبر اور جارحیت سے ان کو مغلوب کر کے انہیں دوسرے درجے کی مخلوق بنائے رکھا اور اس طرح "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس" کا اصول جاری و ساری رہا بلکہ آج بھی جاری ہے۔ جس کی نشاندہی شاعرِ مشرق نے اِن الفاظ میں کی ہے۔

ابھی تک آدمی صید زبوں کارزاری ہے
قیامت ہے کہ اِنسان انسان کا شکاری ہے

یہ طاقتور افراد اور طبقات کبھی قبائلی سرداروں کے روپ میں تو کبھی بادشاہ یا شہنشاہ بن کر اور کبھی مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر یا مردِ آہن بن کر اپنی قوم بلکہ رعایا کی تقدیر کے مالک بن جاتے ہیں۔ ان آقاؤں کا ہر لفظ اپنی قوم یا رعایا کے لیے قانون کا درجہ رکھتا ہے۔ اور عوام کی زندگی، جان و مال اور عزت و آبرو ان کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ یہ تنقید اور احتساب سے بالاتر

ہوتے ہیں۔ اور عوام کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ان کی عظمت اور سطوت کے گن گاتے رہیں۔ قدیم بادشاہوں کے اختیارات کی وسعت کا اندازہ قرآنِ پاک میں بیان کی گئی نمرود اور فرعون کی مثالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ ربّانی ہے۔

"جب ابراہیمؑ نے کہا میرا ربّ وہ ہے۔ جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ تو اس نے جواب دیا۔ یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ تو ذرا مغرب سے نکال دے۔ یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا۔"

(سورۃ البقر آیت نمبر ۲۵۸)

مولانا مودودی نے مندرجہ بالا آیتِ کریمہ کی تفسیر لکھتے وقت عام مسلمانوں کے درمیان پائی جانے والی ایک غلط فہمی کا مکمل طور پر ازالہ کر دیا ہے۔ عام مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ نمرود اپنے آپ کو خدا یا ربّ کہلواتا تھا اور اس طرح سے وہ اللہ تعالےٰ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ امرِ واقعہ یہ نہیں تھا۔ وہ اللہ تعالےٰ کی ذات کا منکر نہیں تھا۔ بلکہ اپنے آپ کو اہلِ عراق کا حاکمِ مطلق سمجھتا تھا۔ اس کا ہر لفظ قانون ہوتا تھا اور وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں تھا۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ :-

(۱) "قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام مشرک سوسائٹیوں کی یہ مشترک خصوصیت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ کو ربّ الارباب اور خدائے خدائیگان کی حیثیت سے تو مانتے ہیں۔ مگر صرف اسی کو ربّ اور تنہا اسی کو خدا اور معبود نہیں مانتے۔"

(۲) خدائی کو مشرکین نے ہمیشہ دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک فوق الفطری

خدائی جو سلسلۂ اسباب پر حکمران ہے۔ اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مشکلات میں دستگیری کے لیے رجوع کرتا ہے۔ اس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارواح اور فرشتوں اور جنوں اور سیاروں اور دوسری بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ ان سے دعائیں مانگتے ہیں۔ ان کے سامنے مراسمِ پرستش بجالاتے ہیں اور ان کے آستانوں پر نذر نیاز پیش کرتے ہیں۔ دوسری تمدنی اور سیاسی معاملات کی خدائی (یعنی حاکمیت) جو قوانینِ حیات مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعتِ امر کی مستحق ہو اور جسے دنیوی معاملات میں فرمانروائی کے مطلق اختیارات حاصل ہوں۔ اس دوسری قسم کی خدائی کو دنیا کے تمام مشرکین نے قریب قریب ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب کر کے یا اس کے ساتھ شاہی خاندانوں اور مذہبی پروہتوں اور سوسائٹی کے اگلے پچھلے بڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اگر شاہی خاندان اسی دوسرے معنی میں خدائی کے مدعی ہوئے ہیں۔ اور اسے مستحکم کرنے کے لیے انہوں نے بالعموم پہلے معنی والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریکِ سازش رہے ہیں۔

(۳) نمرود کا دعوائے خدائی بھی اسی دوسری قسم کا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسبابِ عالم کے پورے سلسلے پر اسی کی حکومت چل رہی ہے بلکہ اسے دعویٰ اس امر کا تھا کہ اس ملکِ عراق کا اور اس کے باشندوں کا حاکمِ مطلق میں ہوں۔ میری زبان قانون ہے۔ میرے اُوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے۔ جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں اور عراق کا ہر وہ باشندہ باغی و غدار ہے جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے

یا میرے سوا کسی اور کو رب تسلیم کرے۔

(۴) ابراہیم علیہ السّلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک ربّ العالمین ہی کو خدا اور معبُود اور رب مانتا ہوں اور اس کے سوا سب کی خدائی اور رُبُوبیّت کا قطعی طور پر منکر ہوں تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہوا کہ قومی مذہب اور مذہبی معبُودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابلِ برداشت ہے۔ بلکہ یہ سوال بھی اُٹھ کھڑا ہوا کہ قومی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس عقیدے کی زد پڑتی ہے۔ اُسے کیونکر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام جرمِ بغاوت کے الزام میں نمرود کے سامنے پیش کیے گئے۔

(تفہیم القرآن)

جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۹۸/۱۹۹

غرض یہ کہ نمرودیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر نمرود اپنے آپ کو منصبِ خداوندی پر برقرار رکھنے پر مُصر رہتا ہے۔ جب کہ عام انسانوں کو انسانی شرف سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ آج کا انسان مادّی، سائنسی اور ذہنی ترقی کے بے شمار مراحل طے کر چکا ہے۔ لیکن ہنوز نمرودوں اور فرعونوں کی آمریت سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ دوسری جنگِ عظیم کی تباہ کاریاں اسی فرعونی ذہن کی پیداوار تھیں۔ بہر حال ارتقا کا سفر جاری ہے اور وہ دن زیادہ دُور نہیں جب تمام دنیا احترامِ آدمی کا زرّین اصول تسلیم کر لے گی۔

ع آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی۔

(اقبال)

مغربی افکار انسان کے بنیادی حقوق کی نظری تفسیر اور عملی نفاذ میں

اقوام یورپ اور بالخصوص برطانیہ اور فرانس کے سیاسین اور مفکرین کا حصّہ قابلِ قدر ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جدید دَور کی ذہنی قیادت یورپ کے ہاتھ میں ہے۔ سیاسی میدان میں اس کی ابتداء ۱۲۱۵ء میں ہوئی جب انگلستان کے عوام نے بادشاہ جان سوم کے سامنے اپنے مطالبات "منشورِ اعظم" کی صورت میں پیش کئے۔ رفتہ رفتہ عوام کے حقوق کے حصول کی تحریک اور بادشاہ کے اختیارات کے خاتمہ کی تحریک اِس مقام پر آگئی کہ جہاں پر نہ صرف مملکت کے تمام اختیارات بلکہ بادشاہ کے ذاتی معاملات بھی سمٹ کر پارلیمنٹ میں مرتکز ہوگئے اور بادشاہ اپنی مرضی سے اپنی پسند کی شادی کرنے سے بھی محروم ہوگیا۔ بقولِ شاعرِ مشرق۔

ؔ شاہ برطانوی مندر میں اِک مٹی کا بُت
جس کو کرسکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش

لیکن صحیح معنوں میں سلطانیٔ جمہور کی ابتداء انقلابِ فرانس سے ہوئی ہے۔ جب عوام نے بادشاہت سے نجات حاصل کرکے جمہوری حکومت کی بنیاد ڈالی انقلاب فرانس ہی وہ بنیادی پتھر ہے۔ جس پر عوام کے حقوق و فرائض کے نظامِ فکر کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ آج کی دنیا میں ہر ملک کی حکومت حقوق و فرائض اور اختیارات کا تعین باقاعدہ ایک دستاویز کے ذریعے کرتی ہے۔ جسے دستور کہا جاتا ہے۔ دستور کسی بھی ملک کا ایک ایسا برتر قانون ہوتا ہے۔ جس سے حکومت کے تمام ادارے اپنے اپنے اختیارات حاصل کرتے ہیں۔ تمام قوانین اپنا جواز اور عوام اپنے حقوق حاصل کرتے ہیں۔ دستور دراصل ایسے قانونی قواعد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جو کسی بھی ریاست کے اقتدارِ اعلیٰ کے طریقۂ کار کی تشریح کرتے ہیں اور حکومت کرنے کے

بنیادی طریقوں کا تعین کرتے ہیں۔ نیز عوام کے حقوق کو دستور میں محفوظ کر دیا جاتا ہے اور اگر اس ملک کا کوئی فرد یا ادارہ ان حقوق کو غصب کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس ملک کی اعلیٰ عدالتیں مداخلت کر کے ایسی غیر آئینی کاروائیوں کو ناکام بنا دیتی ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر بھی انسانی حقوق کے تحفّظ کے لیے خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا کے معروف مدبّرین نے بنی نوعِ انسان کو تباہی و بربادی اور جنگ بازوں کے استحصال سے بچانے کے لیے اقوامِ متحدہ کا ادارہ قائم کیا۔ ہر چند اس سے قبل اس قسم کا ادارہ "لیگ آف نیشنز" کے نام سے قائم کیا گیا تھا لیکن یہ ادارہ دنیا کو فسطائیت اور نازیت کے حملوں سے بچانے میں ناکام و نامراد رہا۔ لہٰذا نسلِ انسانی کے تحفّظ و ترقی اور امن و سکون کے لیے اقوامِ متحدّہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔

اقوامِ متحدّہ

سائنسی ترقی نے کائنات کی وسعتوں کو سمیٹ دیا ہے خطّۂ ارض ایک ملک اور نسلِ انسانی ایک قوم کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ واضح طور پر نظر آتا ہے کہ نسلِ انسانی اپنی اصل کی طرف مراجعت کر رہی ہے۔ اپنے اس آغاز کی طرف کہ جہاں سے اولادِ آدمؑ نے کاروبارِ حیات کا آغاز کیا تھا۔ مذہبی، نسلی، گروہی اور طبقاتی تعصّبات مٹتے جا رہے ہیں۔ عالمگیر سچائیاں جو تمام انسانوں کی مشترکہ میراث ہیں، ابھر کر سامنے آ رہی ہیں۔ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ وہ اقوام عالم کی برادری کا ایک فرد ہے۔ جنگ بازی، استحصال اور لوٹ مار کی حوصلہ شکنی کی جا رہی ہے۔ امن، صلح، تعاون اور بھائی چارے کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ ہر بڑے سے بڑے عالمی مسئلے کو میدانِ جنگ کے بجائے صلح کی میز پر بیٹھ کر حل

کرنے کی کامیاب کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کا قیام دراصل نسلِ انسانی کے انہی جذبوں کا عملی اظہار ہے۔ چنانچہ جب اقوامِ متحدہ قائم ہوا تو اس کے "چارٹر" کی دفعہ نمبر ۱ میں یہ اعلان شامل کیا گیا کہ اقوامِ متحدہ کے قیام کے مقاصد میں پہلا مقصد بین الاقوامی تعاون کے ذریعے تمام دنیا کے انسانوں کے لیے بلا امتیاز نسل، جنس، زبان اور مذہب بنیادی حقوق کو فروغ دینا ہے۔ انسانی تاریخ میں ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کا دن اس اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس دن اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کے عالمی منشور کی قرارداد منظور کی تھی اور اس طرح دنیا کی تاریخ میں پہلی بار بین الاقوامی برادری نے انسانی حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ یہ منشور ۳۰ دفعات پر مشتمل ہے اور اس میں وہ تمام حقوق دیئے گئے ہیں کہ جن کے بغیر نہ تو کوئی فرد اپنی تمام تر صلاحیتوں کو عمل میں لا سکتا ہے اور نہ ہی صحت مند معاشرہ کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اس منشور کا مختصر تعارف اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

حقوقِ انسانی

عالمی منشور حقوقِ انسانی ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو جنرل اسمبلی میں پیش ہوا۔ ۴۸ اراکین نے اس کے حق میں ووٹ دیا جب کہ ۸ اراکان نے رائے شماری میں حصہ لینے سے اعتراض کیا۔ یہ منشور بھاری اکثریت سے منظور ہوا اور پوری دنیا "عالمی منشور حقوقِ انسانی" یا عالمی اعلان برائے حقوقِ انسانی یا انسانی حقوق کے عالمی اعلان سے رُوشناس ہوئی۔ یہ منشور درج ذیل دفعات پر مشتمل ہے۔

(۱) تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور عظمت و وقار کے معاملے میں مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۲) ہر فرد، نسل، رنگ، جنس، مذہب، زبان، سیاسی یا دوسرے نظریات

قومی وسماجی حیثیت، املاک، پیدائشی یا کسی اور حیثیت یا کسی بھی دیگر امتیاز کے بغیر اس منشور میں صراحت کردہ تمام حقوق اور آزادیوں کا حق دار ہوگا۔"

(۳) "ہر انسان کو زندہ رہنے، آزاد رہنے اور اپنی جان کی حفاظت کرنے کا حق حاصل ہے۔"

(۴) "کسی بھی شخص کو غلام نہیں بنایا جائے گا اور نہ ہی محکوم رکھا جائے گا۔ غلام اور غلاموں کی تجارت ہر شکل میں ممنوع ہوگی۔"

(۵) "کسی بھی شخص کو تشدّد، ظلم وستم، غیر انسانی اور ہتک آمیز سلوک کا یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔"

(۶) "ہر انسان قانون کی نظر میں بحیثیت انسان ایک تسلیم شدہ حیثیت ہوگی۔"

(۷) "قانون کی نگاہ میں سب برابر ہوں گے اور کسی بھی امتیاز کے بغیر ان تمام کو یکساں قانونی تحفّظ حاصل ہوگا۔

(۸) "ہر فرد کو دستور یا قانون کے ذریعے ملنے والے بنیادی حقوق کے منافی قوانین کے خلاف با اختیار ٹریبونل کے ذریعے مؤثر چارہ جوئی کا حق حاصل ہوگا۔"

(۹) "کسی بھی شخص کو بلا جواز گرفتاری، نظر بندی یا جلاوطنی کی سزا نہیں دی جاسکے گی۔"

(۱۰) ہر انسان کو اپنے بنیادی حقوق وفرائض کے تعیّن میں یا اپنے خلاف عائد کردہ الزامات سے برأت کے لیے آزاد وخود مختار اور غیر جانبدار ٹریبونل میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا یکساں حق حاصل ہوگا۔

(۱۱) ۱۔ کسی تعزیری جُرم کی صورت میں ہر فرد کو اس وقت تک بے قصور سمجھے جانے کا حق حاصل ہو گا۔ جب تک ایسی کھلی عدالت میں اُسے قانون کے مطابق مجرم ثابت نہ کر دیا جائے۔ جہاں اُسے اپنی صفائی کی تمام ترضمانتیں فراہم کی گئی ہوں۔

۲۔ کسی فرد کو کسی ایسے ارادی یا غیر ارادی فعل کی بناء پر قابلِ تعزیر جرم کا مرتکب قرار نہیں دیا جاسکتا جو فی الواقع قومی یا عالمی قانون کے تحت قابلِ تعزیر نہ ہو۔

(۱۲) کسی فرد کی نجی زندگی (خلوت) گھریلو زندگی، خاندانی معاملات اور خط و کتابت میں مداخلت نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس کی عزت و آبرو پر حملہ لیا جائے گا۔

(۱۳) ۱۔ ہر فرد کو اپنی حدودِ ریاست میں نقل و حرکت اور رہائش کی مکمل آزادی ہو گی۔

۲۔ ہر انسان کو بیرونِ ملک جانے اور اپنے ملک واپس آنے کا حق حاصل ہو گا۔

(۱۴) ۱۔ ہر فرد کو ظلم و تشدّد سے بچنے کے لیے دوسرے ممالک میں پناہ لینے کا حق حاصل ہو گا۔

۲۔ جبر سیاسی جرائم یا اقوامِ متحدّہ کے اصول و مقاصد کے منافی اعمال کے سلسلہ میں تقدمات سے بچنے کے لیے یہ حق قابلِ استعمال نہیں ہو گا۔

(۱۵) ۱۔ ہر انسان کو شہریت حاصل کرنے کا حق ہو گا۔

۲۔ کسی بھی انسان کو بلا جواز اس شہریت سے محروم نہیں کیا جائے

گا۔ اور نہ ہی شہریت کی تبدیلی کا حق سلب کیا جائے گا۔

(۱۶) ۱۔ ہر بالغ مرد اور عورت کو بلا امتیاز شہریت یا عقیدہ شادی کرنے اور گھر آباد کرنے کا حق حاصل ہو گا۔

۲۔ شادی مرد و عورت کی آزادانہ مرضی و منظوری سے ہو گی۔

۳۔ خاندان معاشرہ کا بنیادی اور فطری یونٹ ہے۔ جو ریاست اور معاشرہ کی طرف سے مکمل تحفظ کا مستحق ہے۔

(۱۷) ۱۔ ہر فرد کو تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہو گا۔

۲۔ کسی کو بلا جواز اس کی ملکیت سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

(۱۸) ہر فرد کو فکر و خیال، ضمیر و عقیدے کی آزادی حاصل ہو گی اور اس حق میں تبدیلیٔ عقیدہ، اظہارِ عقیدہ اور تبلیغِ عقیدہ اور عبادت کا حق بھی شامل ہے۔

(۱۹) ہر فرد کو اظہارِ خیال کا حق حاصل ہے اور اس میں کسی مداخلت کے بغیر کوئی بھی رائے رکھنے، کسی بھی ذریعہ سے اور سرحدوں کے لحاظ کے بغیر خیالات و معلومات حاصل کرنے اور پہنچانے کا حق بھی شامل ہے۔

(۲۰) ۱۔ ہر فرد کو پُر امن اجتماع و تنظیم کا حق حاصل ہے۔

۲۔ کسی کو کسی خاص تنظیم سے وابستہ ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

(۲۱) ۱۔ ہر فرد کو اپنے ملک کی حکومت میں براہِ راست یا منتخب نمائندوں کے ذریعے سے شرکت کا حق ہے۔

۲۔ ہر فرد کو اپنے ملک کی سرکاری ملازمت کے حصول کا مساوی حق حاصل ہے۔

۳۔ حکومت کے اختیار کی اصل بنیاد عوام کی خواہش و مرضی ہوگی جس کا اظہار انتخابات کے ذریعے آزادانہ رائے شماری اور خفیہ رائے دہی کی صورت میں ہوگا۔

(۲۲) ہر فرد کو اپنی باوقار زندگی اور تعمیرِ شخصیت کے لیے سماجی تحفّظ کا حق ہوگا اور وہ قومی اور عالمی تعاون کے ذریعے اور ہر ریاست کے وسائل کے مطابق معاشی و معاشرتی اور ثقافتی حقوق کا مستحق ہوگا۔

(۲۳) ۱۔ ہر فرد کو کام کرنے، اپنی پسند کا پیشہ اختیار کرنے، بہتر اور منصفانہ شرائطِ کار حاصل کرتے اور بیروزگاری سے تحفّظ پانے کا حق ہوگا۔

۲۔ ہر انسان کو بلا امتیاز یکساں کام کرنے کی یکساں اجُرت ملے گی۔

۳۔ ہر فرد کو بہتر اور منصفانہ معاوضہ حاصل کرنے کا حق جو ہے اس کی ذات اور اس کے خاندان کے لیے باعزّت زندگی بسر کرنے کی ضمانت فراہم کرسکے اور ضروری ہو تو اس کے سماجی تحفّظ کے لیے کچھ دوسرے ذرائع بھی مہیّا کیے جائیں گے۔

۴۔ ہر فرد کو اپنے مفادات کے تحفّظ کے لیے ٹریڈ یونین بنانے اور ان میں شامل ہونے کا حق حاصل ہوگا۔

(۲۴) ہر فرد کو راحت و آرام، تفریح، اوقاتِ کار کے معقول تعیّن اور تنخواہ کے ساتھ چھٹیوں کا حق ہوگا۔

(۲۵) ۱۔ ہر فرد کو اپنی اور اپنے خاندان کی صحت و خوشحالی کے لیے معقول معیارِ زندگی برقرار رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔ خوراک، لباس، رہائش، طبّی امداد ضروری سروس، بیروزگاری، بیماری، بڑھاپے اور اس طرح کے دوسرے حالات میں تحفّظ بھی شامل ہے۔

۲۔ زچگی و شیر خوارگی کو خصوصی توجہ اور امداد کا مستحق سمجھا جائے گا اور تمام بچوں کو خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز یکساں سماجی تحفظ حاصل ہوگا۔

(۲۶) ۱۔ ہر فرد کو حصولِ تعلیم کا حق حاصل ہے۔

۲۔ تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی مکمل تعمیر اور انسانی حقوق و آزادیوں کے احترام کو مستحکم بنانا ہوگا۔

۳۔ والدین کو اپنے بچوں کے لیے نوعیتِ تعلیم کے انتخاب کا حق حاصل ہوگا۔

(۲۷) ۱۔ ہر فرد کو معاشرہ کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصّہ لینے، علم و فن سے استفادہ کرنے اور سائنسی ترقی کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

۲۔ ہر فرد کو اپنی سائنسی ادبی یا فنّی تخلیقات کے اخلاق و مادّی ثمرات کے تحفّظ کا حق حاصل ہوا ہے۔

(۲۸) ہر فرد کو ایسے معاشرتی اور عالمی ماحول میں زندگی بسر کرنے کا حق حاصل ہے، جس میں منشور کے ان حقوق اور آزادیوں سے استفادہ کرنے کی ضمانت ہو۔

(۲۹) ۱۔ ہر فرد پر اس معاشرے کی طرف سے ذمّہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ جس میں رہ کر ہی اس کی شخصیت کی آزادانہ اور مکمل نشو و نما ممکن ہے۔

۲۔ اپنے حقوق اور آزادیوں کے سلسلہ میں ہر شخص صرف قانون کی عائد کردہ اِن پابندیوں کے دائرۂ کار میں رہے گا۔ جن کا مقصد دوسروں کے حقوق اور آزادیوں کے احترام کو یقینی بنانا ہے۔

۳۔ اِن حقوق اور آزادیوں کو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے منافی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

(۳۰) اس منشور کے کسی بھی حصے کی ایسی تعبیر نہیں کی جا سکے گی جس کا مقصد کسی بھی ریاست یا فرد کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے کا حق دلانا ہو، جس کے ذریعے وہ ان متعین حقوق اور آزادیوں ہی کا صفایا کر دے۔

مارشل لاء

مارشل لاء کی تعریف ڈیوک آف ویلنگٹن نے "ہاؤس آف لارڈز" میں ان الفاظ میں کی تھی۔

"مارشل لاء صرف اور صرف فاتح جرنیل کی مرضی ہوتی ہے جس کے تحت وہ مفتوح علاقے پر کمانڈ کرتا ہے۔ دراصل مارشل لاء کا سیدھا سادا مطلب ہے "لاقانونیت"۔

اوپر بیان کیے گئے انسانی حقوق کا تعلق دستوری نظام سے ہے جب دستور ہی نہیں ہوگا تو حقوق بھی نہیں ہوں گے۔ اصل میں دستور ایسا بالاتر قانون ہوتا ہے جو کسی بھی قوم کے حقوق و فرائض متعین کرتا ہے۔ لیکن حقوق و فرائض کا تعین کسی فاتح کمانڈر کی مرضی پر منحصر ہو جائے تو دستوری قواعد خود غیر مؤثر ہو جاتے ہیں۔ گویا مارشل لاء اور آئین ایک دوسرے کی ضد ہیں جو باہم اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ جنگ کی صورت میں یا ہنگامی حالت میں زندگی کے عام معمولات معطل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے حالات میں مارشل لاء کا نفاذ حالات کا طبعی تقاضا ہوتا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ حالات کو معمول پر لایا جائے لیکن پُرامن حالات میں، یا ایسے حالات میں جب کوئی آزاد اور خود مختار قوم اپنے کسی مطالبے کو منوانے کے لیے کوئی تحریک چلا رہی ہو تو مارشل لاء کا نفاذ ایک ظالمانہ اقدام اور سنگین جرم ہے جو کسی بھی حال میں قابلِ برداشت نہیں ہو سکتا۔ ایسے حالات میں مارشل لاء کا نفاذ اس قوم کی آزادی اور خود مختاری میں مداخلت اور اس کے سماجی شعور کی نفی کے مترادف ہوتا ہے۔ جو ایک قابلِ

نفرت اقدام ہے۔ اس لیے کسی بھی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک آزاد قوم کے آئینی نظام کو معطل کر کے اس پر اپنی مرضی مسلط کر دے۔

اقوام متحدہ کے منشور میں دیئے گئے انسانی حقوق فی الواقع انسان کے ضمیر کی آزادی، انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل اور طبعی تقاضوں کی تسکین کے عین مطابق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد دنیا کے دساتیر ان ہی اصولوں کی روشنی میں مرتّب کیے گئے ہیں۔ اور ان سب میں انسانی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ پاکستان کے دساتیر میں بھی یہ حقوق فراہم کیے گئے تھے۔ اور ملک کی اعلیٰ عدالتوں کو اختیار تھا کہ وہ ان حقوق کو نافذ کرائیں۔ لیکن مارشل لاء حکومتوں نے ان حقوق کو ہمیشہ غصب کیے رکھا۔ پاکستان کے دساتیر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان میں ایسے اقدامات اختیار کرنے پر زور دیا گیا تھا کہ جن سے پاکستان کے عوام کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے آپ کو اسلامی نظامِ حیات کے مطابق ڈھال سکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کی تخلیق دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے عقائد اور مذہب کی بنیاد پر ایک علیحدہ قوم ہیں اور انہیں اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے علیحدہ وطن کی ضرورت ہے۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے نظریۂ پاکستان کی وضاحت کرتے ہوئے اپنے خطبۂ صدارت الٰہ آباد میں فرمایا تھا:۔

”میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظّم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوّت کی بدولت امن وامان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات

سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک قائم ہے
اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدّن شریعت اور تعلیم
پر صدیوں سے طاری ہے۔"

پاکستان کی تخلیق

پاکستان کی تخلیق انتہائی کربناک حالات میں ہوئی تھی۔ آزادی کے اعلان کے ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ لوٹ مار اور قتل و غارتگری کی وارداتیں روزمرّہ کا معمول بن گئیں۔ امن و امان کی صورتحال انتہائی تشویشناک تھی۔ ہندو لیڈر پاکستان کے وجود کو ہی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اس لیے بھارت دانستہ طور پر پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ تقسیم کے بعد پاکستان کے حصے میں آنے والے تمام اثاثوں کو روک لیا گیا۔ پاکستان کو اپنے حصّے کے دیگر ساز و سامان اور اسلحہ سے بھی محروم کر دیا گیا۔ پاکستان کی فوج منتشر حالت میں ملک کے دور دراز حصّوں میں موجود تھی۔ ہندوستان نے تمام مسلم ریاستوں پر بشمول جوناگڑھ، حیدر آباد، کشمیر وغیرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ عوام میں بے پناہ جوش و خروش اور ولولہ موجود تھا۔ وہ اپنی قیادت کی آواز پر لبیک کہنے کو تیار تھے۔ لیکن مسلم لیگ کے پاس تعمیرِ نو کے لیے معاشی ترقی، سماجی انصاف اور آئین کی تدوین کے لیے کوئی ٹھوس پروگرام موجود نہیں تھا۔ غرض یہ کہ صورت حال انتہائی حوصلہ شکن اور مایوس کُن تھی۔ ان حالات میں امریکی امداد پاکستان کی امیدوں کا واحد سہارا تھی۔ بانیٔ پاکستان محمد علی جناح ؒ کو ان حالات کا مکمل شعور تھا۔ اس لیے آپ نے آزادی سے قبل ہی امریکی سفارتکاروں کے ساتھ اپنے روابط پیدا کر لیے تھے۔

امریکہ اور محمد علی جناحؒ

یکم مئی ۱۹۴۷ء کو امریکی محکمۂ خارجہ کے جنوبی ایشائی امور کے شعبہ کے سربراہ "ریمنٹ اے ہیر" اور ہندوستان میں امریکی سفارت خانہ کے سیکنڈ سیکریٹری مسٹر تھامس ای ویل نے حضرت قائد اعظمؒ کے ساتھ بمبئی میں آپ کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ بابائے قوم نے ان کو بتایا کہ متحدہ ہندوستان کا تصور مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس لیے کہ پاکستان ہماری منزل ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ ایک آزاد اور خودمختار پاکستان امریکہ کے مفاد میں ہوگا۔ اس لیے کہ پاکستان ایک مسلم ملک ہوگا اور وہ سوویت نظریات کو قبول نہیں کرے گا۔ تمام مسلمان سوویت جارحیت کے خلاف متحد ہو جائیں گے اور انہیں امریکی امداد کی ضرورت ہو گی۔

اسی طرح جب اگست ۱۹۴۷ء میں بابائے قومؒ ہندوستان سے روانہ ہو رہے تھے۔ تو ہندوستان میں امریکہ کے معاون سفیر مسٹر "ہنری ایف گریڈی" ان سے ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ قائد اعظمؒ نے ان سے کئی امور پر بات چیت کی اور امید ظاہر کی کہ امریکہ پاکستان کے مسائل حل کرنے میں ضروری امداد فراہم کرے گا۔ اگرچہ امریکہ اور پاکستان کے درمیان تعاون اور دوستی کے وسیع امکانات موجود تھے لیکن مشکل یہ پیدا ہوئی کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان روزِ اوّل ہی سے کئی تنازعات اٹھ کھڑے ہوئے جن میں کشمیر کا مسئلہ سرفہرست ہے۔ اس لیے امریکی پالیسی ان دونوں ممالک کو یکساں طور پر مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ ہندوستان کے بعض مخصوص حالات کی

وجہ سے امریکہ کا جھکاؤ ہندوستان کی طرف تھا۔ اس لیے امریکہ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان کو ترجیح دیتا تھا۔

دوسری طرف سوویت یونین نے بھی ہر دو نوزائیدہ مملکتوں کے ساتھ اپنے روابط بڑھانے شروع کر دیئے روس نے پاکستان کے وزیرِ اعظم کو روس کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ جو منظور بھی کر لی گئی۔ مگر بعد میں یہ دورہ منسوخ کر دیا گیا۔ اور پاکستان کے وزیرِ اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان امریکی صدر مسٹر ٹرومین کی دعوت پر امریکہ تشریف لے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روس نے بھارت کے ساتھ قربت پیدا کر لی اور اسی دوستی کی بناء پر اقوام متحدہ کے سامنے ہر دفعہ مسئلہ کشمیر پر اپنا حقِ تنسیخ (ویٹو) استعمال کر کے اس مسئلہ کو سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ پاکستان اپنے تحفّظ اور دفاع کے لیے امریکہ کے قریب ہوتا چلا گیا۔ اُدھر امریکہ کو بھی سوویت یونین کے خلاف اپنی دفاعی منصوبہ بندی کو کامیاب بنانے کے لیے پاکستان کی ضرورت تھی۔ جب کہ پاکستان کو بھارتی جارحیّت سے خطرہ تھا۔ لیکن ایک بڑی طاقت ہونے کی حیثیت سے امریکہ پاکستان کے خلاف بھارتی جارحیّت کو کوئی اہمیّت نہیں دیتا تھا۔ اور صرف پاکستان کو سوویت یونین کے خلاف استعمال کرنا چاہتا تھا۔ پاکستان کے وزیرِ اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے امریکہ کو جارحیّت کا مفہوم سمجھاتے ہوئے فرمایا تھا۔

> "جارحیّت، جارحیّت ہی ہے خواہ وہ کمیونسٹ اطراف سے ہو یا کسی اور طرف سے اور اس میں امتیاز کرنا امریکہ جیسے بااصول ملک کو زیب نہیں دیتا۔"

لیکن امریکہ نے پاکستان کے نقطۂ نظر کی کبھی بھی پُر زور حمایت نہیں

کی اور وہ پاکستان کو سوویت یونین کے خلاف ایک فرنٹ لائن اسٹیٹ بنانے کے لیے مصروفِ عمل رہا۔ امریکہ کی یہ پالیسی آج بھی جاری ہے اور اس کے تباہ کن نتائج ہم اپنی تاریخ کے چالیس سالہ دور میں دیکھ چکے ہیں۔

پاکستان کے دساتیر

مقامِ افسوس ہے کہ پاکستان اپنے قیام کے تقریباً ۹ سال تک اپنے لیے دستور مرتّب نہ کر سکا۔ گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت تاجِ برطانیہ کے نمائندے کی تھی۔ اس کوتاہی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ قومی مقاصد کے نقوش دھندلانے لگے۔ اور حصولِ پاکستان کے لیے دی گئی قربانیوں کو فراموش کیا جانے لگا۔ ہم انسانیت کے بلند مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ایک قوم کی حیثیت سے ابھرے تھے لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ہماری ساری توجہ مال و دولت کے حصول اور جائیداد کے جعلی دعووں کی ترتیب اور تسکین کی طرف مرتکز ہوگئی۔ وقت نے ہمیں پیچھے چھوڑ دیا اور ہم نشانِ منزل بھولتے چلے گئے۔ ہمارے حال پر یہ مثال بالکل صادق آتی ہے۔

" رفتم کہ خار از پاکشم محمل نہاں شُد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ منزل دُور شُد "

البتہ اس عرصہ میں ایک پیش رفت ضرور ہوئی وہ یہ کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی نے طویل غور و خوص کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں آئین کے اغراض و مقاصد کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی جسے "قراردادِ مقاصد" کے نام سے شہرت حاصل ہو چکی ہے اور جس کو پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء میں

شامل کر لیا گیا ہے ۔ قرار داد درج ذیل ہے ۔

قراردادِ مقاصد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

چونکہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کُل کائنات کا بلا شرکتِ غیر حاکم مطلق ہے اور اس نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیار حکمرانی اپنی مقررّ کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمایا ہے اور چونکہ یہ اختیارِ حکمرانی ایک مقدس امانت ہے ۔ لہٰذا جمہور پاکستان کی نمائندہ یہ مجلسِ دستور ساز فیصلہ کرتی ہے کہ آزاد و خود مختار مملکتِ پاکستان کے لیے ایک دستور مرتب کیا جائے ۔ جس کی رُو سے مملکت جملہ حقوق و اختیاراتِ حکمرانی جمہور کے منتخب کردہ نمائندوں کے ذریعے استعمال کرے ۔

جس میں اصولِ جمہوریت و حریّت و مساوات و رواداری اور عدل و عمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے کو پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے ۔ جس کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو اسلامی تعلیمات و مقتضیات کے مطابق جو قرآنِ مجید اور سنّتِ رسولؐ میں متعیّن ہیں ترتیب دے سکیں ۔

جس کی رُو سے اس امر کا قرار واقعی انتظام کیا جائے کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبوں پر عقیدہ رکھ سکیں اور ان پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں ۔ جس کی رُو سے وہ علاقے جو اب پاکستان میں داخل ہیں یا شامل ہو گئے ہیں اور ایسے دیگر علاقے جو آئندہ پاکستان میں داخل

باشامل ہوجائیں ایک وفاقیہ بنائیں جس کے ارکان مقررّکردہ حدود اربع و متعینہ اختیارات کے ماتحت خود مختار ہوں۔

جس کی رُو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے اوران حقوق میں قانون و اخلاقِ عامّہ کے ماتحت مساواتِ حیثیت و مواقع، قانون کی نظر میں برابری عمرانی، اقتصادی اور سیاسی عدل خیال، اظہار، عقیدہ، دین، عبادت اور ارتباط کی آزادی شامل ہوں۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ و پست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفّظ کا قرار واقعی انتظام کیا جائے۔

جس کی رُو سے نظامِ عدل کی آزادی کامل طور پر محفوظ ہو۔

جس کی رُو سے وفاقیہ کے علاقوں کی ضمانت، اس کی آزادی اور اس کے جملہ حقوق کا جن میں اس کے برّ و بحر اور فضا پر سیادت کے حقوق شامل ہیں کا تحفّظ کیا جائے، تاکہ اہلِ پاکستان فلاح و خوشحالی کی زندگی بسر کرسکیں، اقوامِ عالم کی صف میں اپنا جائز اور ممتاز مقام حاصل کرسکیں اور امنِ عالم کے قیام اور بنی نوع انسان کی ترّقی و بہبود میں کما حقہ اضافہ کرسکیں۔

۱۹۵۶ء کا دستور

پاکستان کی قومی اسمبلی نے ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا پہلا دستور مرتّب کر دیا تھا۔ لیکن قراردادِ پاکستان کی تاریخ کے حوالے سے یہ دستور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء سے نافذ کیا گیا۔ اس دستور میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا اور ملک کے لیے پارلیمانی نظامِ حکومت اختیار کیا گیا تھا۔

نیز اقوامِ متحدہ کے منشور میں طے کیے گئے تقریباً تمام بنیادی انسانی حقوق فراہم کیے گئے تھے نیز "قراردادِ مقاصد" میں طے کیے گئے بنیادی اصول بھی اس آئین میں شامل کیے گئے ملک کی اعلیٰ عدالتوں کو بنیادی حقوق نافذ کرانے کا اختیار حاصل تھا۔ ملک کی تمام آبادی کو رنگ، نسل، مذہب اور عقائد کی تفریق کے بغیر سیاسی سطح پر مساوی درجے کا شہری تسلیم کیا گیا تھا۔ ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل تھی اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ووٹ دینے اور کاروبارِ مملکت میں شرکت کرنے کا حق حاصل تھا۔ صدرِ مملکت کی حیثیت محض آئینی سربراہ کی تھی اور اس کا انتخاب قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کی رائے شماری کے ذریعے طے کیا جاتا تھا انتظامیہ کے تمام اختیارات کابینہ کو دیئے گئے جس کی قیادت وزیرِ اعظم کو دی گئی۔ قومی اسمبلی ملک کا قانون ساز ادارہ تھی جسے ملک کے لیے قانون بنانے کے مکمل اختیارات حاصل تھے۔ علاوہ ازیں ملک کی مالیاتی پالیسی پر بھی قومی اسمبلی کو مکمل کنٹرول حاصل تھا کوئی ٹیکس قومی اسمبلی کی منظوری کے بغیر نافذ نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی قومی اسمبلی کی منظوری کے بغیر قومی خزانے سے کسی قسم کی رقم خرچ کی جا سکتی تھی۔ بجٹ منظور کرنا بھی قومی اسمبلی کی ذمہ داری تھی غرض یہ کہ قومی اسمبلی ہر طرح سے ملک کا با اختیار ادارہ تھی اس آئین کے تحت ۱۹۵۷ء میں عام انتخابات منعقد کرائے جانے تھے جو مارشل لا کی وجہ سے منسوخ کر دیئے گئے۔ آئین کے تحت گورنر جنرل سکندر مرزا کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پہلا صدر منتخب کر لیا گیا آئین کے نفاذ سے نہ صرف جمہوری عمل کا آغاز ہوا بلکہ قومی زندگی میں حرکت اور عمل کی ایک لہر پیدا ہو گئی لیکن ملک کی نوکر شاہی اور امریکی سامراج کے لیے پاکستانی عوام کی سیاسی بیداری ہر گز قابلِ قبول نہ

تھی۔ انہوں نے باہم سازش کر کے سیاسی بساط کو الٹ دیا اور ملک کو مارشل لاء کے تاریک غاروں میں دھکیل دیا۔

ایوّب خان کا مارشل لاء ۷ راکتوبر ۱۹۵۸ء کو رات کے اندھیرے میں ایک سیاہ کارنامہ انجام دیا گیا جس کا اعلان صدر سکندر مرزا نے ایک فرمان کے ذریعے اس طرح کیا۔

(۱) ملک کا آئین منسوخ کر دیا گیا ہے۔
(۲) مرکزی اور صوبائی حکومتیں برطرف کر دی گئی ہیں۔
(۳) قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئی ہیں۔
(۴) تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔
(۵) ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ہے۔
(۶) جنرل محمد ایوب خان کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیا گیا ہے۔

اس طرح قوم کی نو سالہ آئینی جدّوجہد کو پامال کر دیا گیا۔ آزادی، حرّیت اور جمہوری اقدار کا گلا گھونٹ دیا گیا اور یہ ساری تباہی اپنے ہی جرنیلوں کی نازل کردہ تھی گویا۔

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

ایوّب خان نے کسی جنگ و جدل کے بغیر اس ملک کو فتح کر لیا اور حاکمیت اور قوّت کے اظہار کے لیے مارشل لاء کے سیاہ قوانین مسلط کر دیئے۔ ایوب خان نے ایک فاتح جرنیل کی طرح اپنی ہی قوم کے خلاف مارشل لاء کے قوانین کا استعمال پوری قوّت سے کیا۔ تمام بنیادی حقوق چھین لیے گئے۔ شرفِ انسانی کو تباہ و برباد کرنے کے لیے کوڑے بازی، نظربندی اور دیگر وحشیانہ سزاؤں کے تمام حربے استعمال کیے گئے۔ ۲۷ راکتوبر کو ایوّب خان

نے سکندر مرزا کو بھی اقتدار سے علیحدہ کر دیا اور صدارت کے منصب پر بھی قبضہ کر لیا اس طرح ایوب خان بلا شرکت غیرے ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا ایوب خان کا مارشل لاء کسی اچانک یا فوری حادثے کی پیداوار نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے امریکی سی، آئی، اے کی منظم اور مربوط پالیسی کار فرما تھی۔ ایوب خان کے بھائی اور مسلم لیگ کے مشہور لیڈر سردار بہادر خان کے بیان کے مطابق اکتوبر ۱۹۵۸ء کے انقلاب کا منصوبہ امریکی سی، آئی، اے نے مرتب کیا تھا۔ پاکستان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے ضروری تھا کہ امریکہ اس ملک کے آئینی نظام اور سیاسی اداروں کو پنپنے نہ دیتا اور ان کی بجائے نام نہاد مردانِ آہن کو اس قوم کے سینے پر مسلط کیے رہتا۔ تیس سال کا عرصہ گزر گیا لیکن امریکی پالیسی میں سرِ مُو فرق نہیں آیا۔ قوم ایک مردِ آہن سے نجات حاصل کرتی ہے تو دوسرا مسلط ہو جاتا ہے۔ اس سے جان چھڑاتی ہے تو تیسرا نازل ہو جاتا ہے۔ یہ سلسلہ نمعلوم کب تک جاری وساری رہے گا۔

ایوب خان کا عروج

جنرل محمد ایوب خان اس اعتبار سے ایک خوش نصیب انسان تھے کہ انہیں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت پاکستان کی مسلح افواج کے پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ پاکستان کے اولین کمانڈر انچیف جنرل گریسی تھے آپ کی ریٹائرمنٹ کے بعد جب یہ عہدہ خالی ہوا تو جناب لیاقت علی خان نے کئی سینئر جرنیلوں کو نظر انداز کر کے محمد ایوب خان کو اس عہدے پر فائز کیا تھا اگر ایوب خان صاحب اس اعزاز کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے اور امریکی سامراج کا آلہ کار نہ بنتے تو ان کا نام

ہمیشہ پاکستان کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جاتا اور ان کی عزت و آبرو ہمیشہ کے لیے قوم کے دل میں رہتی۔ نیز گلی گلی "ایوب کتا ہائے ہائے" کے نعرے لگانے کی نوبت نہ آتی مگر کیا کیا جائے طاقت کا نشہ کچھ ایسا گمراہ کن ہوتا ہے کہ انسان کو اپنے ماضی اور مستقبل سے بالکل بے خبر بنا دیتا ہے۔ اسی لیے علامہ اقبالؒ نے تنبیہہ فرمائی تھی کہ:۔

ع صاحبِ نظراں نشہ قوّت ہے خطرناک

جنرل ایوّب خان کو یہ اوّلیت بھی حاصل ہے کہ اس نے اس نوزائیدہ مملکت میں کامیاب فوجی بغاوت کی ابتداء کی تھی اور اس طرح ملکی آئین اور آئینی اداروں کو تباہ کرنے کی ذلت بھی اسی کے حصے میں آئی۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک میں آج تک فوجی آمریت نے جتنے بھی ستم ڈھائے ہیں اور انسانیت کے خلاف بھی جتنے جرائم کا ارتکاب کیا ہے جنرل ایوّب ان میں برابر کا شریک ہے اور اسے اپنے گناہوں کا حساب ضرور دینا ہوگا۔

جنرل ایوّب خان نے ۱۹۵۶ء کے آئین کی پاسداری اور آئینی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا حلف اٹھایا تھا۔ لیکن اسنے اپنے حلف کا کچھ بھی پاس نہ کیا اور ملکی آئین کے ساتھ غدّاری کا ارتکاب کر کے سنگین جرم کیا تھا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کے مطابق جنرل سکندر مرزا کو پاکستان کا پہلا صدر منتخب کیا گیا تھا لیکن صدر کی حیثیت محض آئینی سربراہ کی تھی اور جیسا کہ پارلیمانی نظامِ حکومت کا اصول ہے کہ حکومت کے تمام اختیارات کابینہ کو دیئے گئے تھے۔ جنرل سکندر مرزا فوجی اور سول نوکرشاہی کے سرگرم رکن تھے اس لیے محض آئینی صدر بنے رہنا انھیں کسی طرح بھی

گوارا نہ تھا لہٰذا آپ ہمہ وقت شرپسندی اور وزارتوں کی اکھاڑ پچھاڑ میں مصروف رہتے۔ ایوّب خان کے ساتھ آپ کے گہرے اور دیرینہ مراسم تھے اس لیے آپ کو یقین تھا کہ غیر آئینی کارروائی میں فوج آپ کا ساتھ دے گی۔ دوسری طرف ایوّب خان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ صدر سکندر مرزا کو اپنے حق میں استعمال کریں گے اور جب ان کی ضرورت باقی نہیں رہے گی تو انھیں بھی اقتدار سے الگ کر دیا جائے گا۔

سکندر مرزا کی علیحدگی

سکندر مرزا کو یقین تھا کہ ایوّب خان انکے ساتھ غدّاری نہیں کرے گا وہ شائد اقتدار کے اس بنیادی اصول کو بھول گئے تھے کہ۔

"اقتدار کی جنگ میں احسان مندی کا کوئی مقام نہیں ہوتا"

سکندر مرزا کا کہنا ہے کہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو شام کے وقت جنرل ایوّب خان اور جنرل برکی ان سے ملنے کے لیے آئے انہوں نے اکٹھے باغ میں بیٹھ کر شراب پی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رخصت ہوکر چلے گئے رات کے وقت تقریباً دس بجے ایوانِ صدر کے ایک بیرے نے صدر سکندر مرزا کو اطلاع دی کہ کچھ جنرل آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں سکندر مرزا نے باہر آکر دیکھا کہ مسلّح فوجیوں نے صدر ہاؤس کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ جنرل اعظم خان، جنرل برکی، جنرل کے، ایم شیخ اور بریگیڈیئر شیر بہادر برآمدے میں کھڑے ہیں انہوں نے صدر سکندر مرزا سے کہا کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ آپ فوراً ملک سے باہر چلے جائیں۔ صدر سکندر مرزا نے بغیر کسی حیل و حجّت ان کی تجویز منظور کر لی اور اپنے استعفیٰ پر اور دیگر کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ جنرل صاحبان یہ کارروائی مکمل کرکے واپس

چلے گئے اور بریگیڈیئر شیر بہادر نے سکندر مرزا اور ان کی اہلیہ ناہید مرزا کو ایک فوجی طیارے کے ذریعے کوئٹہ بھجوا دیا جہاں سے وہ ایک ہفتہ کے بعد ہمیشہ کے لیے انگلینڈ روانہ ہو گئے اور اس طرح جنرل ایوّب نے پاکستان کی صدارت پر بھی قبضہ کر لیا اور ملک کے تمام اختیارات ان کی ذات میں مجتمع ہو گئے۔

ایوّب خان اور امریکی مفادات

امریکہ کے ممتاز اخبار نیو یارک ٹائمز نے اپنی ۲۷ جنوری ۱۹۷۶ء کی اشاعت میں انکشاف کیا تھا کہ امریکہ کا غیر ملکی جاسوسی کرنے کا رسوائے زمانہ ادارہ سی، آئی، اے اپنے خفیہ فنڈ سے ترقی پذیر ممالک کے اخبارات، مذہبی و سیاسی جماعتوں اور ان ممالک کے سربراہوں کو ہر سال کروڑوں ڈالر کی رقم فراہم کرتا ہے۔ سی، آئی، اے کی جانب سے اس مد میں تقریباً دس ارب ڈالر سالانہ خرچ کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک غیر ملکی سربراہِ مملکت کو چودہ سال کے دوران ۹ لاکھ ۶۰ ہزار ڈالر دیئے گئے۔ سی، آئی، اے ایسے افراد اور جماعتوں کا نام ظاہر نہیں ہونے دیتا اور اس سلسلے میں انتہائی رازداری سے کام لیا جاتا ہے تاہم نیو یارک ٹائمز نے ایک جماعت کا نام ظاہر کیا تھا اور وہ ہے اطالیہ کی سیاسی جماعت کرسچن ڈیموکریٹک پارٹی جسے انتخابی مہم کے دوران ایک کروڑ ڈالر دیئے گئے لیکن جن مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے نام نیو یارک ٹائمز نے ظاہر نہیں کیے ان میں پاکستان کی دو نیم مذہبی اور نیم سیاسی جماعتیں شامل ہیں اور جس سربراہِ مملکت کو چودہ سال کے دوران نو لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر کی رقم سیاسی رشوت کے طور پر دی گئی تھی وہ صدر ایوّب خان تھے یہ سیاسی رشوت اس خفیہ معاہدے سے

متعلق تھی جو ایوب خان نے امریکہ کو جاسوسی طیارے یو، ٹو کی پروازوں کے لیے پاکستان میں سہولت فراہم کرنے کے لیے کیا تھا۔

ہم اس خبر کی صداقت کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن یہ ضرور ہے کہ ایشیا میں امریکہ کی غیر معمولی دلچسپی اور امریکہ کے ساتھ صدر ایوب کے غیر معمولی گہرے رشتے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ نیویارک ٹائمز کی خبر کلی طور پر صداقت سے خالی نہیں ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایشیائی سیاست میں جو غیر معمولی تبدیلیاں ہوئی ہیں اور امریکہ نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے جو تدابیر اختیار کی ہیں اس کا مختصراً جائزہ لینا ضروری ہے۔۔۔۔ تاکہ سی، آئی، اے کے کردار کو سمجھا جا سکے۔ امریکہ دنیا میں امن، آزادی اور جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہونے کا دعویدار ہے لیکن جب ہم اس کی سیاست اور چھوٹے اور ترقی پذیر ملکوں کے داخلی معاملات میں بے جا مداخلت اور مصنوعی انقلاب کی سرپرستی کا مشاہدہ کرتے ہیں تو امریکہ کے تمام دعووں کا پول کھل جاتا ہے۔ امریکہ نے ایشیائی معاملات کی سیاست میں جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اس کی ابتداء ۱ر جولائی ۱۹۴۸ء کو صدر ٹرومین کے اس بیان سے ہوئی تھی جس میں انہوں نے کہا تھا۔

"بعض ایسی آزاد قوموں جن کی سلامتی امریکہ کے لیے نازک اہمیت کی حامل ہے تے اگر اس وقت اشتراکی یلغار کی مؤثر سیاسی مزاحمت اور وقت پڑنے پر فوجی مزاحمت کرنی ہے تو پھر ان کی فوجی صلاحیتوں کو بڑھانے کی ضرورت ہے لہٰذا اشتراکی توسیع پسندی کا مقابلہ کرنے کی خاطر امریکہ کو چاہیئے کہ وہ ایسی اقوام کی فوجی صلاحیتوں کو ترقی دے بشرطیکہ وہ اقوام

اشتراکی توسیع کو روکنے کی پُرعزم جدّوجہد کریں اور اس قسم
کی امداد سے یہ مقصد حاصل کرنے میں مؤثر تقویت پہنچے"!

مندرجہ بالا اعلان میں یہ بات صاف طور پر نظر آتی ہے کہ امریکہ کی ساری توجّہ دوست ممالک کی فوجی صلاحیتوں کو ترقی دینے پر مرکوز تھی۔ امریکہ کو ایسے دوست ممالک کے دیگر مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لہٰذا امریکہ نے اپنی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے دو اصول قائم کیے یعنی یہ کہ دوست ممالک کے فوجی سربراہوں سے رابطے قائم کیے جائیں اور ایسے ممالک کو فوجی امداد کی پیش کش کی جائے۔

اس عرصے میں ایشیائی سیاست میں بعض نمایاں تبدیلیاں رُونما ہوئیں اور سوویت یونین نے سائنسی ترقی میں اہم پیش قدمی کی لہٰذا امریکہ کو اپنی پالیسی نافذ کرنے کے لیے سُرعت سے کام لینا پڑا۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل واقعات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) سوویت یونین کا ایٹم بم دوسری جنگِ عظیم کے دوران جرمن سائنسدانوں نے ایٹم توڑنے کا زبردست کارنامہ سرانجام دیا تھا اس کے بعد امریکی سائنس دانوں نے پہلی دفعہ ایٹم بم کا کامیاب تجربہ کیا اور امریکی حکومت نے اس بم کا استعمال جاپان کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی پر کرکے پوری دنیا کو خوف زدہ کر دیا تھا اس ایٹمی حملے کے نتیجے میں جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے تھے ایٹم بم کے استعمال سے امریکہ نے تمام دنیا میں سائنسی اور فوجی برتری حاصل کرلی۔ سوویت یونین نے اس صورتحال کا سختی سے نوٹس لیا اور روسی سائنسدان ایٹم بم کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ امریکہ کے جنگی منصوبہ سازوں کا خیال تھا کہ سوویت یونین ۱۹۵۱ء سے پہلے

ایٹم بم تیار نہیں کر سکے گا اور اس طرح دنیا پر امریکہ کی ایٹمی اجارہ داری قائم رہے گی۔ لیکن ۲۳ ستمبر ۱۹۴۹ء کو وائٹ ہاؤس کی طرف سے ایک المناک اعلان کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ سوویت یونین نے ایٹمی اسلحہ کا کامیاب تجربہ کیا ہے اس طرح امریکہ کی ایٹمی اجارہ داری ختم ہوگئی۔

(۲) ماؤزے تنگ کا اعلان

چین میں ایک طویل خانہ جنگی کے بعد ماؤزے تنگ کی سرخ فوج نے پورے چین پر قبضہ کر لیا اور یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو پیکنگ میں ماؤزے تنگ نے عوامی جمہوریہ چین کے قیام کا اعلان کر دیا اس طرح دنیا کے سب سے زیادہ آبادی والے ملک میں کیمونسٹ حکومت قائم ہوگئی۔ امریکہ کو یقین تھا کہ مارشل چیانگ کائی شیک کی حکومت کیمونسٹ انقلاب کا راستہ روکنے کی صلاحیت سے محروم تھی لیکن اس کے باوجود امریکہ انقلاب کی مزاحمت کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کر رہا تھا چین کے سرخ انقلاب سے امریکہ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سوویت یونین نہ صرف ایشیاء بلکہ پوری دنیا میں اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے ایک مضبوط اور باصلاحیت طاقت کی حیثیت سے امریکہ کے مدِّمقابل آگیا ہے۔

(۳) ہوچی منہہ کی کامیابی

ویتنام میں کیمونسٹ لیڈر ڈاکٹر ہوچی منہہ کی انقلابی سرگرمیاں شدت سے جاری تھیں۔ فرانسیسی حکومت ویت نام کی گوریلا فوجوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہوتی جا رہی تھی۔ امریکہ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ چین میں کیمونسٹ انقلاب آنے کے بعد ویتنام میں سرخ انقلاب کو روکنا ایک بڑا دشوار گزار مرحلہ تھا لیکن بڑی طاقت ہونے کے زعم میں امریکہ نے گوریلا فوجوں کو شکست دینے کی

بھرپور کوشش کی مگر اس کے باوجود فرانسیسی فوجوں کو ویتنام چھوڑنا پڑا اور بعد میں ایک طویل جنگ میں شکست کھانے کے بعد امریکہ نے ویتنام خالی کر دیا اور اس طرح ویتنام کیمونزم کی گود میں چلا گیا۔

(۴) ڈاکٹر مصدّق کی کامیابی

ایران کی پہلوی بادشاہت امریکہ کی حلیف تھی لیکن ۲۸ اپریل ۱۹۵۱ء کو ایران میں ڈاکٹر مصدّق کی قیادت میں بائیں بازو کی قوم پرست جماعت برسرِ اقتدار آگئی۔ ایران کے سب سے بڑے پیداواری وسیلے تیل پر برطانیہ کی اجارہ داری قائم تھی ڈاکٹر مصدق نے تیل کے ذخائر کو قومی تحویل میں لے لیا یہ کام مغربی بلاک کے لیے بہت بڑا چیلنج تھا لہٰذا انہوں نے ایرانی تیل کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا اور ڈاکٹر مصدّق کو ہر طرح سے ڈرانے دھمکانے کی کوشش بھی کی لیکن ڈاکٹر صاحب بہت سخت جان ثابت ہوئے اور آپ نے دو سال تک سامراجی سازشوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں ناکام بنا دیا۔

امریکہ اس صورتحال سے سخت پریشان تھا امریکہ شدّت سے محسوس کر رہا تھا کہ اگر ڈاکٹر مصدّق کو ایران جیسے ترقی پذیر مسلم ملک سے ایک قوم پرست لیڈر کی حیثیت سے ابھرنے کا موقع دیا گیا تو ڈاکٹر مصدّق مسلم ممالک اور تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملکوں کے عوام کی نظروں میں آزادی، حرّیت اور ترقی پسندی کی علامت بن جائے گا اس لیے امریکہ نے ڈاکٹر مصدّق کی حکومت کو ناکام بنانے کے لیے ایک طرف تو اپنے حلیف ممالک پر اپنا حلقۂ اثر بڑھانا شروع کر دیا اور دوسری طرف ڈاکٹر مصدّق کی حکومت کا تختہ الٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں امریکہ کے تخریب کار ادارے سی، آئی، اے نے ڈاکٹر مصدّق کا تختہ الٹ کر ایران کا تاج اور تخت ایران کے جلاوطن

بادشاہ رضا شاہ کے حوالے کر دیا۔ امریکہ نے ایک قوم پرست قیادت کو شکست دے کر مسلم ممالک اور ترقی پذیر ممالک کے سیاسی لیڈروں پر واضح کر دیا کہ ان ممالک کے قائدین میں سے جو بھی امریکہ کی پالیسی کی مزاحمت کرے گا اس کا حشر ڈاکٹر مصدق جیسا ہو گا۔ امریکہ کے اس اقدام کے تمام ترقی پذیر ممالک پر دُور رس اثرات مرتب ہوئے اور کسی بھی ترقی پذیر ملک کو امریکہ کی مزاحمت کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس ترقی پذیر ممالک کے قائدین نے یقین کر لیا کہ حکومت قائم رکھنے کے لیے امریکہ کی رضامندی ضروری ہے۔

۵) مصر پر حملہ ۱۹۵۶ء میں مصر کے قوم پرست لیڈر کرنل جمال عبدالناصر نے نہر سوئز کو قومی ملکیت میں لے لیا اس دفعہ امریکہ نے سی، آئی، اے کے توسط سے خفیہ کاروائی کرنے کی بجائے کھلی جارحیت کا مظاہرہ کیا امریکی اشارے پر برطانیہ، فرانس اور اسرائیل کی فوجوں نے بیک وقت مصر پر یلغار کر دی مصر نے اس جارحیت کا منہ توڑ جواب دیا اور بڑی جرأت سے حملہ آور فوجوں کی پیش قدمی روک دی لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر واضح تھی کہ مصر جیسے چھوٹے اور ترقی پذیر ملک کے لیے اتحادی فوجوں کو شکست دینا عملاً ناممکن تھا بہر حال مصریوں نے ہتھیار ڈالنے کے بجائے شہید ہو جانا پسند کیا۔ روس امریکہ کی اس قسم کی جارحانہ کاروائیوں سے پورے طور پر باخبر تھا سوویت قیادت کا خیال تھا کہ اگر امریکہ کو اس قسم کی جارحیت سے روکا نہ گیا تو سوویت یونین کے مفادات کو سخت دھچکا لگے گا چنانچہ امریکی جارحیت کو ناکام بنانے کے لیے سوویت لیڈر مارشل بلگانن نے برطانیہ کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر اتحادی فوجوں نے فائر بندی نہ کی تو روسی

طیاروں کا رُخ برطانیہ کی طرف ہوگا۔ آپ نے برطانیہ کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ۔

"اگر روس جیسا بڑا ملک برطانیہ جیسے چھوٹے ملک پر ایٹمی اسلحہ سے حملہ کر دے تو اس کا کیا حشر ہوگا۔"

اس طرح مصر پر امریکی جارحیت کو ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن دنیا جانتی ہے کہ امریکہ نے اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے ۱۹۶۷ء کی جنگ میں مصر کا کیا حشر کیا تھا۔

(۶) مالن کوف کا اعلان

۱۸ اگست ۱۹۵۳ء کو سوویت یونین کے سربراہ جارجی مالن کوف نے اعلان کیا کہ سوویت یونین نے تھرمونیوکلر بم بنانے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔ دراصل دونوں سپر طاقتیں یعنی امریکہ اور روس اپنی فوجی برتری ثابت کرنے کے لیے دھڑا دھڑ ایٹمی اسلحہ بنانے میں مصروف تھیں امریکہ نے نومبر ۱۹۵۲ء میں ہائیڈروجن بم کا کامیاب تجربہ کیا تھا اس طرح وہ سوویت یونین سے ایک قدم آگے بڑھ گیا تھا لیکن سوویت یونین نے ایک سال سے بھی کم عرصہ میں امریکہ کی برتری کو ختم کر دیا۔ مالن کوف کے اس اعلان سے امریکی حکومت پر گہرا نفسیاتی اثر ہوا اور امریکہ نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ سوویت یونین کی جارحیت کو روکنے کے لیے ایسے اقدامات ضروری ہیں جن سے سوویت فوجی طاقت کو اس کی اپنی جغرافیائی حدود میں ختم کر دیا جائے۔

(۷) لیاقت علی خان کا امریکہ کا دورہ

پاکستان کے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خان ۲۹ اپریل ۱۹۵۰ء کو امریکہ جانے کے لیے لندن پہنچے جہاں سے آپ ۳ مئی

کو صدر کے خصوصی طیارے انڈی پینڈنس کے ذریعے امریکہ پہنچ گئے آپ کا شاندار استقبال کیا گیا وزیراعظم نے دو ماہ تک امریکہ میں قیام کیا اس دوران آپ نے کینیڈا کا دورہ بھی کیا۔ آپ نے امریکہ کے سائنسی، فنی اور تعلیمی اداروں کا معائنہ کیا نیز آپ نے امریکہ کے دونوں ایوانوں سے خطاب بھی کیا ۴ مئی ۱۹۵۰ء کو امریکہ کے نیشنل پریس کلب میں تقریر کرتے ہوئے وزیرِاعظم پاکستان نے کہا۔

"آپ کا ملک امریکہ ان ملکوں میں سے ایک ہے جن کے ساتھ پاکستان نے سب سے پہلے دوستانہ اور سفارتی تعلقات قائم کیے اور سمندر پار ملکوں میں یہ پہلا ملک تھا جس کیساتھ اپنی آزادی کے ابتدائی چند مہینوں کے دوران ہم نے تجارتی تعلقات استوار کیے ہماری کوشش ہے کہ باہمی تعاون اور خیر سگالی کے دور طویل ثابت ہوں اگر میرے دورے کے دوران ہم ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو بہتر طور پر سمجھ سکے تو جیسا کہ مجھے اعتماد ہے میرا دورہ پاکستان کے خارجہ تعلقات کی تاریخ میں زبردست اہمیت کا حامل ثابت ہوگا۔"

اس دورے سے دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور خیر سگالی کے جذبات کو بے شک فروغ حاصل ہوا لیکن معاملات کی نوعیت افہام و تفہیم کی حد تک محدود رہی دونوں ممالک کے درمیان دفاعی تعاون یا مالی امداد پر کوئی سمجھوتہ طے نہ پایا اس کے برعکس بھارت کے وزیرِاعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے جب دسمبر ۱۹۵۰ء میں امریکہ کا دورہ کیا تو دونوں ممالک کے درمیان نہ صرف چار نکاتی سمجھوتے پر دستخط ہوئے بلکہ امریکہ نے بھارت کے پانچ سالہ ترقیاتی منصوبے کے لیے

مالی امداد کی پیش کش بھی کی اور پھر ۱۹۵۱ء میں ہر دو ممالک کے درمیان ایک دفاعی سمجھوتہ طے پا گیا۔ امریکہ کے اس رویّے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ ہر دو ممالک یعنی ہندوستان اور پاکستان کو اپنے زیرِ اثر رکھنا چاہتا تھا لیکن ہندوستان کو پاکستان کے مقابلے میں ترجیح دیتا تھا۔ پاکستان کے وزیرِاعظم کو امریکہ بلانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ امریکہ پاکستان اور روس کے درمیان دوستی اور تعاون کا سدِّ باب کر سکے اس کے برعکس امریکہ ہندوستان کی فی الواقع مالی امداد کرنا چاہتا تھا۔

۱۹۵۳ء میں امریکہ کے صدارتی انتخابات میں ری پبلکن پارٹی کے امیدوار جنرل آئزن ہاور الیکشن جیت گئے آپ نے مسٹر جان فاسٹر ڈلس کو وزیرِ خارجہ مقرر کر دیا مسٹر ڈلس ایک مذہبی آدمی تھے اور کیمونزم کے کٹّر دشمن لہٰذا امریکی انتظامیہ نے اپنی خارجہ پالیسی مرتّب کرتے وقت کیمونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کی طرف سب سے زیادہ توجّہ دی۔ امریکہ نے پاکستان کے جغرافیائی محلِ وقوع اور نظریاتی اساس کو مدِّنظر رکھتے ہوئے امید ظاہر کی کہ پاکستان کو کیمونزم کے خلاف سب سے زیادہ مضبوط محاذ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اس لیے امریکہ نے کیمونسٹ دشمن تمام ممالک سمیت پاکستان کو مالی اور فوجی امداد دینے کا پروگرام مرتّب کر لیا اس وقت مسٹر محمد علی بوگرہ امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے آپ امریکی سیاست کو بخوبی جانتے پہچانتے تھے چنانچہ پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر غلام محمد نے ۱۶ راپریل ۱۹۵۳ء کو خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کر دیا اور ان کی جگہ محمد علی بوگرہ کو پاکستان کا وزیرِاعظم نامزد کر دیا خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کی ایک بڑی وجہ یہ ظاہر کی گئی کہ آپ کے عہدِ حکومت میں ملک میں غذائی قلّت پیدا ہو گئی تھی چنانچہ

امریکہ نے محمد علی بوگرہ کے وزیرِ اعظم بننے کے ایک ہفتے کے اندر اندر پاکستان کو گندم دینے کا اعلان کر دیا۔ امریکہ کے اس اقدام کا واضح مفہوم یہ تھا کہ جناب محمد علی بوگرہ کو امریکہ کی حمایت حاصل ہے نیز یہ کہ امریکہ پاکستان کو صرف ایسی صورت میں امداد دے گا جبکہ پاکستان میں اس کے "پسندیدہ آدمی" برسرِ اقتدار ہوں گے چنانچہ بعد میں ۲۳ فروری ۱۹۵۴ء کو امریکہ نے پاکستان کو تونسہ بیراج کے لیے ۳۵ لاکھ ڈالر کی امداد دینے کا اعلان کیا اور ۲۵ فروری ۱۹۵۴ء کو امریکہ نے پاکستان کو غیر مشروط فوجی امداد دینا بھی منظور کر لیا اسی طرح مئی ۱۹۵۴ء میں دونوں ملکوں میں فوجی امداد کا معاہدہ طے پایا جس کے تحت ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو پاکستان کو اسلحہ اور گولہ بارود کی پہلی کھیپ بھی روانہ کر دی گئی اس طرح امریکہ نے عملاً ثابت کر دیا کہ پاکستان کو فوجی امداد صرف اس کی اپنی مرضی کی حکومت کے ذریعے ہی دی جائے گی۔

۸) مسٹر جان فاسٹر ڈلس کا دورۂ پاکستان

امریکی وزیرِ خارجہ مسٹر جان فاسٹر ڈلس ۲۳ مئی کو پاکستان پہنچے آپ نے پاکستانی رہنماؤں کے ساتھ بین الاقوامی صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کیا اور اپنے دورے کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے اعلان کیا :-

"میرے واضح ترین تاثرات میں سے ایک کا تعلق اس نمایاں اور پُر خلوص دوستی سے ہے جو پاکستانی رہنما امریکہ کے بارے میں محسوس کرتے ہیں عالمی مسائل کے ان کے فہم سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی پوری قوت سے اشتراکیت کے خطرے کا مقابلہ کریں گے آپ جانتے ہیں کہ پاکستان اور امریکہ

اقوام متحدہ میں ایک جیسے خیالات کی مشترکہ تائید کرتے ہیں اور یہ
کہ پاکستان جاپانی معاہدے کے سلسلے میں قوت کا ایک مینار تھا۔"

پاکستان نے امریکہ پر واضح کر دیا کہ مسئلہ کشمیر کی موجودگی میں بھارت کے ساتھ پاکستان کی طرف سے دوستی اور تعاون ممکن نہیں تھا اس لیے ضروری ہے کہ امریکہ مسئلہ کشمیر حل کرانے کے لیے اثر و رسوخ استعمال کرے۔ امریکہ چاہتا تھا کہ یہ مسئلہ دونوں ممالک کے درمیان براہِ راست بات چیت کے ذریعے طے کیا جانا چاہیئے چنانچہ مسٹر ڈلس کے جانے کے بعد ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو بھارت کے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کراچی پہنچ گئے باہمی دلچسپی کے امور پر بات چیت ہوئی اور فیصلہ کیا گیا کہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے تاکہ تمام تنازعات کو پُر امن طور پر طے کیا جا سکے چنانچہ ۱۵ اگست ۱۹۵۳ء کو مسٹر محمد علی بوگرہ اپنے وزیرِ خارجہ چوہدری محمد ظفر اللہ خان کو ساتھ لے کر دہلی پہنچے آپ نے چار روز تک بھارت میں قیام کیا اور اس دوران میں بھارت کے وزیرِ اعظم اور بھارتی حکام کے ساتھ مذاکرات کیے اگرچہ بھارت اور پاکستان کے درمیان گفت و شنید کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا لیکن عملی اعتبار سے متنازعہ امور اور خاص طور پر کشمیر کا مسئلہ حل کرنے میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

(۹) ایوب خان اور غلام محمد کا دورہ امریکہ

ستمبر ۱۹۵۳ء کے اواخر میں پاکستان کے گورنر جنرل اور جنرل ایوب خان امریکہ کے دورے پر گئے جنرل ایوب خان نے امریکہ کے وزیرِ دفاع مسٹر ولسن، جوائنٹ چیف آف اسٹاف کے چیئرمین ایڈمرل فورڈ اور اعلیٰ فوجی حکام سے ملاقاتیں کیں نیز آپ نے امریکہ کی فوجی تنصیبات کا

ملک گیر دورہ کیا۔ پاکستان کے گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف نے سی آئی، اے کے ڈائریکٹر مسٹر ایلن ڈلس کے ساتھ بات چیت کی اور ان کے ساتھ کھانا بھی کھایا مسٹر ایلن ڈلس مسٹر جان فاسٹر کے حقیقی بھائی تھے۔ پاکستان میں اس دورے کے متعلق کئی قسم کے شکوک وشبہات پیدا ہورہے تھے اور پاکستانی پریس اس سلسلے میں نمایاں خبریں شائع کر رہا تھا۔ گورنر جنرل کو ان خبروں سے خاصی پریشانی لاحق ہوگئی کیونکہ آپ کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ پاکستانی عوام یا پریس موصوف کی سرگرمیوں کو زیرِ بحث لانے کی گستاخی کریں۔ گورنر جنرل نے اس صورتِ حال کا سختی سے نوٹس لیا اور آپ نے روزنامہ ڈان کراچی اور ایوننگ اسٹار کراچی کے خلاف کاروائی کر کے ان کے اشتہارات بند کر دیئے۔

پاکستان اور امریکہ کے درمیان قائم ہونے والے رشتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ پاکستان کو کیمونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ چنانچہ امریکی دباؤ پر پاکستان ستمبر ۱۹۵۴ء میں سیٹو کا ممبر بن گیا اور ۱۹۵۵ء میں معاہدۂ بغداد یعنی سینٹو میں بھی شامل ہوگیا۔

(۱۰) مشرقی پاکستان کے انتخابات

مشرقی پاکستان میں مارچ ۱۹۵۴ء میں عام انتخابات منعقد کرائے گئے۔ صوبے کی معاشی حالت انتہائی تشویشناک حد تک خراب ہوچکی تھی اس لیے امریکہ نے اندازہ لگایا کہ اگر پاکستان کو معاشی امداد فراہم کرنے کی یقین دہانی کرائی جائے تو مسلم لیگ کی حکومت کو سہارا دیا جاسکتا ہے ۲۵ فروری ۱۹۵۴ء کو امریکی صدر مسٹر آئزن ہاور نے اعلان کیا کہ امریکہ پاکستان کی دفاعی امداد پر ہمدردانہ غور کرنے کے لیے تیار ہے لیکن امریکی امداد اور امریکی صدر کے اعلان کا اثر مشرقی پاکستان کے عوام پر امریکہ کی توقعات کے

برخلاف مرتّب ہوا۔ مشرقی پاکستان میں حزبِ اختلاف کے متحدہ محاذ نے امریکہ اور پاکستان کے فوجی رشتوں پر زبردست تنقید کی اور ہر دو ممالک کے درمیان طے پائے جانے والے مالی امداد اور دفاعی تعاون کے معاہدوں کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا گیا۔ حزبِ اختلاف کے لیڈر مولانا بھاشانی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کراچی کی حکومت پاکستان کو امریکہ کے جنگ بازوں کے ہاتھوں گروی رکھنے پر تلی ہوئی ہے۔ اس طرح امریکی امداد صوبائی انتخابات کے دوران نفرت کا نشانہ بن گئی اور اس طرح یہ انتخابات امریکی فوجی امداد پر ایک طرح کا ریفرنڈم بن گئے۔ متحدہ محاذ نے مکمل اکثریت حاصل کر لی اور مسلم لیگ کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا اس طرح یہ بات ثابت ہو گئی کہ مشرقی پاکستان نے امریکی امداد کو مکمل طور پر مسترد کر دیا مشرقی پاکستان میں جناب اے، کے فضل الحق کی قیادت میں متحدہ محاذ کی حکومت قائم ہو گئی۔ پورے صوبے میں معاہدوں کے خلاف ایک خاص دن منایا گیا اور ۱۶۲ ارکانِ اسمبلی کی طرف سے ایک مشترکہ بیان جاری کیا گیا جس میں امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدوں کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی۔

مرکزی حکومت نیز امریکہ کے لیے بھی یہ صورتحال کسی بھی طرح قابلِ قبول نہ تھی۔ مرکزی حکومت کا خیال تھا کہ اگر حکومت مشرقی پاکستان پر اپنا مؤثر کنٹرول ثابت نہ کر سکی تو امریکہ یقیناً فوجی اور مالی امداد دینے سے گریز کرے گا۔ دوسری طرف امریکہ کو صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ مرکزی حکومت ملک کے دونوں حصوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھے اور اس قسم کی کسی تحریک کو سر اٹھانے کا موقع نہ دے جس سے امریکی مفادات کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو امریکہ کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ پاکستان کے لوگ کیا

چاہتے ہیں یا یہ کہ پاکستان کے جمہوری ادارے ترقی کی راہ پر گامزن ہو رہے ہیں مرکزی حکومت نے امریکہ کے ساتھ مل کر ایک تاریخ ساز فیصلہ کیا جس میں پاکستانی قومیت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں نیز پاکستان کے عوام اور بالخصوص مشرقی پاکستان کے عوام کو احساس ہوگیا کہ ہماری آزادی اور خود مختاری امریکی حکومت کے رحم وکرم پر ہے پروگرام کے مطابق ۱۹ مئی ۱۹۵۴ء کو کراچی میں امریکہ اور پاکستان کے درمیان دفاعی معاہدوں پر دستخط کیے گئے۔ اور ۲۰ مئی کو مشرقی پاکستان پر چڑھائی کر دی گئی۔

(۱۱) مشرقی پاکستان میں گورنر راج

گورنر جنرل غلام محمد، جنرل سکندر مرزا اور ایوبؔ خان نے امریکہ کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کا تحفّظ دینے کے لیے اور مشرقی پاکستان پر اپنا کنٹرول ثابت کرنے کے لیے ۲۰ مئی ۱۹۵۴ء کو مشرقی پاکستان کی حکومت کو برطرف کر دیا اور صوبے میں گورنر راج نافذ کر کے سکندر مرزا کو گورنر مقرر کر دیا۔ مسٹر محمد علی بوگرہ جن کی حیثیت محض ایک "شو بوائے" کی تھی نے فوراً ایک بیان جاری کیا جس میں اے، کے فضل الحق کو غدار قرار دیا اور ان پر الزام لگایا کہ وہ مشرقی بنگال کو پاکستان سے الگ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں جناب محمد علی بوگرہ نے سکندر مرزا کی تعریف کی اور امید ظاہر کی کہ وہ صوبے میں مکمل انتظام بحال کر دے گا۔ امریکہ نے اس کاروائی پر کسی قسم کا کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا البتہ نیویارک ٹائم نے حکومت پاکستان کی اس کاروائی کو خوش آئند قرار دیا۔

گورنر سکندر مرزا نے اپنی حکومت کی ابتدا وسیع تر گرفتاریوں سے کی آپ نے شیخ مجیب الرحمٰن سمیت بہت سے سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا

اور ملک میں کیمونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کی دہائی دی آپ نے ۶ جولائی ۱۹۵۴ء کو مشرقی پاکستان میں کیمونسٹ پارٹی پر پابندی عائد کر دی اور صنعتی اداروں میں سے کیمونسٹ عناصر کو نکال باہر کیا آپ کی پیروی کرتے ہوئے اٹھارہ دن بعد مغربی پاکستان میں بھی کیمونسٹ پارٹی کو خلافِ قانون قرار دے دیا گیا۔

اس کاروائی سے نہ صرف عوامی رائے عامّہ اور جمہوری اداروں کو کچل دیا گیا بلکہ پاکستان کے وجود کو خطرے میں ڈال دیا گیا مارچ ۱۹۵۴ء کے بعد ملک بھر میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر عام انتخابات دسمبر ۱۹۷۰ء میں منعقد کرائے گئے تھے اسی دوران پاکستان زیادہ عرصے کے لیے مارشل لا کے زیرِ تسلّط رہا لیکن جب دوسرے انتخابات کرائے گئے تو مشرقی صوبے کے عوام پاکستان کو بھول چکے تھے اور انہوں نے ذہنی طور پر عوامی لیگ کے ۶ نکاتی پروگرام کو منظور کر کے مغربی پاکستان سے اپنا رابطہ منقطع کر لیا تھا اور اس کے ایک سال بعد پاکستان سمٹ کر مغربی پاکستان تک محدود ہو گیا اور مشرقی پاکستان ایک علیحدہ وطن کی حیثیت سے عالمِ وجود میں آگیا۔ بنگلہ دیش کی بنیاد دراصل ۳۰ مئی ۱۹۵۴ء کو ہی رکھ دی گئی تھی جب صوبے میں گورنر راج نافذ کر کے سکندر مرزا کو وہاں کا گورنر بنایا گیا تھا۔

(۱۲) دستور ساز اسمبلی کی برطرفی

جناب محمد علی بوگرہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بحیثیتِ وزیرِ اعظم پاکستان ان کی تقرّری گورنر جنرل غلام محمد کی مرہونِ منّت ہے اور آپ اسی وقت تک وزیرِ اعظم رہ سکتے ہیں جب تک کہ آپ کو گورنر جنرل کی خوشنودی حاصل ہے لیکن آپ کو بھی جناب محمد خان جونیجو کی طرح یہ وہم ہو گیا تھا کہ آپ بھی شاید کوئی منتخب وزیرِ اعظم ہیں اور ہر طرح سے بااختیار ہیں آپ کو اسمبلی کی

اکثریت کی حمایت حاصل ہے اور آپ ایک باوقار شخصیت کے مالک ہیں اس وہم میں پڑ کر جناب محمد علی بوگرہ نے ۲۱ ستمبر ۱۹۵۴ء کو دستور ساز اسمبلی سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعات ۹، ۱۰، ۱۰ الف، ۱۰ ب اور ۱۷ کو منسوخ کروادیا ان دفعات کا تعلق گورنر جنرل کے اختیارات سے تھا اس طرح جناب محمد علی بوگرہ نے گورنر جنرل کے اختیارات کو گھٹادیا نیز ان سے کابینہ توڑنے کے اختیارات بھی واپس لے لیے یہ کاروائی بڑے پُراسرار انداز میں اور بڑی عجلت کے ساتھ کی گئی یہ ترامیم ایک ہی دن میں دستور ساز اسمبلی سے منظور کرالی گئیں اور انہیں پاکستان کے سرکاری گزٹ میں شائع کرادیا گیا۔ دوسرے دن یعنی ۲۲ ستمبر کو محمد علی بوگرہ امریکہ روانہ ہو گئے وزیرِ خارجہ چوہدری ظفر اللہ خان، جنرل ایوب خان اور سیکریٹری جنرل چوہدری محمد علی آپ کے ہمراہ تھے۔ اس وفد نے امریکی صدر آئزن ہاور، وزیرِ دفاع، وزیرِ خارجہ اور دیگر اعلیٰ امریکی حکام کے ساتھ ملاقاتیں کیں اور مختلف معاملات پر مذاکرات کیے۔ امریکی نقطۂ نظر سے اس وفد کی مرکزی شخصیت جنرل ایوب خان ہی تھے سی، آئی، اے کے افسران کا کہنا تھا کہ:۔

"ایوب خان پاکستانی فوج پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں مصروف تھے اور وہ امداد کے طور پر امریکہ سے حاصل ہونے والے ہتھیاروں کی قیمت اور قسم کے متعلق امریکہ سے خود ہی براہِ راست معاملات طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

ایوب خان نہایت ہوشیاری سے قدم اٹھا رہے تھے۔ وہ سیاستدانوں کو یہ تاثر دے رہے تھے کہ اُن کے کوئی عزائم نہیں ہیں لیکن وہ اپنی مرکزی حیثیت سے پوری طرح آگاہ تھے اور اچھی طرح جانتے تھے کہ غلام محمد اور

سکندر مرزا مسلّح افواج کی تائید کے محتاج تھے اور یہ تائید حاصل کرنے کے لیے ایوّب خاں کی طرف رجوع کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

اس دورے کے دوران کولمبیا یونیورسٹی نے وزیرِ اعظم کو ڈاکٹر آف لاز کی اعزازی ڈگری دی کیونکہ آپ نے پاکستان سے روانگی سے پہلے گورنر جنرل کے اختیارات کو کم کرنے کے لیے دستور ساز اسمبلی سے ایک ترمیم منظور کرائی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم تھی کہ اصل مذاکرات ایوّب خان اور جوائنٹ چیف آف اسٹاف کمیٹی کے چیئرمین ایڈمرل آرتھر راڈفورڈ کے درمیان کیے گئے تھے۔ ۱۲ر اکتوبر کو پاکستان کے گورنر جنرل نے وزیرِ اعظم کو فوری واپس بلا لیا امریکی حکومت نے اس طلبی پر کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہ کیا۔ محمد علی بوگرہ واپس آنے کی تیاری میں مصروف تھے کہ عین اسی وقت امریکی حکومت نے پاکستان کے لیے ساڑھے دس کروڑ ڈالر کی امداد کے منصوبے کا اعلان کر دیا اور یہ بھی اعلان کیا کہ پاکستان کو ہتھیاروں کی فراہمی میں پچاس فیصد اضافہ کر دیا جائے گا اس اعلان سے یہ تاثر دینا مقصود تھا کہ آئزن ہاور انتظامیہ کو غلام محمد کی کاروائی کے متعلق کوئی شکایت نہیں تھی اور یہ کہ اصل معاملات جنرل ایوّب خان اور ایڈمرل آرتھر فورڈ کے درمیان طے کیے گئے تھے اس موقع پر جوائنٹ چیف آف اسٹاف کی طرف سے ایک دستاویز ایوّب خان کے حوالے کی گئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ فوجی امداد ساڑھے تین برس میں دی جائے گی۔

ادھر محمد علی بوگرہ اپنی ٹیم کے ہمراہ پاکستان آنے کے لیے امریکہ سے روانہ ہوئے تو دوسری طرف مشرقی پاکستان کے گورنر سکندر مرزا، محمد علی بوگرہ

کو لینے کے لیے لندن پہنچے۔ جب محمد علی بوگرہ لندن کے ہوائی اڈے پر اترے
تو دیکھا کہ سکندر مرزا ایک چارٹر طیارے کے ساتھ کھڑے ہیں جو سیدھا انہیں
کراچی لے جائے گا انہوں نے یہ دیکھتے ہی ایوب خان سے فریاد شروع کر
دی اور کہا کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے۔ بوگرہ صاحب ۲۳ر اکتوبر ۱۹۵۴ء
کی رات کراچی پہنچے تو ہوائی اڈے پر مسلح فوجی جوان ان کے استقبال کے لیے
کھڑے تھے بوگرہ صاحب فوجیوں سے گزر کر اپنی کیڈلک کار کی طرف بڑھے تو
ان کی اہلیہ بھی ان کے ساتھ تھیں بوگرہ صاحب کو ان کی کار میں بٹھا دیا گیا
اور ان کے ساتھ دو جرنیل بھی بیٹھ گئے۔ بیگم صاحبہ سے کہہ دیا گیا کہ وہ سیدھی
گھر چلی جائیں کیونکہ بوگرہ صاحب گورنر جنرل کے محل میں جا رہے ہیں۔ بوگرہ
صاحب اپنی جماعت کے ہمراہ گورنر جنرل ہاؤس پہنچے تو ان کو الگ بٹھا دیا
گیا۔ چوہدری محمد علی، ایوب خان اور چوہدری ظفر اللہ خان گورنر جنرل کے
پاس گئے تو موصوف نے ان کا گالیوں کے ساتھ استقبال کیا تھوڑی دیر
کے بعد جناب محمد علی بوگرہ کو گورنر جنرل کے سامنے پیش کیا گیا تو موصوف
نے ان کا استقبال بھی گالیوں کی بوچھاڑ سے کیا اور تکیے کے نیچے سے
ریوالور نکال لیا۔ گورنر جنرل نے وزیر اعظم کو بتایا کہ وہ دستور ساز اسمبلی
کو توڑ رہے ہیں نیز موجودہ کابینہ کی جگہ ایک نئی کابینہ تشکیل دینا چاہتے
ہیں جس میں محمد علی بوگرہ وزیر اعظم ہوں گے ایوب خان وزیرِ دفاع اور
سکندر مرزا وزیرِ داخلہ ہوں گے۔ جب تک محمد علی بوگرہ نے گورنر جنرل
کی تجویز سے اتفاق نہ کر لیا اس وقت تک گورنر جنرل وزیر اعظم کو گالیوں
سے نوازتا رہا اور قتل کرنے کی دھمکیاں دیتا رہا اس دوران ایوب خان
ہاتھ میں ریوالور لیے پردے کے پیچھے کھڑا رہا آخر وزیر اعظم نے اپنی شکست

تسلیم کر کے گورنر جنرل کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے بعد گورنر جنرل قوم کی طرف متوجّہ ہوئے انہوں نے دستور ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور درجِ ذیل فرمان کے ذریعے ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔

" ملک جس بحران سے دوچار ہے گورنر جنرل اس کا جائزہ لینے کے بعد اس افسوس ناک نتیجہ پر پہنچا ہے کہ آئینی مشینری شکست و ریخت کا شکار ہو گئی ہے چنانچہ اس نے پاکستان بھر میں ہنگامی حالات کا اعلان کرنے کا فیصلہ کیا ہے موجودہ دستور ساز اسمبلی عوام کا اعتماد کھو چکی ہے اور اب اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی آخری حق و اختیار عوام کو حاصل ہے اور وہی تمام مسائل بشمول آئینی مسائل کا حل اپنے منتخب کردہ نمائندوں کی وساطت سے کریں گے آزادانہ انتخابات حتی الوسع جلد از جلد ہونگے۔"

جناب محمد علی بوگرہ نے دستور ساز اسمبلی برخاست کرانے کے ساتھ ہی اپنی نئی کابینہ تشکیل دینے کے بعد قوم کے نام ایک پیغام میں گورنر جنرل کے پیغام کی تائید کی اور دستور سازی کو ثانوی حیثیت دیتے ہوئے اپنے پیغام میں کہا:۔

" دستور سازی اہم ہے لیکن ہمارے ملک کی سلامتی اور استحکام اس سے کہیں زیادہ اہم ہے موجودہ دستور ساز اسمبلی کی دستور سازی ایسے امور پر منتج ہوئی ہے جو ہماری قومی یکجہتی کے لیے خطرہ بن گئے ہیں۔ اس نے شخصی، فرقہ وارانہ اور صوبائی رقابتوں کو ابھارا ہے انہیں کچلنا ضروری ہے اور پاکستان کے مفادات کو دوسری ہر شئے سے بالاتر ہونا چاہیئے۔ گورنر جنرل کے اقدام کا مقصد بھی یہی ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے

میری کابینہ اور میں آپ کا خادم ہمیشہ مدِّنظر رکھوں گا۔"

امریکی ہفت روزہ ٹائم نے مندرجہ بالا واقعات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے نئی آمریت کے عنوان سے سکندر مرزا کو پاکستانی فوج کا مردِ آہن قرار دیا ہنگامی حالت کے نفاذ میں انہوں نے جس سرگرمی کا مظاہرہ کیا تھا اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ سکندر مرزا کو دستور ساز اسمبلی برخاست کرانے میں گہری دلچسپی تھی اُسی روز ان کے بیٹے کی شادی پاکستان میں امریکی سفیر مسٹر ہوریس. اے، ہلڈ ریتھ کی صاحبزادی جوزی، فین بلڈ ریتھ کے ساتھ ہو رہی تھی۔ سکندر مرزا نے شادی میں شرکت سے گریز کیا اور اس کے مقابلے میں دستور ساز اسمبلی برخاست کرانے کو ترجیح دی۔

لیکن اصل صورتِ حال یہ نہیں تھی سکندر مرزا بے شک ایک طالع آزما بیورو کریٹ تھے لیکن اس ساری کاروائی کے اصل ہیرو جنرل ایوّب خان تھے جنرل ایوّب خان ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت آگے بڑھ رہے تھے انکے پاس اقتدار پر قبضہ کرنے اور اس ملک میں ایک خاص نظامِ حکومت نافذ کرنے کے لیے باقاعدہ اور منظم منصوبہ موجود تھا جس کا ذکر جنرل ایوب خان نے اپنی کتاب میں کیا ہے موصوف نے لکھا ہے کہ آپ ۷ اراکتوبر ۱۹۵۴ء کو لندن کے ایک ہوٹل میں مقیم تھے جب آپ نے مستقبل میں اپنا سیاسی نظام نافذ کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ جنرل ایوّب خان لکھتے ہیں۔

"یہ ایک گرم رات تھی مجھے نیند نہیں آرہی تھی اور اندیشہ تھا کہ غلام محمد مجھے سیاست میں کھینچ لائے گا یہ وہ بات تھی جس سے میں بہر طور بچنا چاہتا تھا میں پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر چل رہا تھا کہ میں نے خود سے کہا کہ چلو میں فوجی انداز میں ہی

اپنے خیالات قلمبند کر لیتا ہوں ۔ ملک میں خرابی کیا ہے ؟
اور معاملات کو کس طرح درست کیا جا سکتا ہے ؟ فوجی انداز میں
میں نے اس سوال پر غور کیا کہ مسئلہ کیا ہے اور کون سے عوامل ملوث
ہیں جنکا اگر کوئی حل ہے تو کیا ہے ؟ لہٰذا میں اپنے کمرے میں ڈیسک
پر بیٹھ گیا اور لکھنا شروع کر دیا چند گھنٹوں کی محنت میں میں نے
ایک دستاویز تیار کر لی جو میری سوچ پر مشتمل تھی اور ملک کو درپیش
مسائل کے بارے میں میرے طرزِ فکر کو ظاہر کرتی تھی میں اس نتیجہ
پر پہنچا کہ ملک کے امور اگرچہ مایوس کن ہیں لیکن ان سے نجات
حاصل کرنا محال نہیں ہے ۔"

اس طرح ایوب خان نے غیر شعوری طور پر اپنے پروگرام کا خود ہی اعتراف
کر لیا جس سے اس کے پروگرام کی اس کاروائی کی عکاسی ہوتی ہے جو اس نے
ملک پر قبضہ کرنے کے بعد سیاست دانوں کو بدنام کرنے اور سیاسی اداروں
کو تباہ کرنے کے لیے کی تھی اس ساری کاروائی کو ایوب خان کے امریکی سی آئی اے
سے تعلقات کی روشنی میں جانچنے سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ اس
کاروائی میں اشارہ اس طرف سے بھی تھا۔ امریکہ کی نیشنل سکیورٹی کونسل کے
آپریشنز کوآرڈی نیٹنگ بورڈ کی ایک پراگرس رپورٹ میں پاکستان میں رونما
ہونے والی تبدیلیوں کا جائزہ ان الفاظ میں پیش کیا گیا تھا۔

"پاکستان میں عام انتخابات کبھی نہیں ہوئے مرکزی حکومت کا
دارومدار فوج، چند نمایاں شخصیات اور سول سروس پر ہے اس
کا اظہار ۲۱ ستمبر سے شروع ہونے والے ان واقعات سے بھی
ہوتا ہے جبکہ پاکستان کی آئین ساز اسمبلی نے گورنر جنرل کو کابینہ کے

وزراء کا اپنی مرضی سے تقرر کرنے اور اپنی مرضی سے انھیں برخاست
کرنے کے اختیار سے محروم کرنے کی کوشش تھی۔ امریکہ سے وزیراعظم
محمد علی بوگرہ کے کراچی واپس پہنچنے پر ۲۴ راکتوبر ۱۹۵۴ء کو
گورنر جنرل نے فوج، بعض اہم سیاسی قائدین اور سول سروس کی
حمایت کا یقین ہونے کی بنا پر آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا اور وزیراعظم
کو مجبور کیا کہ وہ از سرِ نو کابینہ ترتیب دیں اس جوڑ توڑ کے ذریعے
دو با اثر افراد ایوب خان بطور وزیرِ دفاع جب کہ وہ فوج کے
کمانڈر انچیف بھی بدستور رہے اور سکندر مرزا وزیرِ داخلہ کی حیثیت
سے کابینہ میں شامل کیے گئے۔ لگتا ہے کہ بوگرہ محض اس لیے
وزیرِاعظم برقرار رہے ہیں کہ موجودہ حکمران گروہ کے بڑے رہنماؤں،
گورنر جنرل، ایوب خان اور سکندر مرزا کو ان کی موجودگی پر کوئی اعتراض
نہیں ہے اگر انہوں نے تعاون نہ کیا تو پھر انہیں کسی وقت بھی
برخاست کر دیا جائے گا۔ مرکزی حکومت کے کنٹرول کو مضبوط بنانے
نیز پاکستان اور اس عمومی علاقے میں قوت کی تخلیق کے لیے ہماری
فوجی امداد اہم ہے۔"

پاکستان کے سیاسی نظام اور اس علاقے میں امریکی نقطۂ نظر کی عکاسی
مندرجہ بالا رپورٹ سے بخوبی ہوتی ہے صاف نظر آتا ہے کہ امریکہ کو پاکستان
کے جمہوری اداروں کی ترقی یا جمہوریت کے فروغ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی
اور نہ ہی اسے پاکستان کے عوامی مسائل سے کوئی غرض تھی امریکہ کو صرف اس
بات سے دلچسپی تھی کہ پاکستان میں ایک مضبوط اور مؤثر حکومت قائم ہونی
چاہیے جو ملک پر اپنا مکمل کنٹرول قائم کر سکے اور امریکی مفادات کے تحفظ

کی ضمانت دے سکے یہ ضمانت صرف فوج ہی دے سکتی تھی جس کی قیادت ایوّب خان
کے پاس تھی اس لیے لازمی طور پر امریکہ کی نظرِ انتخاب ایوّب خان پر تھی۔
۷ راکتوبر ۱۹۵۴ء کی رات کو ایوّب خان نے جس منصوبہ بندی کا ذکر کیا ہے اس میں
امریکہ کے مشورے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(۱۳) ایوّب خان کا خفیہ معاہدہ

۱۹۵۸ء میں ایوّب خان نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد امریکہ کے
کے ساتھ دوستی کا ایک معاہدہ کیا اور ۱۹۵۹ء میں امریکہ کے ساتھ ایک خفیہ
معاہدہ بھی کیا جس کے تحت ایوّب خان نے امریکہ کو پشاور کے قریب بڈابیر کے
علاقہ میں ایک خفیہ اڈہ تعمیر کرنے کے لیے دس سال کے پٹے پر دے دیا
یہ ایک خفیہ معاہدہ تھا اور پاکستانیوں کو اس کی کوئی خبر نہ تھی یہ ہوائی اڈہ
امریکہ کے بدنام ادارے سی۔ آئی اے کا تھا۔ یہاں سے ایک خاص قسم
کے ہوائی جہاز "یو، ٹو" انتہائی بلندی پر پرواز کر کے سوویت یونین کے اوپر سے
گزرتے اور روس کے مواصلاتی نظام اور دیگر مقامات کی جاسوسی کرتے تھے۔

(۱۴) یو، ٹو کا حادثہ

امریکہ نے سوویت یونین کے خلاف جاسوسی کا ایک حصار قائم کر رکھا تھا جس کے مطابق ترکی کے
شہر ایڈیانا اور ناروے کے شہر بوڈو میں بھی اسی قسم کے خفیہ اڈے قائم
کیے گئے تھے یو، ٹو طیارے خاص طور پر اس جاسوسی نظام کو قائم رکھنے کے
لیے بنائے گئے تھے ان طیاروں میں جاسوسی کرنے کے نہایت موثر اور
خود کار آلات نصب کیے جاتے تھے یہ اس قدر بلندی پر پرواز کرتے کہ روسی
ریڈاروں کی زد میں نہیں آتے تھے اور جب یہ ایک مقام سے اڑ کر دوسرے
مقام پر جاتے تو اپنے ساتھ نہایت اہم اور خفیہ معلومات بھی لاتے ان پروازوں

کے ذریعے روسی میزائلوں کی تنصیبات، فضائیہ کے اڈوں، فوجی مراکز اور دیگر اہم مقامات کی طاقتور کیمروں کے ذریعے تصاویر اتاری جاتیں اور یہ تصاویر اتنی صاف اور واضح ہوتیں کہ ان میں انسانی چہروں کے خدوخال تک صاف دکھائی دیتے۔

یکم مئی ۱۹۶۰ء بروز اتوار امریکی ہوا باز فرانسس پاورز اپنا جاسوسی طیارہ یو، ٹو بڈابیر کے ہوائی اڈے سے اُڑا کر جاسوسی مشن پر روانہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق فرانسس پاورز کو سوویت یونین کی حدود سے گزر کر ناروے کے فضائی اڈے جوڈو پر اترنا تھا فرانسس پاورز اس سے قبل اس قسم کی کئی کامیاب پروازیں کر چکا تھا یہ سفر انتہائی خفیہ اور خطرناک ہوتا تھا اس لیے اس کی کامیابی کے لیے بہت سی احتیاطی تدابیر اختیار کی جاتی تھیں ہر پائلٹ کو ایک بھرا ہوا ریوالور، پانی پر سفر کرنے کے لیے کشتی، کھانے کے کئی پیکٹ، ہزاروں روسی روبل اور ایک زہر آلود سوئی جو چاندی کے ڈالر میں نصب ہوتی تھی دیئے جاتے تھے پائلٹ کا فرض تھا کہ حادثہ پیش آنے کی صورت میں رازداری قائم رکھنے کے لیے حسبِ حال تدابیر کام میں لائے۔ مثلاً اگر اترنے پر مجبور کر دیا جائے اور اترنے کی جگہ ایسی ہو کہ جہاں صرف چند لوگ موجود ہوں تو ریوالور سے کام لے یا روسیوں کو رشوت دینے کی کوشش کرے اگر پانی کے قریب اترے تو کشتی استعمال کرے لیکن اگر تمام ایسی تدابیر ناکام ہو جائیں تو وہ زہر آلود سوئی چبھو کر خودکشی کر لے۔ فرانسس پاورز ان تمام تدابیر سے بخوبی واقف تھا۔ یکم مئی کا دن حسبِ ذیل دو وجوہات کی بنا پر بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

(۱) اس دن روس میں یوم مئی کی تقریبات منائی جا رہی تھیں ماسکو کے

ریڈ سکوائر کو اعلیٰ پیمانے پر سجایا گیا تھا۔ ہر طرف لوگوں کی بھیڑ بھاڑ لگی ہوئی تھی فوجی پریڈ جاری تھی فوجی دستے مارچ کر رہے تھے اور جدید اسلحہ کی نمائش ہو رہی تھی۔

(۲) اسی دن فرانس کے ایلاسی پیلس میں امریکہ، فرانس، برطانیہ اور سوویت یونین کے سربراہوں کی کانفرنس بھی ہو رہی تھی۔

فرانسس پاورز صبح ساڑھے آٹھ بجے سوویت یونین کی حدود سے پرواز کرتا ہوا روسی شہر لیبرولوراسک کے قریب پہنچا تو روسی راکٹ نے اُسے مار گرایا راکٹ لگتے ہی طیارے میں آگ لگ گئی اس نے فوراً بڈا بیر کے ہوائی اڈے کو حادثے کی اطلاع دی جب طیارہ چالیس ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچا تو اس کا رابطہ کنٹرول ٹاور سے منقطع ہو گیا فرانسس پاورز نے پیرا شوٹ کے ذریعے طیارے سے چھلانگ لگا دی اور شہر کے نواح میں حفاظت سے اتر گیا اس کا طیارہ قریب ہی زمین سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔ فرانسس پاورز چار روسیوں، وی، پی سورن۔ اے، الیف چیری۔ ین ایل، اے جکاکن اور پی، ای اسابن نے پکڑ کر غیر مسلح کر دیا۔ انہوں نے اُسے پانی پلایا سگریٹ دی اور بعد میں اس کو سکیورٹی پولیس کے حوالے کر دیا۔ فرانسس پاورز کی تمام احتیاطی تدابیر ناکام ثابت ہوئیں اور جاسوسی کا راز نہ صرف سوویت یونین بلکہ تمام دنیا پر افشا ہو گیا روسی حکام نے اس حادثے کی اطلاع مسٹر خروشیف کو فرانس میں دی مسٹر خروشیف اس اطلاع پر چراغ پا ہو گئے اور کانفرنس ہال میں پہنچ کر امریکی صدر آئزن ہاور سے اس طرح مخاطب ہوئے۔

"بدمعاش تم ہمارے ملک میں جاسوسی کرتے ہو۔؟"

صدر آئزن ہاور نے اس الزام کی تردید کی تو خروشیف نے گرجتے ہوئے

کہا۔

"بکومت تم حرام کا بچہ جن چکے ہو اب پیٹ نہیں چھپا سکتے تمہارا پائلٹ اس وقت روسی حکام کے سامنے کھڑا ہے اور امریکی جرائم کا اعتراف کر رہا ہے میں اس کانفرنس کو ختم کرتا ہوں، بدمعاشوں اور مجرموں کو سزا دی جاتی ہے ان سے مذاکرات نہیں کیے جاتے۔"

یہ کہتے ہوئے مسٹر خروشیف کانفرنس ہال سے باہر نکلنے لگے تو برطانوی وزیراعظم اور جنرل ڈیگال نے آپ کو روکنا چاہا اس پر مسٹر خروشیف نے جھلا کر کہا۔

"چھوٹی قوموں کو بڑے معاملات میں دخل نہیں دینا چاہیئے۔"

مسٹر خروشیف نے ماسکو پہنچ کر ایک شعلہ بار تقریر کی اور اعلان کیا کہ پشاور کے قریب سُرخ نشان لگا دیا گیا ہے۔ پاکستان نے اس واقع سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لیکن صدر ایوب نے امریکہ سے درخواست کی کہ وہ بڈا بیر سے یو، ٹو کی پروازوں کو بند کر دے یہ اڈا ۱۹۶۹ء تک امریکہ کے قبضے میں رہا اور یحییٰ خان کے دور میں پٹے کی معیاد ختم ہونے پر خالی کر دیا گیا۔ پاکستان کو اس اڈے کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ۱۹۷۰ء میں روس نے بھارت کے ساتھ دفاعی معاہدہ کر لیا۔ ۱۹۷۱ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ شروع ہوئی تو روس نے کھل کر بھارت کی امداد کی۔ جب کہ پاکستان کا سرپرست امریکہ خاموش تماشائی کی حیثیت سے غیر جانبدار ہو گیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں پاکستان ٹوٹ گیا اور امریکہ کا ساتواں بحری بیڑا بحرِ ہند میں گشت ہی کرتا رہا اس ضمن میں

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب مسٹر خروشیف نے پشاور کے مقام پر سرخ نشان لگانے کی دھمکی دی تو ایوب خان نے اس حادثہ پر ندامت محسوس کرنے یا ملک کی حفاظت کیلئے کوئی مناسب اقدام کرنے کے بجائے ۱۹۶۱ء میں امریکی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"براعظم ایشیا میں پاکستان ہی وہ واحد ملک ہے جس کی سرزمین پر امریکی فوجیں آزاد دنیا کے دفاع کی خاطر قیام پذیر ہو سکتی ہیں۔"

گویا پاکستان کی سرزمین پر غیر ملکی فوجوں کا اجتماع ہمارے لیے باعثِ فخر اقدام تھا۔

(۱۵) ایوب خان کی منصوبہ بندی ملک کے اقتدارِ اعلیٰ پر قبضہ کرنے کے بعد جنرل ایوب خان نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اکثر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ انہیں سیاسی اقتدار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور یہ محض حالات کی مجبوری تھی کہ انہوں نے یہ اعلیٰ منصب قبول کر لیا اپنے دعوے کی تائید میں ایوب خان نے حسبِ ذیل تین واقعات کا ذکر کیا۔

(۱۶) سر آغا خان کا مشورہ ایوب خان کا بیان کہ وہ ۱۹۵۱ء میں سرکاری کام کے سلسلے میں لندن گئے تھے جہاں انہیں سر آغا خان نے پیرس بلوایا اور پاکستان کے حالات پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"پاکستان میرے خواب کی تعبیر ہے تم لوگوں نے اسے بڑی قربانیوں سے

حاصل کیا ہے اب اُسے کھو نہ دینا اگر تم لوگوں نے پاکستان میں پارلیمانی نظامِ حکومت جاری رکھا تو مجھے خدشہ ہے کہ تم اُسے کھو بیٹھو گے میں نے تمہیں اس لیے یہاں بلایا ہے کہ تمہیں بتا دوں کہ ملک کو تم اور صرف تم ہی تباہی سے بچا سکتے ہو۔"

ایوب خان نے اس مشورے کا کوئی خاص اثر نہ لیا اور ملک کے سیاسی نظام میں مداخلت سے گریز کیا تین برس بعد یعنی اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ایوب خان کو گورنر جنرل غلام محمد نے ملک میں ایمرجنسی نافذ کرتے وقت اقتدار پر قبضہ کرنے کی دعوت دی جو اس نے قبول نہ کی۔

ایوب خان نے اپنی کتاب میں مزید لکھا ہے کہ چوہدری محمد علی نے وزارتِ عظمیٰ کے ساتھ ساتھ وزارتِ دفاع کا قلمدان بھی اپنے پاس رکھا تھا۔ جنرل ایوب خان کسی سرکاری مسئلے پر بات چیت کرنے کے لیے چوہدری محمد علی سے ملے تو چوہدری صاحب نے ایوب خان سے کہا:

"میری پارٹی نے مجھے چھوڑ دیا ہے اور حالات سنگین صورت اختیار کر گئے ہیں کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم ٹیک اوور کر لو۔"

لیکن ایوب خان نے چوہدری صاحب کی دعوت کو بھی مسترد کر دیا اور ان کو مشورہ دیا کہ آپ صدرِ مملکت سے مل کر کوئی حل تلاش کر لیں اس طرح ایوب خان نے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ انھیں ملک کے اقتدارِ اعلیٰ پر قبضہ کرنے کی کوئی حقیقی خواہش نہ تھی لیکن واقعات ایوب خان کے اس بیان کی تائید نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں دو تین باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) راولپنڈی سازش کیس

ایوبؔ خان کو اچھی طرح علم تھا کہ انھیں کئی سینئر جرنیلوں کو نظرانداز کر کے کمانڈر انچیف بنایا گیا تھا اور اس طرح ایوبؔ خان بالفعل مکمل طور پر فوجی حمایت کی توقع نہیں کر سکتے تھے آپ کے کمانڈر انچیف بننے کے بعد فوج کے اندر ایک اہم واقع رُونما ہوا جو راولپنڈی سازش کیس کے نام سے مشہور ہے اس کیس میں کئی اعلیٰ فوجی افسر ملوث تھے اس لیے ان حالات میں ایوبؔ خان کا سیاسی اقتدار پر قبضہ کرنا تباہی کو دعوت دینے کے مترادف تھا

(۲) لیاقت علی خان کا قتل

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی شہر میں پاکستان کے وزیرِ اعظم لیاقت علی خانؒ کو دن دھاڑے قتل کر دیا گیا اس قتل کے متعلق بھی الزام لگایا جاتا رہا ہے کہ یہ قتل کسی گہری سازش کا نتیجہ تھا اور سیاست دانوں کے ایک خاص گروپ نے لیاقت علی خان کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے اس سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ ہر چند کہ اقتدار میں آنے کے بعد ایوبؔ خان نے اس قسم کی کسی بھی سازش کے وجود سے انکار کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ لیاقت علی خان کا قتل سید اکبر کا ذاتی فعل تھا بہر حال ایوبؔ خان سیاسی حالات کی سنگینی سے اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ اگر انہوں نے قبل از وقت اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو نتائج سنگین بھی ہو سکتے ہیں۔

(۳) ایوبؔ خان کا اقتدار پر قبضہ

غلام محمد کے گورنر جنرل بننے اور ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کے نفاذ تک ایوب خان ملکی معاملات میں گہری دلچسپی کا اظہار کرتے رہے ہیں اور مرکزی حکومت کی اکھاڑ پچھاڑ میں ہمیشہ قابلِ ذکر کردار ادا کرتے رہے ہیں۔

اس کے علاوہ غلام محمد اور سکندر مرزا کی حکومتیں ایوبؔ خان کے سہارے پر ہی چلتی رہیں اس سلسلے میں ایوبؔ خان کو براہِ راست مداخلت کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

دراصل ایوبؔ خان کے طرزِ عمل سے قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جنرل ایوبؔ خان کے ذہن میں ملک میں ایک خاص قسم کا نظام حکومت قائم کرنے کا واضح نقشہ موجود تھا اس پروگرام پر عمل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ:۔

(الف) ملک میں سیاسی نراجیت اس حد تک پھیل جائے کہ لوگ مروّجہ سیاسی نظام سے مایوس ہو جائیں اور سیاست دانوں کو مطعون کرنے لگیں اور اس طرح ملک میں ایک سیاسی خلاء پیدا ہو جائے جسے پُر کرنے کے لیے ایوبؔ خان نجات دہندہ بن کر نازل ہو جائے۔

(ب) امریکہ کو یقین ہو جائے کہ اس کے مفاد کا تحفّظ ایوبؔ خان اور صرف ایوبؔ خان ہی کر سکتا ہے۔

چنانچہ ایوبؔ خان مناسب موقع کے انتظار میں رہے اور جونہی حالات سازگار ہوئے ایوبؔ خان نے نہ صرف اقتدار پر قبضہ کر لیا بلکہ وہ مقاصد بھی حاصل کر لیے جن کے لیے انہوں نے ایک خاص مدّت تک انتظار کیا تھا۔ چنانچہ مارشل لاء کا اعلان ہوتے ہی عوام نے سُکھ کا سانس لیا اور مارشل لاء کے نفاذ کو خوش آمدید کہا اس طرح ایوبؔ خان پاکستان کے عوام، مسلح افواج اور امریکہ کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور دس سال تک اس قوم پر آمرِ مطلق کی طرح حکومت کرتے رہے۔ ایوبؔ خان نے اکتوبر ۱۹۶۸ء میں اپنی انقلابی کامیابیوں کا عشرہ منایا اس اقدام سے انکا مقصد صرف یہ تھا کہ عوام اور فوج کی حمایت حاصل کی جائے تاکہ تاحیات ملکی اقتدار پر قبضہ قائم رکھنے

کی ضمانت مل سکے۔ لیکن اس عنصرے کا اثر ایوّب خان کی توقعات کے بالکل برعکس برآمد ہوا اور ایوّب خان کے خلاف عوامی تحریک چل پڑی جس نے بالآخر ایوّب خان کا تختہ الٹ دیا۔ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایوّب خان نے اتفاقی طور پر اقتدار حاصل نہیں کیا تھا بلکہ پورے غور و فکر کے بعد ہی فوجی انقلاب برپا کیا تھا۔

ایوّب خان کا زوال

اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ایوّب خان کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز ہوا رفتہ رفتہ یہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی ابتدا میں ایوّب خان نے طاقت کے ذریعے تحریک کچلنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ تب آپ کی نظریں فوج کی طرف اٹھیں ایوّب خان نے اپنی ذاتی روایت پر عمل کرتے ہوئے کئی سینئر جرنیلوں کو نظر انداز کر کے جنرل یحییٰ خان کو کمانڈر انچیف بنایا تھا۔ گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد ایوّب خان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب اُن کا زوال ناگزیر ہے ایوّب خان کے لیے آسان اور آئینی راستہ تو یہ تھا کہ آپ منصبِ صدارت سے استعفیٰ دیدیتے اور حکومت کی ذمہ داریاں قومی اسمبلی کے اسپیکر کے سپرد کر کے حکومت سے الگ ہو جاتے لیکن یہ طریقہ آمریت کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھا آپ نے اپنے کمانڈر انچیف کو بلوا کر اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ چند شہروں میں مارشل لاء لگا دیا جائے مگر ناکام رہے۔ یحییٰ خان دیکھ رہے تھے کہ حالات پر قابو پانا ایوّب کے بس کی بات نہیں رہی تھی اور آئندہ صدارت کا اُمیدوار ان سے بہتر کوئی اور دوسرا نہیں ہو سکتا اس لیے انہوں نے ایوّب خان کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ دراصل تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی ایوّب خان اپنے پیشرو سکندر مرزا کی کرسی پر بیٹھے تھے جب ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء

کوشام کے وقت کمانڈر انچیف یحییٰ خان دو جرنیلوں کو ساتھ لے کر آپ کے
دفتر میں پہنچا تو ایوب خان نے پوچھا۔

"یحییٰ خان کیا چاہتے ہو ؟"

یحییٰ خان نے جواب دیا۔

"مارشل لاء لگانے کا وقت آگیا ہے اور مارشل لاء چند علاقوں
میں نہیں پورے ملک میں لگے گا۔"

ایوب خان نے نہایت افسردگی کے عالم میں کہا۔

"جو تم چاہتے ہو وہی ہوگا مجھے تمہاری تجویز منظور ہے۔"

اس کے بعد قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے ایوب نے یحییٰ خان
کے نام ایک چھٹی لکھی جس میں انہیں اقتدار سنبھالنے کی دعوت دی گئی اور
ساتھ ہی اپنا استعفیٰ بھی پیش کردیا۔

اس طرح ایوب خان انہی راستوں سے ایوانِ اقتدار کو خالی کر کے رخصت
ہوگیا جن راستوں سے وہ اس ایوان میں داخل ہوا تھا۔

یعنی ؎ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

۱۹۶۲ء کا آئین

ایوب خان ایک آمر مطلق ہونے کی حیثیت سے کسی آئین کا
پابند ہونا نہیں چاہتے تھے ہر آمر کی طرح اس کا خیال تھا
کہ وہ آئین سے بالاتر شخصیت ہے اور اس کا ہر لفظ قوم کیلئے قانون کا درجہ رکھتا ہے مگر مشکل یہ
آن پڑی تھی کہ دنیا کے بیشتر ممالک مارشل لاء کے نفاذ کو قابلِ نفرت اقدام سمجھتے تھے اور ملک میں
غیر آئینی حکومت کو وقعت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے آئین کا نفاذ ایوب خان کی ایک ضرورت
تھی اس نے آئین نافذ کرنے سے پہلے ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو بنیادی جمہوریتوں کا حکم جاری کیا اس
قانون میں ایسا کوئی اشارہ موجود نہیں تھا جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ بنیادی

جمہوریت کے ارکان، صدر اور مجالس قانون ساز کا انتخاب کریں گے۔ پروگرام کے مطابق جنوری ۱۹۶۰ء تک بنیادی جمہوری اداروں کے انتخابات مکمل کر لیے گئے۔ یہ انتخابات غیر سیاسی بنیادوں پر کرائے گئے تھے اور سیاسی جماعتوں کو انتخابات میں حصہ لینے یا اپنے امیدوار نامزد کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ جیسا کہ جناب ایس، ایم ظفر کا خیال ہے کہ :۔

"غیر آئینی حکومت کو آئینی اور قانونی حکومت بنانا ہر ڈکٹیٹر کے لیے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔"

ایوب خان کو بھی یہ مسئلہ درپیش آیا اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی حکومت کا آئینی جواز فراہم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عوام کے منتخب نمائندوں یعنی بنیادی جمہوری اداروں کے ارکان سے رجوع کیا جائے اور اس طرح اپنے حق میں اعتماد کا ووٹ حاصل کیا جائے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ایوب خان نے ۱۴ فروری ۱۹۶۰ء کو ملک میں ریفرنڈم کرایا جس میں بنیادی جمہوری اداروں کے ارکان سے ایک سوال پوچھا۔

"کیا آپ کو صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ہلال پاکستان، ہلال جرأت پر اعتماد ہے ؟"

یہ سوال ایک پرچی پر طبع کرایا گیا تھا جس پر ایوب خان کی تصویر چسپاں کی گئی تھی۔ رائے دہندگان نے صرف "ہاں" یا "نہیں" میں جواب دینا تھا۔ ایوب خان کو کل ڈالے گئے ووٹوں میں سے ۹۵٫۶ فیصد ووٹ ملے اس طرح ایوب خان ملک کا صدر منتخب ہونے میں کامیاب ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی عوام کے منتخب نمائندوں نے اعتماد کا ووٹ دے کر ایوب خان کو یہ اختیار دے دیا تھا کہ ایوب خان اس ملک میں اپنی مرضی کا آئین نافذ

کرے اور اپنی صوابدید کے مطابق ملک کا انتظامی ڈھانچہ مرتب کرے ہر چند کہ اس ریفرنڈم کی کوئی آئینی حیثیت نہیں تھی اس لیے کہ ملک میں کوئی آئین ہی نافذ نہیں تھا اور بلدیاتی اداروں کے ارکان کو صدر پر اعتماد کا اظہار کرنے کا کوئی قانونی، آئینی یا اخلاقی اختیار بھی نہیں تھا یہ محض ایک ڈھونگ ہی تھا جو صدر ایوب نے دنیا کی نظروں میں دھول جھونکنے کے لیے رچایا تھا۔ بہر حال صدر ایوب نے اس ریفرنڈم کو بنیاد بنا کر ۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو منتخب صدر ہونے کا حلف اٹھا لیا۔

صدر منتخب ہونے کے بعد ایوب خان نے مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) شہاب الدین کی سربراہی میں آئین کمیشن قائم کیا۔ کمیشن کے چیئرمین نے یہ منصب اس شرط پر قبول کیا تھا کہ اوّل آپ کے کام میں مداخلت نہیں کی جائے گی اور دوئم آپ کی رپورٹ من وعن شائع کر دی جائے گی۔ کمیشن نے ایک طویل سوالنامہ جاری کیا اور پورے ملک کا دورہ کر کے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے تبادلہ خیال کیا۔ کمیشن نے مئی ۱۹۶۱ء میں اپنی رپورٹ ایوب خان کے سامنے پیش کر دی۔ ان سفارشات میں صدارتی نظام حکومت تجویز کیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی عوام کے بنیادی حقوق، مقننہ اور عدلیہ کی آزادی پر زور دیا گیا تھا اور ملک میں براہ راست بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کرانے کی سفارش کی گئی تھی۔ ایوب خان نے صدارتی نظام حکومت کے علاوہ کمیشن کی تمام سفارشات کو مسترد کر دیا نیز اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کمیشن کی رپورٹ شائع کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

ایوب خان نے جسٹس شہاب الدین کو مطمئن کرنے کے لیے سب

سے بڑا سول ایوارڈ دینے کی پیشکش کی جس کو موصوف نے قبول کرنے سے انکار کردیا اور آئندہ کے لیے بطورِ احتجاج تمام سرکاری تقاریب میں شامل ہونے سے بھی انکار کردیا۔ یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو ایوب خان نے اپنا نیا آئین مرتب کرنے کا اعلان کردیا اس آئین میں ۲۵۰ آرٹیکل اور ۵ شیڈول شامل تھے ۱۹۶۲ء کے آئین کے اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) وفاقی حکومت صدارتی نظام کے ماتحت ہوگی۔

(۲) مرکز میں ایک ہی قومی اسمبلی ہوگی اور اسی طرح دونوں صوبوں میں ایک ایک صوبائی اسمبلی ہوگی۔

(۳) تمام اسمبلیاں ایک ایوانی ہوں گی۔

(۴) وفاق کے تمام انتظامی اختیارات صدر کو تفویض ہوں گے وہ اپنی مرضی سے اپنی کابینہ کے ارکان نامزد کرے گا۔ یہ ضروری نہیں ہوگا کہ ارکانِ کابینہ عوام کے منتخب نمائندے ہوں۔ وزراء صرف صدر کو جوابدہ ہونگے اور قومی اسمبلی کو جوابدہ نہیں ہوں گے۔

(۵) قومی اسمبلی صدر کو اس کے عہدے سے ہٹا نہیں سکے گی اور نہ ہی صدر قومی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

(۶) صوبائی گورنر صدر ہی کے نامزد کردہ ہوں گے اور وہ بھی صوبائی اسمبلیوں کو جوابدہ نہیں ہونگے۔ صوبائی گورنر بھی اپنی کابینہ خود ہی نامزد کریں گے۔

(۷) صدر اور اسمبلیوں کے انتخابات بالواسطہ ہوں گے۔ پہلے براہِ راست بالغ رائے دہی سے اسّی ہزار ممبران بنیادی جمہوریت منتخب ہوں گے اور پھر یہ ممبران صدر اور ارکانِ اسمبلی کا انتخاب کریں گے۔

(۸) صدر کے عہدے کے لیے صرف تین امیدوار کھڑے ہو سکیں گے۔
(۹) قومی اسمبلی میں صدر اور صوبائی اسمبلیوں میں گورنروں کی اجازت کے بغیر کوئی نظر بندی کا بل یا اس کی ترمیم پیش نہیں ہو سکے گی۔
(۱۰) اگر قومی اسمبلی کے پاس کیے ہوئے بل کو صدر نا منظور کر دے تو یہ بل قومی اسمبلی کو دوبارہ غور کرنے کے لیے لوٹا دیا جائے گا۔
(۱۱) بجٹ منظور کرنے کے تمام اختیارات صدر کے پاس ہوں گے اور اسمبلی کا اس ضمن میں کوئی اختیار نہیں ہوگا۔
(۱۲) عوام کے بنیادی حقوق کا ذکر تو اس آئین کے مسودے میں ہی تھا لیکن ان حقوق کے نفاذ کے لیے عدلیہ کو کوئی اختیار نہیں دیا گیا تھا۔
(۱۳) آئین میں سیاسی جماعتوں کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

اس آئین کے تحت اپریل ۱۹۶۲ء میں قومی اسمبلی اور مئی ۱۹۶۲ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کرائے گئے یہ انتخابات بھی غیر سیاسی بنیاد پر منعقد ہوئے تھے اور ان انتخابات میں بھی کسی سیاسی جماعت کو حصہ لینے یا اپنا امیدوار کھڑا کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ صدر ایوب خان نے ۸ جون ۱۹۶۲ء کو قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس کا افتتاح کیا اور اس کے ساتھ ہی مارشل لاء اٹھانے کا اعلان کر دیا۔ صدر ایوب خان نے قومی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے اپنے نئے منشور کا اعلان کیا۔ جس میں واضح طور پر تسلیم کیا گیا کہ جمہوریت ہماری سیاست کا محور ہے۔ ایوب خان نے قومی اسمبلی پر یہ بھی واضح کیا کہ نہ تو میری کوئی سیاسی جماعت ہے اور نہ ہی میں کوئی سیاسی جماعت تشکیل دینا چاہتا ہوں لیکن اس کے فوراً بعد اس نے کنونشن مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی بہرحال

۸ر جون ۱۹۶۲ء سے مارشل لاء کی تاریک رات اپنے اختتام کو پہنچی اور قوم نے آزادی کی فضا میں سانس لیا۔

ایوبّ خان کی حکمرانی

آمریت ایک ذہنی بیماری ہے دنیا کا ہر آمر ایک شدید قسم کے احساس برتری میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انتہائی بلندی پر محسوس کرتا ہے اور اس کی قوم بلکہ تمام بنی نوعِ انسان اس کے سامنے محض کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں وہ اپنی قوم کی کامیابیوں کو اپنی ذات سے منسوب کرتا ہے اور اپنی ناکامیوں اور گناہوں کو قوم کے حساب میں ڈال دیتا ہے یہ وہ مشترک عناصر ہیں جو دنیا کے تمام آمروں میں پائے جاتے ہیں ایوبّ خان نے بھی اقتدار سنبھالتے ہی اپنے آپ کو اس بلندی پر دیکھنا شروع کیا اور محسوس کیا کہ دنیا کی تمام حکمت ودانائی فہم وفراست اور عقل وخرد کے چشمے ان کی ذات سے پھوٹتے ہیں قوم کی حیثیت محض جانوروں کی سی ہے جسے ہانکنے اور قابو میں رکھنے کے لیے صرف ڈنڈے کی ضرورت ہے ملک کے سیاسی، قانونی، سماجی اور نظریاتی یا دیگر مسائل پر قوم سے مشورہ کرنا یا قوم کی رائے لینا بیکار محض ہے۔ ایوبّ خان کا خیال تھا کہ اُس نے ملک میں کامیاب انقلاب برپا کیا ہے۔ اس لیے وہ ملک میں انقلابی تبدیلیاں لا کر پاکستان کی تاریخ میں ایک منفرد مقام حاصل کرے گا۔ اس ذہنی پس منظر میں ایوبّ خان نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنی اصلاحات کا آغاز کیا لیکن ان تمام اصلاحات کا وہی حشر ہوا جو ایوبّ خان کا اپنا ہوا تھا۔ البتہ قوم ان اصلاحات کی پیدا کردہ تباہی کے نتائج ابھی تک بھگت رہی ہے۔ ان اصلاحات کی ناکامی کا بڑا سبب یہ تھا کہ یہ تمام اصلاحات ایوبّ خان نے نوکر شاہی کے تعاون سے نافذ کی تھیں اور نہ تو اس ضمن میں قوم سے مشورہ کیا گیا اور نہ ہی ان اصلاحات

کے پیچھے کارفرما فکر و فلسفہ عوام کے ذہنوں میں جڑ پکڑ سکا ایوب خان نے اپنی اصلاحات کو نافذ کرنے کے لیے جو کمیشن قائم کئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ زرعی اصلاحات کمیشن
۲۔ جہازرانی کمیشن
۳۔ اصلاحِ قانون کمیشن
۴۔ انتظامیہ کی تنظیم نو کے لیے کمیٹی
۵۔ کمیشن برائے قومی تعلیم
۶۔ صدر مقام کے محل وقوع کی کمیٹی
۷۔ تحقیقاتی کمیشن برائے قرضہ جات
۸۔ غذائی و زرعی کمیشن
۹۔ سائنس کمیشن
۱۰۔ تنخواہ و ملازمت کمیشن
۱۱۔ کمپنی قانون کمیشن
۱۲۔ طبّی اصلاحات کمیشن
۱۳۔ کھیل و ثقافت کی کمیٹیاں
۱۴۔ پولیس کمیشن
۱۵۔ آئین کمیشن
۱۶۔ قیمتوں کے تعیّن کا کمیشن
۱۷۔ فلمی معلوماتی کمیشن
۱۸۔ فالتو افرادی طاقت کا کمیشن
۱۹۔ سماجی برائیوں کا کمیشن
۲۰۔ برقی طاقت کا کمیشن
۲۱۔ مالیاتی کمیشن
۲۲۔ قرضہ جاتی کمیشن
۲۳۔ رائے دہی کی کمیٹی
۲۴۔ قومی آمدنی کمیشن
۲۵۔ قومی مالیات کمیشن
۲۶۔ اقلیتوں کا کمیشن
۲۷۔ نشریاتی کمیشن
۲۸۔ پریس کمیشن (یہ بہت پہلے قائم ہو چکا تھا لیکن اس کی رپورٹ مئی ۱۹۵۹ء میں موصول ہوئی)
۲۹۔ شکر کمیشن (یہ بھی پہلے ہی قائم ہو چکا تھا لیکن رپورٹ اگست ۱۹۵۹ء میں موصول ہوئی)
۳۰۔ شادی و عائلی قوانین کمیشن

عائلی قانون کا کمیشن ۱۹۵۴ء میں قائم ہوا تھا اور اس کی رپورٹ ۱۹۵۶ء میں موصول ہو چکی تھی ایوب خان نے ۱۹۶۱ء میں مسلم فیملی لاز آرڈیننس جاری

کیا اس قانون کا تعلق مسلمانوں کے شادی بیاہ و طلاق وغیرہ کے تنازعات طے کرنے سے تھا یہ قانون اب بھی نافذ العمل ہے لیکن پاکستان کے علماء نے اسلامی نقطۂ نظر سے اس قانون کو درست تسلیم نہیں کیا۔ اور وہ اس پر اکثر و بیشتر تنقید کرتے رہتے ہیں۔

ایوبؔ خان کی زر پرستی

برِّ صغیر کے عظیم شاعر اور میرے ذہنی رہنما مرزا اسد اللہ خان غالبؔ اُردو اور فارسی شاعری میں عالمگیر شہرت کے مالک ہیں آپ کو مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفرؔ کی اُستادی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ علامہؔ اقبالؔ نے آپ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

ع آہ تو اجڑی ہوئی دِلیؔ میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

یعنی اگر پوری دنیا میں کوئی بھی شاعر غالبؔ کا حریف ہوسکتا ہے تو وہ صرف جرمنی کا نامور شاعر گوئیٹے ہے شعروسخن کی دنیا میں غالبؔ کی عظمت ایک مسلمہؔ حقیقت ہے لیکن مرزا غالبؔ کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا آپ نے جس بات پر فخر کیا وہ آپ کی شاعرانہ عظمت ہی نہیں تھی بلکہ سپہ گری کا فن تھا مرزا غالبؔ کا ارشاد ہے۔

ع سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

سپہ گری کا فن نہ صرف برِّ صغیر کی تاریخ میں بلکہ پوری دنیا میں ہمیشہ قابلِ احترام رہا ہے اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہر ملک کی مسلّح فوج اپنے ملک اور قوم کو غیر ملکی جارحیت سے محفوظ رکھنے کا فریضہ انجام دیتی ہے دوسرا خاص

سبب یہ ہے کہ فوج کا وجود اپنی ذات میں قوم کی طاقت، شان وشوکت، قوّت اور وقار کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے اس لیے قوم کے دل میں اپنی فوج کے لیے خلوص، محبّت اور احسان مندی کے جذبات قدرتی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ مرزا غالب نے اپنے شعر میں اسی بلیغ حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

جرمنی کا مشہور نغمہ نگار شوبَٹ اپنی تنگدستی سے تنگ آگیا اس نے اپنا افلاس دور کرنے کے لیے اپنے لڑکوں کو موسیقی سے دور رکھنے کی کوشش کی اُس نے اپنے ایک لڑکے کو بحریہ میں بھرتی کرا دیا دوسرے کو مہندسِ عمارت کی تعلیم دلوائی اور تیسرے کو کچھ اور سکھایا لیکن ۳۵، ۴۰ سال کی عمر میں یہ تمام لڑکے نغمہ نگاری کی طرف واپس آگئے اور اپنا آبائی پیشہ اختیار کر لیا۔ شوبَٹ کے لڑکوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ نغمہ نگاری ان کے لیے معاشی خوشحالی کا سبب نہیں بن سکتی اس کے باوجود انھوں نے غربت کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا لیکن اپنے والد کے راستے کو چھوڑنا پسند نہیں کیا۔

ایوّب خان کا آبائی پیشہ بھی سپہ گری تھا اس کے والد میرداد نے انگریزی فوج میں ملازمت کی اور رسالدار میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایوّب خان نے خود بھی فوجی ملازمت اختیار کی اور اپنے دونوں لڑکوں، گوہر ایوّب اور اختر ایوّب کو بھی فوج میں کمیشن دلوایا۔ جب ایوّب خان ایوانِ صدر میں داخل ہوئے تو گوہر ایوّب اپنے والد کا اے ڈی سی مقرّر ہوا اور گوہر ایوّب کے ملازمت چھوڑنے کے بعد اختر ایوّب بھی اپنے والد کا اے ڈی سی ہی مقرّر کیا گیا ایوانِ صدر میں آنے کے بعد ایوّب خان نے اپنی اور اپنے لڑکوں کی ملازمت کے متعلق دو اہم فیصلے کئے ان فیصلوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں فیصلے بددیانتی پر مبنی تھے اور

محض دولت جمع کرنے کی خاطر کئے گئے تھے۔ ان فیصلوں میں ایوب خان نے اپنے آپ کو ترقی دے دی اور اپنے دونوں لڑکوں کو فوج سے نکال کر کاروبار کی طرف لگا دیا۔

ایوب خان کی ترقی

ایوب خان نے کابینہ کی منظوری سے اپنے آپ کو جنرل کے عہدے سے ترقی دے کر فیلڈ مارشل بنوالیا کیونکہ فیلڈ مارشل کبھی ملازمت سے ریٹائر نہیں ہوتا اور تاحیات اپنی مراعات کا مستحق رہتا ہے جو اُسے ملازمت کے دوران حاصل ہوتی ہیں اس لیے تاحیات مراعات حاصل کرنے کے لالچ میں ایوب خان نے اپنے آپ کو فیلڈ مارشل بنالیا ورنہ استحقاق کی بنیاد پر ایوب خان فیلڈ مارشل بننے کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا فیلڈ مارشل کا اعزاز برطانیہ کے فوجی قواعد کے مطابق ان جرنیلوں کو دیا جاتا تھا جو میدانِ جنگ میں بہت بڑی فوج پر کمان کرکے کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران اتحادی افواج کے بہت سے جرنیلوں نے بہت بڑی فوج پر کمان بھی کی اور کئی غیر معمولی کارنامے بھی انجام دیئے۔ مثلاً جنرل آئزن ہاور نے ۶ جون ۱۹۴۴ء کی رات کو جب نارمنڈی (فرانس) پر حملہ کیا جو تاریخ میں "آپریشن اوورلارڈز" کے نام سے مشہور ہے تو بہت بڑی فوج نے اس حملے میں حصّہ لیا تھا۔ اسی طرح جنرل منٹگمری نے افریقہ میں جرمن جرنیل رومیل کی پیش قدمی روک کر ایک بڑا کارنامہ انجام دیا تھا اس کے علاوہ اور بھی بہت سے جرنیلوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے تھے لیکن فیلڈ مارشل کا اعزاز صرف جرنیل منٹگمری کو ہی دیا گیا تھا۔

ایوب خان کا کسی میدانِ جنگ میں ایک بڑی فوج کی کمان کا تو ذکر ہی

کیا اُسے تو شاید کوئی بڑا محاذِ جنگ دیکھنے کا اتفاق بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی فوج کا سب سے بڑا اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یعنی فیلڈ مارشل بن گیا۔ اکبر آلہ آبادی نے فرمایا تھا۔

ص طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقاء ہے
جو مارتے تھے مچھّر اب مارتے ہیں چوہے

ایوّب خان نے ملک میں مارشل لاء کا طاعون پھیلایا اور ترقّی کا سب سے بڑا اعزاز حاصل کر لیا۔ مگر افسوس ہے کہ مرحوم زندگی بھر جرنیلی مراعات سے فائدہ نہ اُٹھا سکے۔ ہوا یہ کہ ۱۹۶۴ء میں ایوّب خان صدارتی انتخابات میں عہدۂ صدارت کا اُمیدوار تھا انتخابی قواعد کے مطابق ایسا شخص جو نفع بخش عہدے پر فائز ہو انتخابات میں حصّہ نہیں لے سکتا لہٰذا ایوّب خان کو اپنا فیلڈ مارشل کا عہدہ چھوڑنا پڑا۔

پسرانِ ایوّب کی فوج سے علیحدگی

ایوّب خان نے اپنے دونوں لڑکوں کیپٹن گوہر ایوّب اور کیپٹن اختر ایوّب کو فوج سے نکال کر کاروبار کی طرف لگا دیا اس طرح اس نے عزّت و ناموس یا شہرت اور وقار کے ایسے منصب کو مسترد کر دیا جو زر و جواہر کے انبار فراہم کرنے سے عاری ہو اس اعتبار سے ایوّب خان ایک ایسا بنیا دکھائی دیتا ہے جو فیلڈ مارشل کی وردی پہنے قارون کے خزانے کی کنجیاں تلاش کر رہا ہو ایسی جستجو کی مزید چند مثالیں بھی مُلاحظہ ہوں۔

(۱) ایوّب خان کا وزیرِ خزانہ

زر اندوزی کی جستجو میں ایوّب خان کی نظر میں مسٹر محمد شعیب پر پڑیں جو عالمی بینک میں پاکستانی ایگزیکٹیو تھا اور امریکہ

کے بدنام ادارے سی۔ آئی۔ اے، سے آپ کا تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ ایوبؔ خان نے مسٹر شعیب کو امریکہ سے بلا کر پاکستان کا وزیر خزانہ بنا دیا۔ مسٹر محمد شعیب بھی بڑے کائیاں تھے انہوں نے وزارت قبول تو کرلی مگر شرط یہ رکھی کہ وہ بدستور عالمی بینک کی ملازمت جاری رکھیں گے اور اپنا سرمایہ امریکہ کے بینکوں میں جمع کرائیں گے ایوبؔ خان نے ان کی یہ دونوں شرائط منظور کرلیں۔

ایوبؔ خان نے مارشل لا کا ایک ضابطہ جاری کیا تھا جس کے مطابق ہر شخص پر لازم تھا کہ وہ اپنا غیر ملکی سرمایہ پاکستان میں منتقل کرے۔ اب صورتحال یہ تھی کہ ایک طرف تو مارشل لا آرڈر کے تحت پاکستانی عوام غیر ملکی بینکوں میں اپنی جمع شدہ رقوم پاکستان لانے پر مجبور تھے اور دوسری طرف پاکستان کا وزیرِ خزانہ ہر مہینے امریکی بینکوں میں ڈالر جمع کرا رہا تھا۔ ایوبؔ خان خاموش تھا کیونکہ اس نے مسٹر محمد شعیب کی معرفت اپنے لڑکوں کو کاروبار دلوا کر اپنے جذبۂ امارت کی تسکین کا سامان فراہم کرنا تھا۔

(۲) گندھارا انڈسٹریز

کیپٹن گوہر ایوبؔ کی منگنی جنرل حبیب اللہ خان کی صاحبزادی سے طے ہو چکی تھی۔

جنرل حبیب اللہ خان پاکستانی فوج کے چیف آف جنرل اسٹاف اور سب سے سینئر جنرل تھے عام گمان یہ تھا کہ جنرل حبیب اللہ خان کو آئندہ پاکستان کا کمانڈر انچیف بنایا جائے گا لیکن ایوبؔ خان نے آپ کو فوج سے ریٹائر کر دیا اور جنرل موسیٰ کو کمانڈر انچیف بنا دیا۔ جنرل حبیب اللہ خان اور گوہر ایوبؔ نے گندھارا موٹرز کے نام سے کاروبار شروع کر دیا وزیرِ خزانہ محمدؔ شعیب نے ان دونوں کو امریکہ کی مشہور فرم جنرل موٹرز کی ایجنسی دلوا دی۔ گندھا

موٹرز جلد ہی گندھارا انڈسٹریز بیں تبدیل ہو گئی اور اس کے مالکان پاکستان کے امیر ترین افراد میں شامل ہو گئے۔ ایوب خان نے دوسرے دو بیٹوں شوکت ایوب اور طاہر ایوب کو فوج کی طرف آنے ہی نہیں دیا اور انہوں نے بھی اپنا نجی کاروبار شروع کر دیا۔

(۳) ابوالقاسم کی جوٹ مل

ایوب خان زر اندوزی کی ہوس میں کچھ اس طرح گرفتار ہوا کہ اسے اپنے قول و فعل اور قانونی ضوابط کا کچھ بھی پاس نہ رہا۔ ایوب خان کے وزیرِ صنعت مسٹر ابوالقاسم خان مشرقی پاکستان میں ایک جوٹ مل لگانا چاہتے تھے اور آپ نے قانونی ضوابط کے مطابق ایک درخواست دی جو منظور کر لی گئی اور آپ کو جوٹ مل لگانے کی اجازت بھی دے دی گئی لیکن جب ایوب خان کو پتہ چلا تو انہوں نے اس منظوری پر حسبِ ذیل نوٹ لکھا:۔

"استحقاق کی بناء پر مسٹر ابوالقاسم یہ کارخانہ لگانے کے جائز طور پر حق دار ہیں لیکن انقلابی کابینہ کے وزیر کی حیثیت سے ان کا یہ اقدام غلط فہمیاں پیدا کر سکتا ہے اس لیے میں درخواست کروں گا کہ مسٹر ابوالقاسم اس منظوری سے کوئی فائدہ نہ اٹھائیں۔"

اس طرح ایوب خان نے ملک کو جوٹ مل کے فوائد سے محروم کر دیا۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مرکزی وزیر کو تو استحقاق ہونے کے باوجود جوٹ مل لگانے سے منع کر دیا گیا لیکن ایوب خان کے بیٹے کو استحقاق کے بغیر ہی سب سے بڑی صنعت قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ گندھارا انڈسٹریز کا مسئلہ قومی اسمبلی میں بھی پیش ہوا اور اس پر بحث و مباحثہ بھی ہوا مگر سب بیکار۔ ایوب خان کے ایک وزیر نے گوہر ایوب کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا

کہ اگر صدرِ مملکت کا بیٹا گندھارا انڈسٹریز کا حقدار نہیں مانا جاتا تو کیا اسے یتیم خانے میں داخل کر دیا جائے۔؟

(۴) اسلحہ کا کمیشن پنجاب کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس راؤ عبدالرشید نے اپنی کتاب "جو میں نے دیکھا" میں حسب ذیل واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔

"اس کے بعد جب میں انگلینڈ میں تعنیات ہوا اس وقت ایوب خان اپنے پورے جلال میں تھے تاشقند کا سلسلہ شروع ہوا وہ بھی نکل گیا۔ پھر وہ بیمار ہو گئے بیماری کے بعد دورے پر انگلینڈ آئے۔ کچھ چیک اپ کا بھی پروگرام تھا۔ اس وقت گوہر ایوب بھی ان کے ساتھ تھے۔ الطاف گوہر بھی ایوب خان کے ساتھ ہی ٹھہرے تھے۔ لندن سے باہر کنٹری سائیڈ پر ایک جگہ تھی وہاں انتظام کیا گیا تھا وہاں اسلحے کا ایک بڑا مشہور بین الاقوامی قسم کا ڈیلر تھا اس کے وہاں اپنے ہیلی کاپٹر وغیرہ بھی ہیں، اپنے جہاز بھی ہیں اس کی آمد و رفت وہاں جاری تھی۔ ایوب خان کی اس سے کوئی گفت و شنید چل رہی تھی۔ کچھ پاکستان کے جو ٹینک وغیرہ تھے ان کے متعلق بھی سلسلہ چل رہا تھا اس سارے سلسلے میں گوہر ایوب پیش پیش تھے۔ کوئی کمیشن وغیرہ کا چکر تھا۔ تو اس سے انسان کو بڑی نفرت ہوتی تھی کہ اس شخص کو ملک میں سب سے بڑا عہدہ حاصل ہے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے لیکن اس کو بیماری کی حالت میں بھی یہ خیال ہے کہ اس سودے میں اس کے بیٹے کو کیا مل سکتا ہے۔؟"

مندرجہ بالا واقعات سے بالکل عیاں ہے کہ ایوب خان دولت جمع کرنے کے لیے کہاں تک جانے کو تیار تھا۔

پروگریسو پیپرز لمیٹڈ پر قبضہ

تحریر و تقریر کی آزادی دنیا کے تمام مہذب ممالک میں بنیادی حق کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے اخبارات اور رسائل اظہارِ خیال کا مؤثر ذریعہ ہوتے ہیں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ مارشل لاء صرف فاتح جرنیل کی خواہش کا اظہار ہوتا ہے اور کسی قانونی حق یا دستوری نظام کو تسلیم نہیں کرتا۔ محمد ایوب خان نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد اظہارِ خیال کی آزادی کو قطعی طور پر سلب کر لیا تھا اخبارات پر سینسر شپ عائد کر دی گئی تھی اور کسی بھی شریف شہری کو کسی بھی قومی مسئلے پر اظہارِ خیال کا حق حاصل نہیں تھا پروگریسو پیپرز لمیٹڈ میاں افتخار الدین اور ان کے لڑکے عارف افتخار نے قائم کیا تھا یہ ایک نشریاتی ادارہ تھا اور اس کی نگرانی میں لاہور سے روزنامہ پاکستان ٹائمز (انگریزی) روزنامہ امروز (اردو) اور ماہنامہ لیل و نہار شائع ہوتے تھے۔ میاں افتخار الدین پرانے سیاست کار تھے۔ آپ پہلے کانگریس میں شامل ہوئے پھر مسلم لیگ میں آئے اور قیام پاکستان کے بعد "آزاد پاکستان پارٹی" کے نام سے اپنی علیحدہ سیاسی جماعت قائم کر لی تھی۔ آپ پنجاب کی مسلم لیگ وزارت میں مہاجرین اور بحالیات کے وزیر بھی رہ چکے تھے۔ آپ نے اپنی وزارت کے دوران مہاجرین کی آبادکاری کے لیے ایک بڑا انقلابی منصوبہ پیش کیا تھا آپ کی تجویز یہ تھی کہ تمام بڑی زمینداریاں توڑ دی جائیں اور حاصل شدہ زمینیں مہاجرین کو الاٹ کر دی جائیں۔

میاں صاحب ذہنی طور پر کچھ ترقی پسند واقع ہوئے تھے۔ اس لیے ملکی مسائل کو اسی عینک سے دیکھنے کے عادی تھے نیز سامراجی پالیسیوں پر تنقید کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ایوب خان کی نظروں میں ایک آزاد، خود مختار اور ترقی پسند نشریاتی ادارہ ہرگز قابلِ برداشت نہیں تھا چنانچہ ۱۸ اپریل ۱۹۵۹ء

کو ایوبؔ خان نے اپنے وزیرِ داخلہ جنرل کے. ایم. شیخ کے توسّط سے اس ادارے پر جبراً قبضہ کر لیا اور ایک آرڈیننس کے ذریعے میاں افتخار الدین کو عدالتی چارہ جوئی سے محروم کر دیا. کمپنی کے بورڈز آف ڈائریکٹرز کو توڑ ڈالا گیا اور میاں خاندان کے تمام حصص بھی ضبط کر لیے گئے. حکومت نے مسٹر محمّد سرفراز کو اس ادارے کا ناظمِ اعلیٰ مقرّر کر دیا. میاں افتخار الدین کے خلاف الزام یہ تھا کہ اُن کو غیر ممالک سے مالی امداد ملتی تھی جسے وہ لندن کے بینک میں جمع کرا دیتے تھے. ایوبؔ خان نے کمپنی کو نیلام کر دیا اور ۴۶ لاکھ روپے کی آخری بولی سیٹھ داؤد کے نام پر ختم ہوئی اس طرح ایک صنعتکار صحافت کا اجارہ دار بھی بن گیا. اس کے بعد کمپنی کو کئی افراد کے ہاتھوں بیچا گیا اور بالآخر اُسے "نیشنل پریس ٹرسٹ" کے سپرد کر دیا گیا. یہ نیشنل پریس ٹرسٹ ایوبؔ خان کی پیدا کردہ بدعت ہے جو آج تک پاکستان کی آزادیٔ صحافت کے راستے کا سب سے بھاری پتھر ہے. اس ٹرسٹ میں پاکستان ٹائمز، اور امروز کے علاوہ دیگر کئی اخبارات بھی شامل ہو گئے. اِن اخبارات کا واحد مقصد صرف یہ ہے کہ حکومت کی خوشامد اور تعریف و توصیف میں سبقت حاصل کی جائے اس طرح ایوبؔ خان نے نہ صرف ایک ترّقی پسند ادارے کو تباہ و برباد کر دیا بلکہ نیشنل پریس ٹرسٹ قائم کر کے آزادیٔ صحافت کے لیے حقیقی خطرہ بھی پیدا کر دیا.

سیاستدانوں کا احتساب

ایک آمر کی حیثیت سے ایوبؔ خان قدرتی طور پر سیاستدانوں کو اپنا حریف سمجھتا تھا اس لیے اپنی آمریت کو مستحکم کرنے اور سیاستدانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ایوبؔ خان نے سیاستدانوں کے خلاف باقاعدہ منصوبہ بندی شروع کر دی ایک آمر کو صرف خوشامدیوں کی ضرورت ہوتی ہے. جو ہر وقت اُس

کی عظمت کے گیت گاتے رہیں ایوبؔ خان نے بھی اپنے ارد گرد ایسے ہی کئی افراد کو جمع کر رکھا تھا۔ قدرت اللہ شہاب نے اپنی کتاب "شہاب نامہ" میں ایوبؔ خان کے خوشامدیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک واقعہ اس طرح بیان کیا ہے:۔

"ایک روز صدر ایوبؔ خان نے حسبِ معمول اپنے "سیاسی فلسفہ" پر ایک طولانی تقریر کی تو ایک سینئر افسر وجد کی کیفیت میں آکر جھومتے ہوئے اُٹھے اور سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر عقیدت سے بھرآئی ہوئی آواز میں بولے جناب "آج تو آپ کے افکارِ عالیہ میں پیغمبری کی شان جھلک رہی تھی"۔ یہ تحسین وصول کرنے کے لیے صدر ایوبؔ خان نے بڑی تواضع سے اپنی گردن جھکائی۔"

اپنی منصوبہ بندی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایوبؔ خان نے دو قانون نافذ کیے یعنی 'پوڈو' اور 'ایبڈو'۔ ان قوانین سے ایوبؔ خان کا مقصد صرف سیاستدانوں کے خلاف ہی کاروائی کرنا مقصود نہ تھا بلکہ وہ سیاست کے میدان میں تمام سرگرمِ عمل عناصر کو کچل دینا چاہتا تھا اسی لیے 'ایبڈو' کو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے نافذ العمل سمجھا گیا تاکہ ایوبؔ خان تمام پرانے سیاستدانوں کو بھی اس پھندے میں جکڑ سکے۔ ایبڈو کے تحت جرم ثابت ہونے پر ملزم کو چھ سال تک سیاست سے علیحدہ رہنے کی سزا ملتی تھی۔ ہاں اگر کوئی ملزم اپنی مرضی سے رضا کارانہ طور پر چھ سال کے لیے سیاست سے علیحدہ ہونے کا اعلان کر دے تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی ختم ہو سکتی تھی جبکہ 'پوڈو' کے تحت فردِ جرم ثابت ہونے پر پندرہ سال تک سیاسی عہدوں پر فائز ہونے سے نااہلیت کی سزا ملتی تھی۔

قومی اور صوبائی سطح کے ۹۸ ممتاز سیاستدانوں کے خلاف ایبڈو کے

تحت عدالتی کاروائی شروع کی گئی ان میں سے ستّر افراد نے رضا کارانہ طور پر سیاست سے علیحدگی اختیار کرلی ایسے سیاستدانوں میں میاں ممتاز محمّد خان دولتانہ محمّد ایوّب کھوڑو اور خان عبدالقیوم خان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اٹھائیس سیاستدانوں نے مقدمہ لڑا۔ جن میں سے بائیس مقدمات ہار گئے اور صرف چھ سیاستدان بری کئے گئے۔ ان بڑے سیاستدانوں کے علاوہ پورے ملک میں تقریباً دو ہزار سے زائد سیاسی کارکن بھی ایبڈو کا شکار ہوئے یہ حضرات ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک کسی اسمبلی، میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ یا دیگر کسی ادارے کے رکن رہ چکے تھے۔

یہ امر یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا کہ ایبڈو کے تحت جن سیاستدانوں کے خلاف کاروائی کی گئی ان کے خلاف الزامات کی نوعیت نہایت کمزور اور مضحکہ خیز تھی ان کی وضاحت کے لیے چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) سرکاری ٹیلی فون اور اسٹاف کار کا بیجا استعمال۔

(۲) پرائیویٹ سیکریٹری کے لیے اس کے استحقاق سے زیادہ مراعات۔

(۳) اپنے انتخابی حلقوں میں ترجیحی بنیادوں پر سڑکوں، اسکولوں اور اسپتالوں کی تعمیر۔

(۴) انتخابات کے وقت دھاندلی کے الزامات وغیرہ وغیرہ۔

یہ وہ بودے قسم کے الزامات ہیں جن کے تحت یا تو سیاستدان از خود سیاست سے ریٹائر ہوگئے یا انہیں نااہل قرار دے دیا گیا ان الزامات کی کسی بھی طرح کوئی وقعت نہیں تھی لیکن الزمات ثابت کرنے کا سب سے بڑا عنصر ایوّب خان کا مارشل لاء تھا جس کا مقابلہ کرنا سیاستدانوں کے بس کی بات نہ تھی۔

ایوّب خان نے محض اپنی انا کی تسکین اور آمریت کو محفوظ بنانے کے

لیے سیاستدانوں کو بدنام اور رُسوا کر کے ملک کے سیاسی اداروں کی ساکھ کو تباہ کر دیا۔ قوم اس تباہی کے اثرات سے ابھی تک جانبر نہیں ہو سکی۔

کنونشن مسلم لیگ

ایوّب خان روزِ اوّل سے ہی سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کے خلاف منافرت پھیلانے میں سرگرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس نے بار بار یہ دعویٰ بھی کیا کہ وہ نہ کوئی سیاسی جماعت بنائے گا اور نہ ہی کسی سیاسی جماعت میں شامل ہوگا۔ یعنی وہ اپنے آپ کو سیاست سے بلند و بالا سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بنیادی جمہوریت کا نظام اس کے سیاسی فلسفہ کی مکمل طور پر ترجمانی کرتا تھا اس لیے یہی نظام اس کے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے کافی تھا لیکن جون ۱۹۶۲ء میں آئین نافذ کرنے کے بعد ایوّب خان نے سیاسی جماعتوں کا قانون نافذ کر دیا اور اس طرح تمام سیاسی جماعتیں از خود بحال ہو گئیں۔ ایوّب خان نے محسوس کیا کہ اس کا سارا انقلابی نظام ہوا میں معلّق ہے۔ اور اُسے مستحکم کرنے کے لیے عوام کی تائید اور حمایت کی ضرورت ہے چنانچہ اس نے فوراً سیاستدانوں سے رابطے پیدا کرنے شروع کر دیئے اِن سیاستدانوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہیں ایبڈو کے تحت چھ سال کے لیے نااہل قرار دیا جا چکا تھا۔ ایوّب خان کے اشارے پر قومی اسمبلی میں ایک بِل پیش کیا گیا جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ایبڈو کے تحت عائد کردہ پابندیاں ختم کر دی جائیں اور ایبڈو زدہ سیاستدانوں کو سیاست میں حصّہ لینے کی اجازت دے دی جائے لیکن اسمبلی میں آنے والے نئے لوگوں کو اس میں شدید خطرات نظر آئے چنانچہ انہوں نے یکجا ہو کر اس بِل کی مخالفت کی اور اُسے مسترد کرا دیا۔

اب ایوّب خان نے اپنی سیاسی جماعت قائم کرنے کے امکانات کا جائزہ

لیا لیکن اس میں کامیابی کے امکانات مشکوک پاکر اس خیال کو رُد کر دیا اور مسلم لیگ پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس مقصد کیلئے مسٹر اے، کے، ایم فضل القادر چوہدری کو منتخب کیا گیا۔ ایوبّ خان نے صنعتکاروں اور سرمایہ داروں سے بھاری رقوم وصول کر کے مسٹر چوہدری کے حوالے کیں اور انہیں ڈھاکہ بھیج دیا۔ مولانا اکرم خان نے ڈھاکہ میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کر رکھا تھا۔ مسٹر فضل القادر چوہدری کی کوششوں کے باوجود مسلم لیگی سیاستدانوں نے مسٹر ایوبّ خان کو اپنی جماعت میں شامل کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر مسٹر چوہدری نے مولانا اکرم خان سے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ملتوی کرا دیا اور مسٹر ذوالفقار علی بھٹوؔ اور محمد علی بوگرہ کو ساتھ ملا کر کراچی میں مسلم لیگ کا کنونشن منعقد کرنے کا اعلان کر دیا۔ نیز مولانا اکرم خان اور راجہ صاحب محمود آباد کو بالترتیب صدارت کرنے کی پیشکش کی گئی جسے دونوں نے مسترد کر دیا آخر کار چوہدری خلیق الزّماں کو کنونشن کی صدارت کرنے پر راضی کر لیا گیا۔ کنونشن میں چوہدری خلیق الزّماں کو صدر اور جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ کو سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ مئی ۱۹۶۳ء میں ایوانِ صدر راولپنڈی میں گورنر کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مرکزی کابینہ کے علاوہ بعض صوبائی وزراء کو بھی شامل کیا گیا۔ چوہدری خلیق الزّماں خصوصی دعوت پر شریکِ محفل ہوئے۔ کافی غور و خوض کے بعد ایوبّ خان نے مسلم لیگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے مشرقی اور مغربی پاکستان کی طرف سے دو علیحدہ علیحدہ فارموں پر دستخط کر کے دوہری رُکنیت قبول کر لی۔

پانچ سال تک سیاسی جماعتوں اور سیاستدانوں کی تکذیب کرنے والا آمر آخر کار ایک سیاسی جماعت کی دہلیز پر سجدہ ریز ہو ہی گیا۔

ع پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

ایوب خان اور بھارت

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ ایوب خان کا اقتدار امریکہ کا رہینِ منت تھا اور اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ امریکہ کو ناراض کر کے اقتدار پر قابض رہنا دشوار گزار مرحلہ ہے۔ اس لیے ایوب خان کی اوّلین ترجیح امریکہ کی خوشنودی کا حصول تھا۔ امریکہ بھارت کو پاکستان پر ترجیح دیتا تھا لیکن بھارت اور پاکستان کے درمیان کشمیر ایک ایسا تنازعہ تھا جو دونوں ملکوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی راہ میں حائل تھا۔ اس کے باوجود امریکہ مسلسل اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مسئلۂ کشمیر پر کوئی مفاہمت ہو جائے تاکہ امریکہ ہندوستان اور پاکستان کو دنیا کے سب سے بڑے کمیونسٹ ملک چین کے خلاف استعمال کر سکے۔ چین ایک طاقتور ملک کی حیثیت سے ایک طرف تو پوری کمیونسٹ دنیا کے لیے کامیاب انقلاب کی علامت بن گیا تھا جبکہ دوسری طرف ایشیا کی قیادت از خود چین کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ یہی وہ عناصر تھے جن کی وجہ سے امریکہ کو ویتنام میں بدترین شکست کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ امریکہ کی کوشش یہ تھی کہ چین کے مقابلے میں ایشیا کی رہنمائی کا تاج بھارت کو پہنایا جائے لیکن اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ پاکستان کی طرف سے تھی۔ امریکہ نے صدر ایوب خان کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ بھارت کے ساتھ دوستی اور تعاون کی کوششیں تیز کر دے۔ چنانچہ امریکی اشارے پر ۱۹۵۹ء میں ایوب خان نے بھارت کے ساتھ مشترکہ دفاع قائم کرنے کی تجویز پیش کر دی۔ لیکن بھارتی وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ یہ دفاع کس کے خلاف ہوگا۔ بھارت نے امریکی منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے پورے ملک میں "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے

لگوانے شروع کر دیئے۔

۲۹ ستمبر ۱۹۵۹ء کو ایوب خان کراچی سے ڈھاکہ روانہ ہوا۔ پروگرام میں پالم ایئرپورٹ دہلی پر پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات بھی شامل تھی۔ ایوب خان نے ایئرپورٹ پر پنڈت نہرو سے ملاقات کی۔ اس دوران ایئرپورٹ پر ایک جلوس نے مظاہرہ کیا۔ جو" ہندو چینی بھائی بھائی" کے نعرے لگا رہا تھا اور پنڈت جواہر لال نہرو جلوس کے سامنے ہاتھ ہلا ہلا کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ اس طرح پنڈت جواہر لال نہرو نے ایوب خان کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ بھارت کا چین کے ساتھ کوئی تنازعہ نہیں ہے اور یہ کہ مشترکہ دفاع کی تجویز عملاً غیر مؤثر ہے۔ تاہم پنڈت جواہر لال نہرو نے ایوب خان کے سامنے ایک متبادل تجویز پیش کی جس میں یہ کہا گیا تھا کہ بھارت اور پاکستان آپس میں جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیں۔ ایوب خان نے اس تجویز پر منفی ردِعمل کا اظہار کیا اور اس طرح ایوب خان کی طرف سے بھارت کے ساتھ مشترکہ دفاع قائم کرنے کی تمام تر کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔

بھارت چین جنگ

ہر چند کہ بھارتی وزیرِ اعظم ملک بھر میں "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے لگوا رہے تھے لیکن چین کے ساتھ ان کی ایشیائی قیادت کے مسئلہ پر رقابت اور سرحدی تنازعات ایسے عوامل تھے جو اس دوستی کی راہ میں بُری طرح حائل تھے۔ آخر کار اکتوبر ۱۹۶۲ء میں دونوں ممالک کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ گئی۔ چینی فوج نے بھارت کو لدّاخ اور نیفا سے نکال باہر کیا۔ اور دونوں

محاذوں پر بھارتی فوج کو شرمناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ چین نے ایوب خان کو یقین دلایا کہ اگر وہ اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر کشمیر میں کوئی کاروائی کرنا چاہتا ہے تو اس کو چین کی طرف سے مکمل تعاون حاصل رہے گا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے اخبارات اور بعض سیاسی قائدین نے بھی اس امر پر زور دیا کہ پاکستان کو کشمیر کی آزادی کے لیے فوری کاروائی کرنا چاہیئے۔ کشمیر کی آزادی کے لیے اس سے بہتر موقع پاکستان کو کبھی میسّر نہیں آیا تھا لیکن ایوّب خان نے اس سنہری موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ بھارتی فوج چین کے ساتھ جنگ میں مصروف تھی اور اس کی پوری توجّہ نیفا اور لدّاخ کے محاذوں پر اپنا دفاع کرنے پر مرکوز تھیں۔ چینی فوج کو بھارتی فوج پر مکمل برتری حاصل تھی۔ اس لیے بھارتی فوج میں ہرگز یہ صلاحیّت موجود نہیں تھی کہ وہ چین اور پاکستان کیخلاف بیک وقت مختلف محاذوں پر کوئی خاطرخواہ کامیابی حاصل کر سکے۔ چین پاکستان کا مخلص دوست تھا اور اس نے یہ پیشکش اس ذمّہ داری کو مدّنظر رکھتے ہوئے کی تھی کہ کشمیر کو ہندوستان کے قبضے سے آزاد کرایا جائے اور اس کا الحاق پاکستان کے ساتھ کیا جائے اگرچہ ایوّب خان کے دل میں اس ملک کے لیے ہمدردی کا کچھ بھی شائبہ ہوتا یا اس کو قوم کے مفادات ذرّہ برابر بھی عزیز ہوتے تو وہ چین کی پیشکش کو ہرگز مسترد کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ لیکن ایوّب خان کی توجّہ امریکی اشیرباد پر مرکوز تھی۔ بھلا امریکہ اُسے بھارت جیسے سامراجی ملک کے خلاف جارحیت کی اجازت کیسے دے سکتا تھا۔ امریکی صدر جان ایف کینیڈی نے ایوّب خان پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ ہندوستان کے حق میں بیان جاری کرے۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۲ء کو اعلیٰ سطح کا ایک وفد جو برطانیہ کے کامن ویلتھ سیکرٹری

مسٹر ڈنکن سینڈز اور امریکہ کے اسسٹنٹ سیکریٹری مسٹر ایورل ہیری مین پر مشتمل تھا پاکستان پہنچ گیا اور آتے ہی ایک تحریری بیان ایوّب خان کے حوالے کیا۔ اور ایوّب خان کو اس بیان پر دستخط کرنے کی ہدایت کی۔ ایوّب خان نے بلا حیل و حجّت اس بیان پر دستخط کر دیئے۔ بیان یہ تھا کہ :۔

" پاکستان کے صدر اور بھارت کے وزیر اعظم اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ کشمیر سمیت تمام متنازعہ مسائل پر نئے سرے سے بات چیت شروع کی جائے تاکہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے ساتھ پُرامن ماحول میں رہ سکیں۔ لہٰذا انہوں نے طے کیا ہے کہ وہ جلد ان مسائل پر تبادلۂ خیال شروع کر دیں۔ ابتداً یہ گفتگو وزارتی سطح پر شروع ہو گی اور مناسب وقت آنے پر صدر ایوّب خان اور بھارت کے وزیرِ اعظم کے درمیان براہِ راست بات چیت ہو گی ۔"

صدر ایوّب سے دستخط کرانے کے بعد مسٹر ڈنکن سینڈز یہ دستاویز لے کر دہلی روانہ ہو گئے اور مسٹر ایورل ہیری مین صدر ایوّب کے ساتھ پریذیڈنٹ ہاؤس میں مقیم رہے۔ شام کو سوا سات بجے مسٹر ڈنکن سینڈز نے مسٹر ایورل کو اطلاع دی کہ پنڈت نہرو نے بیان پر دستخط کر دیئے ہیں۔ یہ سنتے ہی مسٹر ایورل نے نہایت گرمجوشی سے اُٹھ کر صدر ایوّب سے ہاتھ ملایا اور اسے اس کامیابی پر مبارکباد دی۔ شیمپئن کا دور چل رہا تھا مسٹر ہیری مین نے ایوّب خان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :۔

" مسٹر پریذیڈنٹ آج کا دن ایک تاریخ ساز دن ہے اس سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے آپ کی وزارتِ خارجہ کو اب ایسے خطوط پر چلنا پڑے گا کہ جس سے امریکہ اور ہندوستان دونوں کے ساتھ یکساں صاف گوئی سے بات چیت کی جا سکے ۔"

ایوّب خان نے حیرت سے پوچھا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

مسٹر ہیری مین نے کہا:۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اپنا فارن سیکریٹری تبدیل کر دینا چاہیئے کم از کم ہمارا سفارت خانہ ان کے ساتھ آزادانہ گفتگو کرنے میں شدید ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے۔"

ان دنوں مسٹر ایس، کے دہلوی پاکستان کی وزارتِ خارجہ کے سیکریٹری تھے ایوّب خان نے مسٹر ایورل ہیری مین کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مسٹر دہلوی کو اس منصب سے ہٹا دیا اور انہیں قاہرہ میں پاکستان کا سفیر بنا کر ملک سے باہر بھیج دیا۔ مقامِ افسوس ہے کہ ایک آزاد اور خود مختار ملک کا سربراہ ایک غیر ملکی سفارتکار سے یہ بھی پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا کہ آخر ہمارے فارن سیکریٹری سے ایسا کونسا گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ جس کی وجہ سے امریکہ کا سفارتی عملہ اس کے ساتھ بات چیت کرنے میں بھی تامّل محسوس کرتا ہے۔

بھارت اور امریکی امداد

بھارت کا نظامِ سیاست جمہوری تھا اور بھارتی حکومت محبِّ وطن سیاستدانوں پر مشتمل تھی اس لیے چین سے شکست کا بھارت میں شدید ردِّ عمل ہوا ایک طرف تو حکومت کو عوام کے سامنے اپنی شکست کا جواب دینا تھا اور دوسری طرف اُسے اپنی دفاعی پالیسی کے افسوسناک نتائج کا شدید احساس بھی تھا۔ بھارتی حکومت نے ان حالات کا بھرپور فائدہ اٹھایا اس نے پوری جرأت اور دلیری کے ساتھ اپنی شکست کا دل کھول کر پروپیگنڈہ کیا اور اس طرح نہ صرف پوری قوم کو اپنے ساتھ ملا لیا بلکہ بین الاقوامی سطح پر امریکہ، برطانیہ اور پورے مغربی بلاک کی مکمل ہمدردیاں بھی حاصل کر لیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکہ اور

برطانیہ نے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیئے اور بھارت ان ممالک سے بے پناہ فوجی اور مالی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پاکستان نے اس امداد کے خلاف احتجاج کیا اور مغربی بلاک کو یہ حقیقت سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ بھارت کو دی جانے والی تمام فوجی امداد بالآخر پاکستان کے خلاف، ہی استعمال ہو گی۔ مگر امریکہ نے پاکستان کے اس مؤقف کو ہرگز درخور اعتنا نہ سمجھا۔ جس کے نتیجے میں نہ صرف بھارت نے اپنے تمام جنگی نقصانات کی تلافی کر لی بلکہ دفاعی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو اور زیادہ مضبوط بنا لیا۔

صدارتی انتخابات

صدر ایوب کے عہدۂ صدارت کی مدت ۱۹۶۴ء میں ختم ہو رہی تھی آئین کی رُو سے صدر کے انتخاب سے پہلے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کرانے ضروری تھے۔ لیکن صدر ایوب کی نیت بدل گئی ان کا خیال یہ تھا کہ وہ پہلے اپنے آپ کو صدر منتخب کرا لیں گے تو اس کے نتیجے میں ان کی جماعت کنونیشن مسلم لیگ کو صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے انتخابات میں مکمل کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آئین میں ترمیم پیش کی گئی۔ لیکن ترمیم منظور کرنے کے لیے ووٹوں کی مطلوبہ تعداد میسّر نہ ہو سکی۔ اس پر حکومت نے دھونس، دھاندلی، لالچ اور فریب سے حزبِ اختلاف کے آٹھ اراکین کو توڑ لیا اور اس طرح آئین کا ترمیمی بل منظور ہو گیا۔ ۱۹۶۲ء میں ایوب خان نے پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ نافذ کیا تھا۔ اس ایکٹ میں یہ پابندی عائد کی گئی تھی کہ اگر کسی جماعت کا کوئی ممبر اپنی پارٹی چھوڑے گا تو اُسے قومی یا صوبائی اسمبلی کی رُکنیت سے بھی محروم ہونا پڑے گا۔ مگر ان آٹھ ممبران کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی بلکہ ان کو انعام و اکرام سے

بھی نوازا گیا۔

صدر ایوب نے انتخابات میں اپنی اور اپنی جماعت کی کامیابی کو یقینی بنانے کے لیے آئین میں مزید دو ترامیم منظور کرالیں۔ ایک ترمیم کا تعلق بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات سے تھا۔ اس ترمیم کی رُو سے دیہات کی سطح پر نمبرداروں، انعام داروں، سفید پوشوں اور ذیلداروں کو بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات میں حصّہ لینے کا اہل بنا دیا گیا۔ دوسری ترمیم کا تعلق سرکاری ملازموں کی معیادِ ملازمت اور سبکدوشی کے قواعد سے تھا۔ اس ترمیم کی رُو سے حکومت نے سرکاری ملازموں پر اپنی گرفت مضبوط کرلی مقصد یہ تھا کہ سرکاری ملازم اپنی ملازمت بچانے کے لیے حکومت کی ہر جائز و ناجائز کاروائی میں برابر کے شریک رہیں۔ اس طرح ایوب خان نے انتخابات کا آغاز ہی دھاندلی اور بددیانتی سے کیا تھا۔

حزبِ اختلاف کا کردار

ایوب خان کو یقین تھا کہ حزبِ اختلاف ان کے خلاف کوئی مضبوط امیدوار کھڑا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ حزبِ اختلاف کے پاس دو مضبوط امیدوار تھے۔ ایک محترمہ مس فاطمہ جناح اور دوسرے جنرل اعظم خان۔ حزبِ اختلاف کی تمام بڑی جماعتوں نے آپس میں اتحاد کر کے کمبائنڈ اپوزیشن پارٹیز (سی، او، پی) کے پلیٹ فارم سے ایوب خان کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی امیدوار بنا کر ایوب خان کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ایوب خان کی جماعت اور اس کے حامی مُلّاؤں اور پیروں نے انتخابی مہم کے دوران زیادہ زور اس مسئلے پر صرف کیا کہ اسلام میں عورت اسلامی مملکت کی سربراہ نہیں بن سکتی۔ اس کے برعکس امیرِ جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور دوسرے

علماء نے اس دعوے کی تردید کی اور اعلان کیا کہ عورت کا انتخاب قطعی طور پر ممنوع نہیں ہے۔ اور بعض مخصوص حالات میں عورت کو سربراہِ مملکت بنایا جا سکتا ہے۔

انتخابی مہم کے دوران عوام نے بھرپور انداز میں محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا اور ایوب خان کی شدید مخالفت کی تھی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ انتخابی ادارہ صرف بنیادی جمہوریتوں کے اسی ہزار ارکان پر مشتمل تھا۔ جو حکومت اور ایوب خان کے زیرِ اثر تھے۔ پیر علی محمد راشدی نے اپنی کتاب "رُوداد چمن" میں بنیادی جمہوریتوں کے کردار پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

"ایوبی دور کی خاص عنایت یہ تھی کہ انہوں نے بی ڈی (بنیادی جمہوریتوں) کا ڈھکوسلہ کھڑا کر کے رشوت خوروں کا ایک نیا طبقہ پیدا کیا جو بدقسمتی سے عوام کے نچلے درجے کے لوگوں پر مشتمل تھا اور اس طبقے کی اس لیے حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ رشوت خوری عوام کے اپنے گھروں تک پہنچ جائے اور اس قدر عام ہو جائے کہ بدنامی کا سارا بوجھ محض نوکر شاہی کو نہ اٹھانا پڑے۔"

یہ تھا وہ انتخابی ادارہ جسے صدرِ مملکت اور قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کا انتخاب کرنا تھا۔ ۳ جنوری ۱۹۶۵ء کو انتخابی نتائج کا اعلان کیا گیا۔ ایوب خان کے حق میں ۴۹۶۴۷ ووٹ ڈالے گئے جبکہ مس فاطمہ جناح کے حق میں ۲۸۳۴۵ ووٹ ڈالے جانے کا اعلان کیا گیا۔ اس طرح ایوب خان ۲۱۳۰۲ ووٹوں کی اکثریت سے صدارتی انتخابات جیت گئے۔

ہرچند کہ ایوب خان صدارتی انتخابات جیت چکے تھے لیکن انتخابی سرگرمیوں کے دوران ان کو اپنے صحیح مقام کا احساس ہو گیا تھا انھیں پتہ چل گیا تھا کہ عوام کی نظروں میں ان کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اور ان کی حکومت محض ہوا

میں معلق ہے۔ ۵ جنوری ۱۹۶۵ء کو کراچی میں انتخابات کی فتح کا جشن منایا گیا اس جشن کی قیادت کیپٹن گوہر ایوب کو سونپی گئی۔ غالباً ایوب خان اپنے فرزند گوہر ایوب کو سیاسی میدان میں آگے بڑھانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ لیکن گوہر ایوب نے نہایت نااہلی کا ثبوت دیا اور ایوب خان کو اپنی منصوبہ بندی پر نظرِ ثانی کرنا پڑی۔ ۵ جنوری کو جشنِ فتح کا جلوس جب لیاقت آباد سے گزرا تو وہاں پر مہاجروں کے ساتھ شرکائے جلوس کی جھڑپ ہو گئی جس میں کافی جانی نقصان بھی ہوا۔ کئی آدمی مارے گئے املاک اور گاڑیوں کو جلایا گیا اور اسطرح جشنِ فتح کا یہ جلوس ماتمی جلوس میں تبدیل ہو گیا۔ گوہر ایوب نے اس ناکامی کا داغ دھونے کے لیے ایک دوسری کوشش کی۔ رمضان المبارک کے پہلے جمعہ کو گوہر ایوب میمن مسجد کراچی میں تشریف لائے اور عوام سے خطاب کرنے کی کوشش کی۔ لوگوں نے گوہر ایوب کی تقریر سننے سے انکار کر دیا۔ مسجد میں گوہر ایوب کے حامیوں اور مخالفوں میں ایک شدید جھڑپ ہو گئی۔ پولیس گوہر ایوب کو میمن مسجد سے بحفاظت نکال کر لے گئی اور گوہر ایوب عوام سے خطاب نہ کر سکے۔ ایوب خان عوام میں اپنی ساکھ بہتر بنانے کے لیے مسلسل کوششیں کر رہے تھے کہ قدرت نے انھیں ایک اور اچھا موقع فراہم کر دیا۔

رَن آف کچھ کا معرکہ

اپریل ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان رَن کچھ کے مسئلے پر جنگ چھڑ گئی۔ جس کے نتیجے میں بھارت کو کافی جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ رَن آف کچھ ۸۴۰۰ مربع میل کے رقبہ پر مشتمل ہے۔ یہ علاقہ دونوں ملکوں کے درمیان ۱۹۴۷ء سے متنازعہ چلا آ رہا تھا اپریل ۱۹۶۵ء میں بھارت نے الزام عائد کیا تھا کہ پاکستان رَن آف کچھ کو آڑ بنا کر گجرات میں تیل کے ذخائر پر قبضہ

کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ بھارتی فوج نے اس علاقے پر جبراً کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کی۔ جس پر پاکستان نے شدید مزاحمت کا مظاہرہ کیا اور بھارتی افواج کو مکمل طور پر شکستِ فاش سے دوچار ہونا پڑا۔ پاکستان کی اس کامیابی نے ایوب خان کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ایک مضبوط سیاسی اور فوجی قائد ہے۔ دوسری طرف عوام کی نظروں میں بھی ایوب خان کا وقار بلند ہو گیا۔ اس تنازعہ کو طے کرنے کے لیے برطانیہ نے اپنی خدمات پیش کیں اور بالآخر بین الاقوامی ٹریبونل کے فیصلے کے نتیجے میں پاکستان کو ۳۵۰ مربع میل کا علاقہ حاصل ہو گیا۔

جنگِ کشمیر

رن آف کچھ میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایوب خان نے مقبوضہ کشمیر میں فوجی کاروائی کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی شروع کر دی۔ اس مقصد کے لیے مقبوضہ کشمیر میں مسلح رضاکار بھیجے گئے۔ آٹھ اگست ۱۹۶۵ء کو ایک پُراسرار ریڈیو "صدائے کشمیر" نے اپنی نشریات کا آغاز کر دیا۔ اس ریڈیو کی نشریات کے مطابق مقبوضہ کشمیر کے عوام نے انقلابی کونسل قائم کر کے بھارت کے ساتھ کئے گئے تمام معاہدے ختم کر دیئے اور بھارت کے خلاف جنگِ آزادی کا اعلان کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ ریڈیو مسلسل مقبوضہ کشمیر کے اندر مجاہدین کی کامیابیوں کی خبریں نشر کرتا رہا۔ جبکہ بھارت کے وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری نے الزام عائد کیا کہ پاکستان مقبوضہ کشمیر میں بدامنی پھیلا رہا ہے اور یہ کہ بھارت پاکستان کے خلاف اپنی مرضی کا محاذ منتخب کرے گا۔ ایوب خان کو یقین تھا کہ جنگ مقبوضہ کشمیر کی حدود تک محدود رہے گی اور بھارت کبھی بھی بین الاقوامی سرحد عبور کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن ایوب خان کی توقعات کے بالکل برخلاف بھارت نے

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو تین اطراف سے لاہور پر حملہ کر دیا۔ بھارتی جرنیلوں کا خیال تھا کہ وہ بڑی آسانی کے ساتھ لاہور پر قبضہ کر لیں گے لیکن پاکستان کی فوج اور عوام نے بھارتی حملے کا مقابلہ نہایت بے جگری سے کیا اور حملہ آور فوج کے عزائم کو خاک میں ملا کر رکھ دیا۔ بھارت نے پاکستان کی توجہ ہٹانے کے لیے دو دن کے بعد سیالکوٹ پر حملہ کر دیا اس طرح پاکستان کے خلاف ایک دوسرا بڑا محاذ کھول دیا گیا لیکن اس محاذ پر بھی بھارتی فوج کو شکست اُٹھانا پڑی اس کے علاوہ پاکستان کی فوج نے چھمب جوڑیاں سیکٹر میں بھی بھارتی فوج پر مکمل برتری حاصل کر لی لیکن پاکستان کی فوج کے جرنیلوں نے جنگی پالیسی کو تبدیل کر کے اپنی کامیابی کو ناکامی میں تبدیل کر لیا۔

چھمب جوڑیاں سیکٹر کی منصوبہ بندی جنرل اختر ملک نے کی تھی یہ اسی کامیاب منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا کہ پاک فوج بڑی آسانی اور نہایت کامیابی کے ساتھ اکھنور کے اطراف میں پہنچ گئی اور اس نے بھارت کی دو ڈویژن فوج کو گھیرے میں لے لیا۔ عین اس وقت جب پاک فوج اکھنور پر حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف تھی پاک فوج کی ہائی کمان نے جنرل اختر ملک کو واپس بلا لیا اور ان کی جگہ جنرل یحییٰ خان کو سیکٹر کمانڈر بنا کر بھیج دیا گیا اس طرح اکھنور پر قبضہ کرنے کے منصوبے کو خاک میں ملا دیا گیا۔ بقولِ شاعر

ص قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

جنرل اختر ملک کو چھمب جوڑیاں سیکٹر کی کمان سے صرف اس لیے ہٹایا گیا کہ آپ کا تعلق قادیانی جماعت سے تھا اور پاک فوج کے جنرل اتنی بڑی کامیابی کا کریڈٹ ایک قادیانی جرنیل کو نہیں دینا چاہتے تھے۔

جنگ میں امریکہ کا کردار

۱۹۵۹ء کے پاک امریکی معاہدے کی رُو سے امریکہ جارحیت کی صورت میں پاکستان کا دفاع کرنے کا پابند تھا لیکن البتہ یہ ہے کہ امریکہ کے نزدیک "جارحیت" صرف کمیونسٹ حملے ہی کا نام ہے۔ اس اعتبار سے کمیونسٹ ممالک کے علاوہ پاکستان پر ہونے والا کوئی بھی حملہ جارحیت کی تعریف میں نہیں آتا۔ اس مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے امریکہ نے پاکستان کی حمایت کرنے کے بجائے نہ صرف غیر جانبداری کا رُوپ دھار لیا بلکہ بھارت کے ساتھ ساتھ پاکستان کی فوجی امداد بھی بند کر دی۔ اس پرُطرّہ یہ کہ امریکہ اور برطانیہ کے سفارتکار ایوّب خان پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہے کہ وہ فی الفور جنگ بندی کا اعلان کریں۔ امریکہ کے اس سلوک نے ایوّب خان کی آنکھیں کھول دیں اور اسے احساس ہوگیا کہ امریکہ پاکستان کا دوست نہیں بلکہ حاکم ہے اور اسی خیال سے متاثر ہوکر اس نے امریکہ کے متعلق اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" لکھی لیکن پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ایوّب خان کی وجہ سے امریکہ نے پاکستان میں اپنی جڑیں اتنی مضبوط کر لی تھیں کہ انہیں نکالنے کے لیے ایک صدی درکار ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ایران انڈونیشیا اور چین نے کھل کر پاکستان کی حمایت کی اور بھارت کو ایک جارح ملک قرار دیا۔

پاک بھارت جنگ اور چین

امریکہ کے مقابلے میں چین نے اعلانیہ طور پر کھل کر پاکستان کی حمایت کی۔ جنگ کے دوسرے ہی دن یعنی ۷ ستمبر کو چین نے بھارتی حملے کی شدید مذمّت کی اور پاکستان کو اپنی مکمل حمایت کا یقین دلایا۔ ۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو چین نے الزام لگایا کہ بھارت نے چین کی تین سو بھیڑیں اغوا کر لی ہیں نیز سکمّ اور

چین کی سرحد میں چینی علاقے میں فوجی چوکیاں قائم کرلی ہیں۔ چین نے بھارت کو تین دن کا الٹی میٹم دے دیا کہ اگر بھارت نے چینی سرحد پر اپنی چوکیاں ختم نہ کیں تو اُسے خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس الٹی میٹم نے نہ صرف بھارت بلکہ امریکہ اور رُوس میں کھلبلی مچادی۔ بھارت نے چینی سرحد پر اپنی ۵۶ چوکیاں گرادیں لیکن اس کے باوجود چین نے ایک سرحدی جھڑپ میں بھارتی فوجوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

پاک فوج نے نہایت اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور تمام محاذوں پر حملہ آور فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ۷ ستمبر ۱۹۶۵ء تک پاک فوج نے حملہ آور فوج کو اپنی سرحدوں سے نکال باہر کیا اور دشمن کے تقریباً پانچ سو مربع میل کے علاقے پر قبضہ بھی کرلیا۔ اس صورتِ حال نے بھارت اور اس کے دوست ممالک کو سخت پریشان کر دیا۔ لہٰذا انہوں نے عالمی سطح پر جنگ بندی کی مہم تیز کر دی۔ بالآخر ۲۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کو چین کی طرف سے سلامتی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد پیش کی گئی جو چین کے دباؤ کی وجہ سے منظور کرلی گئی۔ اس قرارداد میں دونوں ممالک سے کہا گیا تھا کہ وہ ۲۲ ستمبر سے جنگ بندی کر دیں۔ لہٰذا ۲۲ ستمبر سے جنگ بندی کا نفاذ کر دیا گیا۔

جنگ بندی کے فوراً بعد روسی وزیرِ اعظم کوسیگن نے دونوں ممالک کے سربراہوں کے نام ایک پیغام بھیجا جس میں اُمید ظاہر کی گئی کہ ہر دو ممالک جنگ بندی کا احترام کریں گے۔ پیغام میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اگر دونوں ممالک کے سربراہ روس آجائیں تو وہ ان کے درمیان تمام تنازعات طے کرانے کے لیے تیار ہیں۔ صدر ایوب خان کو اس تجویز سے سخت تشویش لاحق ہوگئی ان کا خیال تھا کہ اگر رُوس نے پاک بھارت تنازعات طے کرا دیئے تو اس سے برِصغیر

میں امریکہ اور برطانیہ کی نیکنامی کو دھچکا لگے گا۔ اس احساس کو ختم کرنے کے لیے ایوب خان ۱۱ دسمبر ۱۹۶۵ء کو لندن پہنچے اور وہاں سے ۱۴ دسمبر ۱۹۶۵ء کو امریکہ روانہ ہو گئے۔ ایوب خان نے برطانیہ کے وزیرِ اعظم مسٹر ولسن اور امریکی صدر مسٹر لنڈن بی جانسن کو اپنے خدشات سے آگاہ کیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ ثالثی کے لیے کسی دوسرے ملک کا انتخاب کیا جائے مگر دونوں سربراہوں نے ایوب خان کے خدشات کو بے بنیاد قرار دے کر مسترد کر دیا اور انہیں ہدایت کی کہ وہ روس جا کر ہندوستان کے ساتھ اپنے تمام تنازعات طے کریں۔

اعلانِ تاشقند صدر ایوب خان پاکستان کا وفد لے کر ۳ جنوری ۱۹۶۶ء کو تاشقند پہنچ گئے۔ دوسری طرف بھارتی وفد بھی وہاں وزیرِ اعظم لال بہادر شاستری کی قیادت میں پہنچ گیا۔ آٹھ روز تک مذاکرات جاری رہے مگر کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ بھارتی وزیرِ اعظم اس بات پر بضد رہے کہ مذاکرات میں مسئلہ کشمیر کا ذکر نہیں آنا چاہیے ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے لہٰذا اس معاملے پر بحث نہیں کی جا سکتی البتہ روسی وزیرِ اعظم مسٹر کوسیگن کی مداخلت پر پاکستان کو مسئلہ کشمیر پر بات چیت کرنے کی اجازت مل گئی۔ آخر کار ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو معاہدۂ تاشقند پر دستخط ہو گئے اور اسی دن مسٹر شاستری اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ مذاکرات کے دوران ایک مرحلہ پر روسی وزیرِ اعظم مسٹر کوسیگن نے صدر ایوب پر زور دیا کہ وہ مذاکرات کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں، جس پر ایوب خان نے مذاقاً کہا۔

"مجھے ہرگز یہ توقع نہیں کہ اس بالشت ڈیڑھ بالشت کے منحنی سے شخص

بھارتی وزیرِ اعظم کا ایوب خان کی موجودگی میں ذوالفقار علی بھٹو

احتراماً جھک کر تاشقند ایئرپورٹ پر خیر مقدم کر رہے ہیں

کے ساتھ کوئی فیصلہ کن گفتگو ہو سکے گی۔"

یہ سنتے ہی مسٹر کوسیگن سیخ پا ہو گئے اور انہوں نے سختی سے ایوب خان سے کہا:۔

"مسٹر شاستری ایک عظیم قوم کے عظیم لیڈر ہیں۔ ہم ان کی دل سے عزت کرتے ہیں اور آپ کو ہرگز یہ زیب نہیں دیتا کہ ہمارے سامنے ان کی شان میں کسی قسم کے گھٹیا الفاظ استعمال کریں۔"

اس ڈانٹ کے بعد ایوب خان نے شاستری کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور معاہدۂ تاشقند پر دستخط ہو گئے اس معاہدے میں کہا گیا تھا کہ:۔

(۱) صدرِ پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اور وزیرِاعظم بھارت مسٹر لال بہادر شاستری نے جموں و کشمیر پر بھی بات چیت کی اور دونوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے۔

(۲) دونوں رہنماؤں نے یہ طے کیا کہ دونوں ممالک کے ہائی کمشنر اپنے اپنے عہدے کا از سرِ نو چارج لے لیں گے اور سفارتی مشن دوبارہ معمول کے مطابق کام شروع کر دیں گے۔

(۳) دونوں ملکوں کی فوجیں ۲۵ فروری ۱۹۶۶ء تک ان مورچوں پر واپس چلی جائیں گی جن پر وہ ۵ اگست ۱۹۶۵ء تک متعین تھیں۔

(۴) دونوں سربراہوں نے اقوامِ متحدہ کے منشور کا پابند رہنے کا عہد کیا۔ جس کے تحت باہمی جھگڑے فوجی طاقت کے بل بوتے پر نہیں بلکہ پُرامن طریقوں سے حل ہونے چاہیئں۔

(۵) یہ طے پایا کہ دونوں ممالک کے درمیان اقتصادی، تجارتی اور ثقافتی روابط کو بحال کرنے کے سلسلے میں اقدامات کئے جائیں اور دونوں ملکوں

کے درمیان مواصلات کا سلسلہ بھی دوبارہ بحال کیا جائے۔

(۶) دونوں سربراہوں نے جنگی قیدیوں کی واپسی کے سلسلے میں ہدایات جاری کرنے پر بھی اتفاق کر لیا۔

(۷) دونوں سربراہوں نے عہد کیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان اب تک جو معاہدے ہوئے ہیں ان پر عملدرآمد کیا جائے گا۔

(۸) اس امر پر اتفاق ہو گیا ہے کہ وہ دونوں ملک اپنے اپنے ہاں ایسی فضا پیدا کریں گے کہ ایک ملک کے لوگوں کا ترک وطن کر کے دوسرے ملک میں جانا بند ہو جائے گا۔

(۹) دونوں ممالک اپنے اپنے ہاں سے لوگوں کے اخراج سے متعلق مسائل اور ان کی جائیدادوں کی واپسی کے معاملے پر بھی باہمی غور و خوص جاری رکھیں گے۔

(۱۰) دونوں ملکوں کے سربراہوں میں یہ فیصلہ بھی ہوا ہے کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ بند کر دیں گے۔

(۱۱) صدر پاکستان اور وزیر اعظم بھارت نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ ایسے معاملات پر غور کرنے کے لیے جن کا تعلق براہِ راست ایک دوسرے ملک سے ہو وہ اعلیٰ سطح پر یا دوسری سطحوں پر کانفرنسیں منعقد کر کے تصفیئے کریں گے۔

(۱۲) دونوں سربراہوں نے اس ضرورت کو تسلیم کیا کہ دونوں کی حکومتیں ایسے ادارے قائم کریں گی جو دونوں ممالک کے باہمی تعلقات کے متعلق باقاعدہ اپنی اپنی حکومت کو رپورٹ مہیا کریں۔ تاکہ یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ باہمی تعلقات سدھارنے کے لیے مزید کیا کیا اقدامات کئے جا سکتے ہیں۔

(۱۳) فریقین نے اس امر پر بھی اتفاق کیا کہ باہمی تعلقات اس اصول پر استوار کئے جائیں کہ ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔

فریقین کے درمیان اصل مسئلہ کشمیر کی گتھی سلجھانے کا تھا لیکن اعلانِ تاشقند میں اس کا ذکر تک نہیں ملتا۔ ایوب خان نے ۱۹۶۲ء میں بھارت کے خلاف جنگ نہ کر کے اور ۱۹۶۵ء میں قبل از وقت جنگ بندی قبول کر کے مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے مؤقف کو انتہائی کمزور بنا دیا۔ ۱۹۶۵ء میں پاک فوج اور عوام نے بھارتی جارحیت کو مکمل طور پر ناکام بنا دیا تھا۔ لیکن ایوب خان نے میدانِ جنگ میں جیتی ہوئی بازی مذاکرات کی میز پر ہار دی۔ پھر بھی وہ کامیاب و کامران رہے۔ بقولِ شاعر۔

میں اِسی میں سُرخرُو ہوں کہ محبّتوں کی بازی

وہ قدم قدم پہ جیتے، میں قدم قدم پہ ہارا

لیکن اس کے باوجود ایوب خان اپنے عہد کے ایک کامیاب حکمران تھے انہوں نے اپنے مقاصد کی کماحقہٗ تکمیل کی۔ مثلاً ملک میں آئین اور قانون کے احترام کی روایت ختم کر کے فوجی قوّت کو سیاسی اقتدار کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ امریکہ کے سامراجی عزائم کو پاکستان میں مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ ایوب خان کی بدنصیبی یہ ہے کہ ابھی اس کا کفن بھی میلا نہیں ہوا تھا کہ اس کے قریبی ساتھیوں نے اس کی شخصیت کی صحیح تصویر کو بے نقاب کرنا شروع کر دیا۔ پتہ نہیں مستقبل کا مؤرخ ان کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ ایوب خان کے ایک قریبی ساتھی بریگیڈیر اے، آر، صدیقی اپریل ۱۹۸۵ء کے ڈیفنس جرنل میں لکھتے ہیں :-

"ایک سپاہی ہونے کے باوصف ایوب خان سیاست کے شعور سے عاری تھا لیکن بنا متکبّر۔ اس نے عوامی جمہوریت کی جگہ ملک میں ایک تجارتی اور نیم صنعتی نظام قائم کرنے کی کوشش کی اور اس میں ناکام ہوا۔ سیاست سے مبرّا

ایک خالص معاشیاتی نظام بربریت پیدا کرتا ہے۔ جس میں غریب عوام کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جمہوریت پر مبنی سیاسی نظام عوام کو ملک کے انتظام میں شمولیت کی دعوت دیتا ہے۔ ایسے سیاسی نظام کی معیشت اطمینان بخش ہوتی ہے۔ جہاں نمائندہ حکومت اور عوام کی شمولیت نہیں وہاں پر ہر چیز اپنی افادیت کھو دیتی ہے۔"

اے کاش کہ بریگیڈیر صدیقی صاحب اتنی اچھی باتیں جنرل ضیاء الحق کو بھی سمجھا سکتے۔

یحییٰ خان پر ایوب خان کی نوازش خاص

۱۹۵۸ء کی فوجی بغاوت کی منصوبہ بندی میں یحییٰ خان نے نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اِن دنوں یحییٰ خان بریگیڈیر تھے اور کراچی میں تعینات تھے۔ اس وقت سے لے کر ایوب خان کے زوال تک وہ ایوب خان کے بہت قریب رہے۔ وفاداری کے اس جذبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایوب خان نے انھیں میجر جنرل کے عہدے پر ترقی دی اور خاص طور پر یحییٰ خان کیلئے "ڈپٹی کمانڈر انچیف" کا عہدہ تخلیق کیا اور انہیں ڈپٹی کمانڈر انچیف بنا دیا۔ ان دنوں جنرل موسیٰ خان کمانڈر انچیف تھے۔ ستمبر ۱۹۶۶ء میں موسیٰ خان کو مغربی پاکستان کا گورنر بنا دیا گیا اور یحییٰ خان بری فوج کے کمانڈر انچیف بن گئے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں جنرل اختر ملک نے کشمیر کے محاذ پر چھمب جوڑیاں سیکٹر میں کئی کامیابیاں حاصل کر کے بھارتی فوج کی منصوبہ بندی کو مکمل طور پر ناکام بنا دیا تھا اسی لیے ایوب خان اور موسیٰ خان نے بعض وجوہات کی بناء پر یحییٰ خان کو اختر ملک کی جگہ کشمیر کے محاذ پر بھیج دیا تاکہ کامیابیوں کے ثمرات یحییٰ خان کو دیئے جا سکیں۔ اس کے برعکس یحییٰ خان کا کردار یہ رہا تھا کہ اس نے کمانڈر انچیف بنتے ہی ایوب خان کا جانشین بننے کے خواب دیکھنے شروع کر

دیئے۔ اور بالآخر انہوں نے ایوبّ خان کے منصب پر قبضہ کرکے اپنے ارمانوں کی تسکین بھی کرلی۔

(۱) ایوبّ خان کی پُراسرار بیماری

۲۹ر جنوری ۱۹۶۸ء کو ایوبّ خان پر دل کا دورہ پڑا۔ یہ خبر سنتے ہی یحیٰی خان نے وزیرِ دفاع ایڈمرل اے۔ آر خان سے مِل کر ایوانِ صدر پر قبضہ کر لیا۔ ایوانِ صدر کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور فوجی گارڈز کو کہہ دیا گیا کہ فوجی افسران کے علاوہ کسی بھی شخص کو ایوانِ صدر میں داخل ہونے سے منع کر دیا جائے۔

دوسرے دن صبح ایوانِ صدر میں سب سے پہلے آنے والے شخص کابینہ کے سینئر وزیر خواجہ شہاب الدین تھے۔ خواجہ صاحب اپنی سرکاری کار پر جھنڈا لہراتے ہوئے ایوانِ صدر کے دروازے پر پہنچے تو گارڈز کے سپاہیوں نے انھیں واپس بھیج دیا جبکہ یحیٰی خان اور ان کے ساتھی گِدھوں کی طرح نیم جان صدر کے گرد منڈلا رہے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ کب بوڑھا فیلڈ مارشل زندگی کا آخری سانس لے تو وہ اس کی تِکّا بوٹی کر کے مسندِ اقتدار پر قبضہ کریں۔ اب طرح طرح کی افواہوں نے جنم لینا شروع کر دیا تھا اور مختلف قسم کی چہ مگوئیاں بھی ہو رہی تھیں۔ پھر کئی دنوں کے بعد یہ عقدہ کھُلا کہ صدر ایوبّ خان بیمار ہیں اور ڈاکٹر اُن کا علاج کر رہے ہیں۔ ان کی بیماری کا پہلا ہفتہ بڑا صبر آزما تھا۔

یحیٰی خان نے ایوبّ خان کا رشتہ بیرونی دنیا سے مکمل طور پر منقطع کر دیا تھا حتّٰی کہ ان کے گھر والوں کو بھی ان کی طرف سے بے خبر رکھا جا رہا تھا۔ لیکن جب ایوبّ خان کی حالت قدرے سنبھل گئی تو صدر کی صحت کے بارے میں میڈیکل بلیٹن کا اجرا شروع کر دیا گیا۔

(۲) ایوبّ خان کا اپنے تخلیق کردہ آئین سے مذاق

۱۹۶۲ء کے

آئین کی رُو سے صدرِ مملکت کی غیر حاضری یا بیماری کی صورت میں قومی اسمبلی کے اسپیکر کو قائمقام صدر کی حیثیت سے صدرِ مملکت کی ذمّہ داریاں سونپی جانی چاہیئے تھیں۔ ان دنوں قومی اسمبلی کے اسپیکر عبدالجبّار خان تھے۔ صدر ایوبؔ خان تقریبًا پانچ چھ ہفتے تک اپنے فرائض سنبھالنے سے معذور رہے۔ لیکن اس تمام عرصے میں صدرِ مملکت کا منصب عملاً خالی رہا اور مملکت کا کاروبار معطّل رہا۔

ایوبؔ خان کی نظروں میں یہ احترام تھا اس آئین کا، جسے خود اس نے تخلیق کیا تھا۔ جب خود ہی ایوبؔ خان کے دل میں اپنے ہی بنائے ہوئے آئین کا کوئی احترام نہیں تھا تو وہ دوسروں سے کس طرح اس آئین کی پابندی و پاسداری کی توقع رکھ سکتے تھے جب کہ ان کی یہ توقع قطعی طور پر عبث بھی تھی۔ اُدھر یحییٰ خان کی کاروائی سے ایوبؔ خان کو یقین ہو چلا تھا کہ ان کے اقتدار کا سرچشمہ ان کا بنیادی جمہوریتوں کا نظام، قومی اسمبلی یا ان کا اپنا تخلیق کردہ آئین نہیں تھا بلکہ وہ پاک فوج تھی جس کی قیادت اب یحییٰ خان کے پاس تھی۔ اسی لیئے اب ایوبؔ خان کا اقتدار صرف اور صرف یحییٰ خان کے رحم و کرم پر ہی تھا۔

اکتوبر ۱۹۶۸ء میں ایوبؔ خان کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز ہوا تو یحییٰ خان اور ان کے ساتھیوں نے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے اپنی سرگرمیاں تیزی سے شروع کردیں۔ اسی اثناء میں ۷ نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی پولی ٹیکنک کے سامنے ایک نوجوان طالبعلم عبدالحمید پولیس فائرنگ سے جاں بحق ہوگیا۔ اس حادثے نے پورے ملک میں آگ لگادی۔ اس دن سے لے کر ایوبؔ خان کی معزولی تک پورا ملک سورش اور بدامنی کی زد میں رہا۔ عوام اور طلباء کے جلسے، جلوس کیساتھ ساتھ لوٹ مار، توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ کے واقعات روزمرّہ کا معمول بن گئے تھے۔ عوام کے غیض و غضب کے سامنے سِول انتظامیہ اور پولیس بے دست و پا

ہوگئی تھی۔ پھر فوج کو میدان میں لایا گیا ۔ مگر حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ فوج کو درپردہ ہدایت تھی کہ وہ مظاہرین کے خلاف کوئی کاروائی نہ کرے۔ اس کے برعکس یحییٰ خان اور اس کے ساتھیوں کے اشارے پر ایسے اشتہارات بھی تقسیم کیے گئے جن میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ملک کی سلامتی اور امن وامان کی بحالی کے لیے برّی فوج کے کمانڈر انچیف کو عنانِ حکومت سنبھال لینا چاہیئے ۔ ۱۴ فروری ۱۹۶۹ء کو پورے ملک میں عام ہڑتال کی گئی اس موقع پر تمام کاروبار بند رہا۔ سڑکوں پر چلنے والی تمام گاڑیوں پر سیاہ جھنڈے لہرائے گئے۔ یہاں تک کہ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کی گاڑیوں پر بھی سیاہ جھنڈیاں لگائی گئیں ۔ اس کے علاوہ اس روز کراچی، لاہور، ڈھاکہ، حیدرآباد اور کئی دیگر شہروں میں بھی ہنگامے ہوئے جن میں بے شمار افراد ہلاک اور متعدد زخمی ہو گئے تھے۔

(۳) گول میز کانفرنس اور ایوبؔ خان کی مجبوریاں

بالآخر حالات سے مجبور ہوکر صدر ایوبؔ خان نے جناب نوابزادہ نصراللہ خان صدر، ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی کو گول میز کانفرنس کی دعوت دی۔ اس کانفرنس میں شمولیت کے لیے ایوبؔ خان نے شیخ مجیب الرحمٰن کو پیرول پر رہا کرنے کی اجازت بھی دیدی۔ نیز انہوں نے ۱۹۶۲ء کے آئین سے خود ہی ہاتھ اٹھالیا اور یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ آئندہ انتخابات میں صدارتی امیدوار کی حیثیت سے حصّہ نہیں لیں گے۔ اسی پسِ منظر میں ۲۶ فروری ۱۹۶۹ء کو گول میز کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ ایوبؔ خان اس کانفرنس کو ہر حال میں کامیاب بنانا چاہتے تھے۔ جبکہ یحییٰ خان اور اس کے ساتھی، جنرل ایوبؔ خان کی ہر مساعی کو ناکام بنانے کی تگ ودو میں مصروف

تھے۔ ایوبؔ خان حزبِ اختلاف کے تمام مطالبات بے چون و چرا مانتے چلے گئے۔ مثلاً ایوبؔ خان نے شیخ مجیب الرحمٰن کے مطالبے پر گورنر مشرقی پاکستان عبدالمنعم خان کو ہٹا کر ان کے آدمی ڈاکٹر این ایم ہدیٰ کو مشرقی پاکستان کا گورنر بنا دیا۔ اسی طرح مغربی پاکستان کے فوجی گورنر موسیٰ خان کی جگہ جناب یوسف ہارون کو مغربی پاکستان کا گورنر بنا دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ ایوبؔ خان پارلیمانی نظامِ حکومت اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کے مطالبات کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے اور گول میز کانفرنس کا آئندہ اجلاس ۱۰ مارچ کو منعقد ہونا طے پا گیا تھا۔ اس دوران یحییٰ خان اور جنرل پیرزادہ نے شیخ مجیب الرحمٰن کو باور کرا دیا کہ ایوبؔ خان کے پاس انہیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ اب اقتدار کی کنجی ان کے پاس ہے اگر کچھ لینا ہے تو ان سے بات کرے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے ان کی یہ بات پلّے باندھ لی اور ۱۰ مارچ کو گول میز کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کرا دیا گیا۔

(۴) ایوبؔ خان کا آئینی ذمّہ داریوں سے انحراف

اس وقت پورا ملک احتجاج کی آگ میں جل رہا تھا۔ ہر جانب قتل و غارتگری، توڑ پھوڑ اور جلاؤ گھیراؤ کا بازار گرم تھا۔ ملکی معیشت یکسر تباہ ہو چکی تھی۔ ۱۳ مارچ سے کراچی کا اسٹاک ایکسچینج بھی بند ہو چکا تھا جبکہ ڈھاکہ میں آدم جی جوٹ ملز اور پاکستان ٹمباکو کمپنی پر مزدوروں نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں کے گلی کوچوں میں "ایوبؔ کتا ہائے ہائے" اور "ایوبؔ کتا مُردہ باد" کے فلک شگاف نعرے گونج رہے تھے۔ اس کے باوجود ایوبؔ خان ملکی مسائل کا آئینی حل قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ جبکہ ۱۹۶۲ء کے آئین کی رُو سے یہ ایوبؔ خان کی آئینی ذمّہ داری تھی کہ وہ صدارت کے عہدے سے استعفٰی دے

دیتے اور صدارت کی ذمہ داری قومی اسمبلی کے اسپیکر جناب عبدالجبار خان کے حوالے کر کے خود مسندِ صدارت سے الگ ہو جاتے۔ یہی ایک آئینی اور پُرامن راہ تھی جسے اپنا کر ملک کو مزید شیرازہ بکھرنے سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔ جسے ایوب خان نے اختیار کرنا شاید اپنی توہین سمجھا۔ حالانکہ ایوب خان کو یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ساری بدامنی و انتشار کا واحد سبب صرف یہ تھا کہ قوم ایوب خان کو اقتدار سے الگ دیکھنا چاہتی تھی۔ جبکہ معقولیت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ قوم کا مطالبہ تسلیم کر کے اقتدار کو فی الفور چھوڑ دیتے اور اس طرح احتجاجی تحریک جو اپنے بھرپور شباب پر تھی از خود دم توڑ دیتی اور ملک تاریخ کے سنگین ترین آئینی بحران سے دوچار ہوتے سے بچ جاتا۔ لیکن ایوب خان کے نزدیک مسئلہ معقولیت کا نہیں بلکہ آمریت کا تھا۔ اس لیے انہوں نے آئینی اقدام سے گریز کیا اور اپنے کمانڈر انچیف یحییٰ خان کو اقتدار سنبھالنے کی دعوت دیدی۔

(۵) ایوب خان کا انتقام ایوب خان کی یہ کاروائی قوم کیخلاف سخت ترین نفرت کی غماز ہے۔ جو ذاتی رنجش کی بناء پر ان کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ لہٰذا اس نے قوم سے انتقام لینے کیلئے اُسے مارشل لاء کی سزا کا مستوجب گردانا۔ اور یحییٰ خان کو اقتدار کی مسند سنبھالنے کے لیے بُلا لیا۔ جس نے ۱۹۶۲ء کا آئین منسوخ کر کے قوم کو ایک بار پھر مارشل لاء کی ذلت سے دوچار کر دیا اور ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو جنرل یحییٰ خان اس ملک کے حاکمِ مطلق بن بیٹھے۔

(۶) جنرل رانی کی پیشگوئی اس سے قبل گجرات کی ایک عورت اقلیم اختر عرف جنرل رانی جس کا شمار یحییٰ خان کی دوستوں میں تھا، نے پنجابی میں ایک نظم لکھی تھی۔ جس میں پیشگوئی کی گئی

تھی کہ ملک کا آئندہ سربراہ یحییٰ خان ہوگا۔ یہ نظم اعلیٰ فوجی افسروں میں بہت زیادہ مقبول ہوئی اور اسی نظم کی بدولت اس نے بہت جلد کچھ زیادہ ہی شہرت حاصل کرلی تھی۔

ایوب خان کے خط کی بنیاد پر یحییٰ خان نے آئین منسوخ کرکے اقتدار پر قبضہ تو کرلیا تھا لیکن پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ سپریم کورٹ نے "عاصمہ جیلانی" کیس میں یحییٰ خان کی کاروائی کو غیر آئینی گردانتے ہوئے واشگاف الفاظ میں یحییٰ خان کو غاصب قرار دے دیا۔

(۷) یحییٰ خان اور صدارت

جنرل یحییٰ خان ۲۵ مارچ سے ۱۱ اپریل ۱۹۶۹ء تک یہ تسلیم کرنے سے ہی انکار کرتے رہے کہ وہ ملک کے صدر بھی ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ پاک فوج کے کمانڈر انچیف اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہیں۔ اس لیے دنیا کو چاہیئے کہ وہ انھیں صرف چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہی تسلیم کرے۔ انھیں یہ باور کرایا گیا کہ صدر ملک کا سربراہ ہوتا ہے جس پر ان کا جواب تھا کہ پاکستان کے سربراہ کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طور پر بھی تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ بالآخر انکے خارجہ امور کے مشیر ارشد حسین نے بڑی مشکل سے انھیں یہ سمجھایا کہ بیرونی ممالک کی حکومتیں معاہدات کی توثیق صرف اسی لیے نہیں کر رہیں کہ پاکستان کا کوئی سول سربراہِ مملکت نہیں ہے۔ اسی لیے آپ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ صدرِ مملکت بھی کہلائیں تاکہ بیرونی دنیا کے ساتھ معاملات طے کرنے میں حائل مشکلات دُور کرکے انہیں طے کیا جاسکے۔

اس طرح یحییٰ خان صدرِ مملکت کہلانے پر رضامند ہوگئے۔ اور مارشل لاء کے ایک اعلان کے ذریعے یہ واضح کردیا گیا کہ یحییٰ خان ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء

سے ملک کے صدر بھی ہیں ۔

(۸) یحییٰ خان کا کردار

ایک مسلمان سربراہِ مملکت کی حیثیت سے یحییٰ خان کی شخصیت متنازعہ فیہ ہی نہیں رہی بلکہ نفرت اور حقارت کی واضح علامت بن کر بھی رہ گئی اس اندازِ فکر کی چند بڑی وجوہات درجِ ذیل ہیں ۔

(۱) یحییٰ خان کی عیاشی، شراب نوشی، زناکاری اور فرائضِ منصبی سے مجرمانہ غفلت اور لاپرواہی، جسکی وجہ سے ملک دولخت ہوگیا۔

(۲) ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں ایسی ذلت آمیز شکست جس کی مثال مذہبِ اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اور پھر یہ شکست بھی ایک ایسی قوم کے ہاتھوں جو ایک بہادر یا جنگجو قوم کی حیثیت سے اپنے کسی بھی شاندار تاریخی ورثے کی حامل نہیں رہی ۔

(۳) پاکستان کی شرمناک و ذلت آمیز شکست و ریخت پر پوری دنیا اور بالخصوص دنیائے اسلام کی مکمل خاموشی جو اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یحییٰ خان کی حکومت خارجہ تعلقات کے رموز سے قطعی طور پر نابلد اور ناآشنا تھی ۔

یحییٰ خان کے زوال کے بعد ان کی اخلاقی بے راہ روی، جنسی دیوانگی اور مے نوشی کے افسانے ملکی اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہے اور ان پر مختلف حلقوں کی جانب سے تبصرے بھی سامنے آتے رہے۔ خود یحییٰ خان اور اُنکے بھائی آغا محمد علی نے ان اطلاعات کی سختی سے تردید کی اور انھیں یحییٰ خان کی کردار کشی کی منظم سازش قرار دیتے ہوئے مکمل طور پر مسترد کردیا۔ اب یہ دونوں حضرات اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں لیکن تاریخ کا اصول یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مشاہیر کے مرنے کے بعد مدوّن کرتی ہے لہٰذا وقت آگیا ہے کہ

مندرجہ بالا تینوں الزامات کا قطعی غیر جانبدارانہ و حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے۔

جہاں تک متذکرہ بالا الزام نمبر (۱) کا تعلق ہے جو جنرل یحییٰ خان کی ذاتی زندگی کا ایک غلیظ اور تاریک حصہ ہے اس کی صحت کا درست اندازہ کرنے کے لیے کافی چھان بین کی ضرورت ہے جبکہ الزامات نمبر (۲) اور نمبر (۳) اظہر من الشمس ہیں۔ کیونکہ بنگلہ دیش کا وجود ہی ان پر دونوں الزامات کو درست ثابت کرنے کے لیے کافی ہے اور اس کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ:۔

"آفتاب آمد دلیلِ آفتاب"

(۹) یحییٰ خان کی عیّاشیاں

کائنات کا نظام کچھ اس طرح استوار کیا گیا ہے کہ جہاں سچّائی از خود اُبھر کر سامنے آجاتی ہے اور جھوٹ خود بخود عدم کے اندھیروں میں ڈوب کر فنا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یحییٰ خان کا حقیقی روپ از خود نکھر کر سامنے آجائے گا۔ اس کتاب کے مصنّف کو کچھ عرصے کے لیے نہایت قریب سے یحییٰ خان کی ذاتی زندگی کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس لیے میں اپنے مشاہدے کی بنا پر نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یحییٰ خان جنسی بے راہ روی اور بدکرداری کی آخری حدود سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ میں نے دنیا کے مشاہیر مثلاً جولیس سیزر، سکندرِ اعظم، نپولین بوناپارٹ وغیرہ کی جنسی بے راہ روی کے قصّے بغور پڑھے ہیں اس لیے پورے اعتماد و یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس میدان میں ان سب کی حیثیت یحییٰ خان کے سامنے طفلانِ مکتب سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھی۔ ایک دفعہ اموی خلیفہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اموی گورنر کوفہ، حجاج بن یوسف کے متعلق فرمایا تھا کہ:-

اگر تمام دنیا کے انبیاء اپنی اپنی اُمت کے بدکرداروں کو جمع کردیں اور ہم ان کے مقابلے میں صرف حجاج بن یوسف کو لے آئیں تو واللہ ہمارا ہی پلہ بھاری رہے گا۔"

درحقیقت یہ مقولہ تجلی خان کی ذات پر بھی مکمل طور پر صادق آتا ہے۔

مصنف کے ذاتی مشاہدات

میری زندگی کا آغاز پنجاب پولیس کی ملازمت سے ہوا تھا۔ لیکن اسے میری خوش بختی کہیئے یا بدنصیبی سے تعبیر کیجیئے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی بیس سالہ ملازمت کے بعد بھی اس محکمے میں اجنبی ہی رہا۔ اگست ۱۹۷۷ء میں جبکہ میں بطور انسپکٹر پولیس محکمہ انسدادِ رشوت ستانی کراچی میں تعینات تھا تو میں نے خرابیٔ صحت کی بناء پر اس ملازمت سے استعفٰے دیدیا تھا۔ لیکن میرا یہ استعفٰے نامنظور کردیا گیا۔ لیکن بعدازاں ۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء سے مجھے خرابیٔ صحت کی بناء پر ہی ملازمت سے ریٹائر کردیا گیا۔ چنانچہ مجھے بیس سال بعد اس اذیت ناک بارِ گراں سے نجات مل ہی گئی جس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر بجالایا اور سکون واطمینان کا سانس لیا۔ محکمہ پولیس میں میری اجنبیت، میری نالائقی، بزدلی یا نااہلی کی وجہ سے ہرگز نہ تھی بلکہ میں اس محکمہ کے نظامِ اخلاق کے ساتھ مطابقت پیدا نہ کرسکا۔ پولیس کا نظامِ اخلاق، رشوت، بدعنوانی، جھوٹ، مکروفریب، خوشامد اور ظلم وستم کے عناصر سے تشکیل پاتا ہے۔ جسے قبول کرنا ہر کس وناکس کے بس کی بات بھی نہیں۔ احرار کے مشہور لیڈر چوہدری افضل حق مرحوم بھی سیاست میں آنے سے پہلے پنجاب پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ مرحوم نے کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔

جن میں "زندگی" اور "میرا افسانہ" کافی شہرت پا چکی ہیں۔ موصوف اپنی کتاب "میرا افسانہ" میں پولیس کی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"غلام ہندوستان کا سب انسپکٹر پولیس ایک خونخوار بھیڑیا ہے۔ وہ جس طرف بھی جاتا ہے چیر پھاڑ کرتا ہے اور مخلوقِ خدا اس کے خوف سے بھاگتی ہے۔"

یہ وہ تربیت تھی جو پاکستان پولیس کو ورثے میں ملی اور جس کی بنیاد پر اس کا نظامِ اخلاق مرتب ہوا۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں مکمل اعتماد و یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ میں نے پولیس کی ملازمت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کی مثال برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس کے لیے درجِ ذیل صرف چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) ایوبؒ خان کیخلاف عوامی تحریک

ستمبر ۱۹۶۸ء میں ایوب خان کیخلاف "عوامی تحریک" کا آغاز ہوا۔ میں ان دنوں بطور سیکیورٹی آفیسر بہاولپور میں تعینات تھا۔ اس ضلع میں امن عامہ کی صورتحال اور سیاسی سرگرمیوں کی دیکھ بھال میرے فرائضِ منصبی میں شامل تھی۔ میں ماہِ اکتوبر میں چند یوم کی رخصت پر تھا کہ اس دوران مقامی کالج اور اسکولوں کے طلباء نے بہاولپور شہر میں ایک جلوس نکالا اور کنونشن مسلم لیگ کے دفتر کو آگ لگا دی۔ پھر پولیس اور طلباء کے درمیان تصادم ہو گیا۔ جس میں کچھ طلباء زخمی ہو گئے جبکہ کچھ کو گرفتار بھی کر لیا گیا اور اس طرح مزید گڑبڑ کے بغیر صورتحال پر قابو پا لیا گیا۔ ان دنوں پنجاب پولیس کے موجودہ انسپکٹر جنرل پولیس جناب نثار احمد چیمہ بہاولپور میں بطور ایس۔ پی تعینات تھے جنہوں نے میری چھٹی منسوخ کر دی اور مجھے فوری طور پر واپس بلا لیا گیا۔

۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء تک پورے ملک میں "عوامی تحریک" اپنے شباب پر

رہی۔ بہاولپور شہر میں بھی ہر روز جلسے ہوتے تھے اور جلوس بھی نکالے جاتے تھے۔ مزید برآں قومی سطح کے قائدین بشمول چوہدری محمد علی، جناب ذوالفقار علی بھٹو، مولانا مودودی وغیرہ بھی بہاولپور کے دورے کرتے رہے اور بڑے بڑے عوامی اجتماعات سے خطاب بھی فرماتے رہے۔ ان تمام سرگرمیوں کے باوجود بہاولپور ضلع میں بدامنی یا تصادم کا کوئی ایک بھی واقعہ رُونما نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی گرفتاری عمل میں آئی۔ اوّلین حادثے میں بھی جن طلباء کو گرفتار کیا گیا تھا میں نے ان کو بھی ضمانت پر رہا کرا یا جب کہ بعد میں ان سب کیخلاف مقدمات بھی واپس لے لیے گئے اور ان کو جملہ الزامات سے بُری الذّمہ قرار دیدیا گیا۔ اس طرح ان کے دامن پر لگنے والے داغ دھبّے بھی صاف کر دیئے گئے۔

(۲) جناب ذُوالفقار علی بھٹّو کا دَورَہ

سابق ریاست بہاولپور کا دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے بہاولپور شہر ایک خاص اہمیّت کا حامل تھا۔ اس کے علاوہ پوری ریاست میں مذہبی رجحانات کو بڑا فروغ حاصل تھا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے چند جاگیردار سیاست دانوں نے ڈویژنل انتظامیہ کے اشارے پر جناب ذوالفقار علی بھٹّو کے جلسے میں گڑبڑ کرانے کا پروگرام مرتّب کر لیا۔ مجھے اس پروگرام کی اطلاع قبل از وقت مل گئی اور میں نے اس پروگرام کی تمام جزوی تفصیلات بھی جمع کر لی تھیں۔ میری کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ جناب نثار احمد چیمہ ایس، پی اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بہاولپور نے فیصلہ کر لیا کہ امن وامان بہر صورت ہر حال میں قائم رکھا جائے گا اور کسی بھی شخص کو جناب ذوالفقار علی بھٹّو کے جلسے میں گڑبڑ پھیلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے مجھے سیکیوریٹی انتظامات کا نقشہ مرتّب کرنے کی اجازت دیدی۔ جسے میں نے بروقت

مرتب کر کے تمام متعلقہ اداروں تک پہنچا دیا۔
ہم نے جلسے کے منتظمین کو بھی مطلع کیا اور ان کا تعاون بھی حاصل کر لیا۔
جناب ذوالفقار علی بھٹو اپنے پروگرام کے مطابق بہاولپور پہنچے تو ان کا انتہائی پُرتپاک اور والہانہ خیر مقدم کیا گیا۔ نیز ایک بہت بڑے جلسۂ عام کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی جناب ذوالفقار علی بھٹو تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو چند شرپسندوں نے مخالفانہ نعرے لگانا شروع کر دیئے۔ دو تین اطراف سے پتھر بھی آنا شروع ہو گئے۔ لیکن "قائدِ عوام" نے ابتداً ان کارروائیوں کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔
ادھر باوردی پولیس کو سوچ سمجھ کر جلسہ گاہ سے دور رکھا گیا تھا۔ اس لیے "قائدِ عوام" کے دل میں شک پیدا ہو گیا کہ شاید مقامی انتظامیہ جان بوجھ کر حفاظتی اقدام سے گریز کر رہی ہے۔ لیکن جلسہ گاہ کے منتظمین نے انہیں فوری طور پر صحیح صورتحال سے آگاہ کر دیا اور پھر خود مجمع میں آ کر شرپسندوں کو وہاں سے بھگا دیا اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کا جلسہ نہایت پُرامن طریق پر جاری رہنے کے بعد اختتام پذیر ہو گیا۔
ایوب خان کے زوال کے بعد اردو ڈائجسٹ کے مدیر جناب الطاف حسین قریشی نے اپنے رسالے میں ایوب خان کے خلاف چلنے والی "عوامی تحریک" کا ایک جائزہ پیش کیا تھا۔ موصوف نے اس امر پر حیرت و مسرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کا اظہار اس طرح کیا کہ "پورے پاکستان میں بہاولپور وہ واحد ضلع تھا کہ جہاں پر عوامی تحریک پورے چھ ماہ کے عرصے میں پوری شدت کیساتھ چلتی رہی مگر بدامنی کے ایک ہی واقعہ کے بعد نہ تو وہاں کسی بھی قسم کا کوئی جانی یا مالی نقصان ہوا اور نہ ہی کوئی گرفتاری عمل میں آئی"۔ اس اشاعت

نے پورے ملک کی انتظامیہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور اعلیٰ حکام کیطرف سے شکریے کے کئی خطوط جناب نثار احمد چیمہ کو ارسال کئے گئے تھے۔

(۳۳) اینٹی کرپشن میں تعیناتی

میں جون ۱۹۷۵ء سے ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۷ء یعنی اپنی ریٹائرمنٹ تک بطور انسپکٹر پولیس "محکمۂ انسدادِ رشوت ستانی" کراچی میں تعینات رہا۔ انسدادِ رشوت ستانی کا قانون ۱۹۴۷ء میں پاک و ہند میں نافذ ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس قانون پر عملدرآمد کے لیے ایک علیحٰدہ محکمے کا قیام بھی عمل میں لایا گیا تھا جو ہنوز زندہ و سلامت ہے اور سرگرمِ عمل بھی۔ البتہ پاکستان میں عملی اعتبار سے اس کے تشخص میں کچھ تبدیلی بھی ضرور آگئی ہے۔ اب اس محکمے کو عام طور پر "اینٹی کرپشن کی بجائے "ملٹی کرپشن" کہا جاتا ہے۔ پتہ نہیں پڑوسی ملک ہندوستان میں اس کا کیا حال ہے؟ میں نے اس محکمے میں تعیناتی کے دوران جس اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا اس کی نہ تو کوئی مثال پورے برِصغیر میں اس محکمے کی تاریخ میں ملتی ہے اور نہ ہی ایسی کوئی مثال اس صدی کے اختتام تک متوقع ہے۔

لیکن اس کے باوجود یہاں بھی میرا گزارہ بہت دشوار ہوگیا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ اس محکمے کے تمام افسران دن دھاڑے دندنا کر رشوت لیتے تھے۔ لیکن جب کوئی دوسرا سرکاری یا نیم سرکاری ملازم یہی کام کرتا تھا تو وہ اس کو پکڑ لاتے تھے۔ یہ عجیب تضاد تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رشوت ستانی پر اس محکمے کی اجارہ داری ہے اور جو بھی شخص ان کے اجارہ میں مداخلت کرتا گرفتار کر لیا جاتا تھا۔

انجیل مقدس کا "عہد نامۂ جدید" ایک بہت ہی پیاری اور دلچسپ کتاب

ہے۔ ایک مقام پر حضرت عیسٰی علیہ السّلام یہودی سُود خوروں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

" جب کوئی غریب آدمی مچھّر مارتا ہے تو تم اس سے مچھّر کے خون کا قصّاص لیتے ہو۔ لیکن خود اُونٹ کے اُونٹ نگل جاتے ہو اور پرواہ تک نہیں کرتے۔ یاد رکھو۔ ! یہ وقت ہمیشہ نہیں رہے گا۔"

اسی قسم کا ایک اور واقعہ مصر کے ایک برگزیدہ صوفی کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ خلیفۃ المسلمین آپ کے دربار میں حاضر ہوئے اور ان سے معلوم کیا کہ اگر کسی آدمی کے کپڑوں پر مچھّر کا خون لگ جائے تو کیا اس خون کی موجودگی میں نماز ہو سکتی ہے۔ ؟ بزرگ اس کی بات سُن کر بہت برہم ہوئے اور نہایت غصّے کے عالم میں فرمایا :۔

" تم دن رات غریبوں کا خون چوستے ہو اور مجھ سے مچھّر کے خون کا فتویٰ پوچھنے آ گئے ہو۔"

یہی حال ہمارے اینٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ کا ہے۔ جہاں پر دن رات رشوت کا بازار گرم رہتا ہے لیکن جب کوئی غریب ملازم مجبوری کے تحت دس بیس روپے لے بیٹھتا ہے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔

(۴) **رشوت ستانی کی وکالت** جولائی ۱۹۷۷ء میں کامیاب فوجی بغاوت اور اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد جب جنرل ضیاء الحق نے ایک آمرِ مطلق کی طرح حکمت و دانائی، تدبّر اور تفکّر کے دریا بہانے شروع کر دیئے تو رشوت ستانی کا کاروبار بھی ان کی زد میں آ گیا۔ عام خیال پیدا ہو گیا کہ شاید یہ سیلاب اس کاروبار کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا اور اسے اپنے ساتھ بآسانی بہا کر لے جائے گا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ اس لیے کہ

ضیاء الحق کو اس کاروبار کی تخلیقی صلاحیتوں اور مثبت اقدار سے بخوبی آگاہی حاصل تھی۔ وہ بھلا اسے کیونکر ختم کرتے۔ انہوں نے اپنے پیش رو، آمروں کی طرح سماجی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور رشوت ستانی کو ختم کرنے کے لیے جناب جسٹس شفیع الرحمٰن کی صدارت میں ایک کمیشن قائم کر دیا۔ کسی دشمن نے یہ ہوائی اڑا دی کہ یہ خاکسار رشوت ستانی کے اسرار و رموز میں بڑی مہارت رکھتا ہے چنانچہ کمیشن نے ایک حکمنامے کے ذریعے مجھے طلب کر کے اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ میں اُن دنوں سرکاری ملازمت چھوڑ کر پیشۂ وکالت سے منسلک ہو گیا تھا۔ میں نے اس مسئلے پر زبانی بحث کی اور ایک تحریری بیان بھی دیدیا۔ میرا نکتۂ نظریہ تھا کہ:۔

(۱) ہمارا قانون، ہمارا اخلاقی نظام اور مذہبی نظریات، رشوت ستانی کو روکنے میں ناکام رہے ہیں۔

(۲) رشوت ستانی کا انسداد صرف منظّم رائے عامّہ کے ذریعے ہی ممکن ہے جسے آمریت نے دبا رکھا ہے۔ اور جس کے اُبھرنے کی مستقبلِ قریب میں کوئی اُمید بھی نہیں۔

(۳) ہمارا پورا انتظامی ڈھانچہ رشوت ہی کے سہارے قائم و دائم ہے اگر رشوت کے عنصر کو خارج کر دیا گیا تو یہ ڈھانچہ دھڑام سے زمین پر آگرے گا۔

(۴) رشوت ستانی کی اقسام میں سب سے زیادہ خطرناک اور ضرر رساں قسم وہ ہے جو "سیاسی رشوت" کہلاتی ہے۔ یہ رشوت ہمیشہ اُوپر سے شروع کی جاتی ہے اسی لیے اس کا دائرۂ کار نہایت وسیع ہے کہ یہ معاشرے کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

مندرجہ بالا دعوے کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے زبانی طور پر بتایا تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کے لیے پورے ملک میں سیاسی

رشوت کا جال پھیلا دیا ہے۔ اس کی ایک مثال کراچی کے محکمۂ انسدادِ رشوت ستانی سے ہی دی جا سکتی ہے۔ ضیاء الحق نے ریٹائرڈ بریگیڈیئر ظفر اقبال کو اس محکمے کا چیئرمین بنا دیا ہے اور ساتھ ہی دیگر کئی ریٹائرڈ فوجی افسروں کو اس محکمہ میں تعیناتی بھی کر دیا ہے۔ یہ کارروائی صرف اور صرف فوجی افسروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ہی کی گئی ہے۔ ورنہ اس محکمے کا کام تو ان لوگوں کے آنے کے بعد بھی اسی ڈگر پر چل رہا ہے جیسے کہ پہلے چل رہا تھا۔ ان کے آنے سے اس محکمے کی اہمیت یا افادیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہاں البتہ ماتحت عملے نے رشوت کا نرخ مزید بڑھا دیا ہے۔ کیونکہ اب ان کے اخراجات بڑھ گئے تھے۔

(۵) مندرجہ بالا حقائق کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ رشوت ستانی کا قانون منسوخ کر دیا جائے اور رشوت ستانی سے متعلق تمام محکموں کو ہی توڑ دیا جائے۔ رشوت کی آمدنی کو جائز قرار دے دیا جائے نیز اس آمدنی پر انکم ٹیکس بھی عائد کیا جائے اور سرکاری مشینری کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے مناسب اقدامات کئے جائیں۔

مندرجہ بالا نکات پر کافی طویل اور دلچسپ بحث ہوئی۔ کچھ عرصے بعد مجھے کمیشن کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں میرا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کمیشن نے میری تجاویز اپنی رپورٹ میں شامل کر دی ہیں لیکن ہر پاکستانی شہری بخوبی جانتا ہے کہ کمیشنوں کا قیام اور رپورٹوں کی تیاری ہماری حکومتوں کے لیے محض تفریحِ طبع اور دل لگی کے سامان سے زیادہ اور کوئی حقیقت نہیں رکھتے یا پھر اپنے ہی عوام کو دھوکہ دینے یا وقت گزاری ہی کے لیے ایسا کیا جاتا ہے۔ آپ خود ہی اندازہ کیجئے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا مذاق ہو سکتا ہے کہ ملک دو لخت ہو گیا ہے جس کے باعث ہمیں اپنے تاریخی تشخص کی سنگین ترین اور شرمناک و ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ نوے ہزار سے زائد

فوج دشمن کی قید میں چلی گئی یہی نہیں بلکہ پانچ ہزار مربع میل سے زائد علاقہ بھی دشمن کے قبضے میں دیکھتے ہی دیکھتے چلا گیا۔ پاکستان کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب حمود الرحمٰن کی سربراہی میں کمیشن قائم کیا گیا لیکن قوم کو آج تک اس کمیشن کی رپورٹ کا سراغ تک نہ مل سکا۔ اس عظیم المیے کی رپورٹ تو آج تک سترہ برس گزر جانے کے باوجود شائع نہیں ہوئی لیکن جنرل ضیاء الحق اور ان کے وزیر خزانہ ڈاکٹر محبوب الحق کے بیانات ضرور شائع ہوئے۔ جن سے رشوت ستانی کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۵) جنرل ضیاء کا اعتراف اور مجبوری

جبکہ جنرل ضیاء الحق نے اعتراف کر لیا کہ وہ رشوت کو ختم کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہے ہیں اور یہ اعتراف ایکبار ہی نہیں بلکہ متعدد بار ریڈیو ٹی وی پر خطاب اور مختلف تقاریب میں انتہائی بے غیرتی و بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ کیا گیا۔ یہ اس قوم کی بدنصیبی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک آمر مطلق جس کے دست قوت میں اپنی ذات و اقتدار کے دوام کے لیے تمام تر طاقت و اختیار موجود ہے وہ جب اور جسے چاہے اقدامات کر کے اس امتیاز کے بغیر کہ اس کے اس اقدام سے عوام و خواص کو کن کن مشکلات و مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا اور کتنے ہی لوگ اس کے ان ظالمانہ اقدام سے اپنی آزادی اور زندگی سے محروم ہو جائیں گے۔ وہی آمر مطلق رشوت جیسی لعنت کے خاتمے میں ناکامی کا رونا انتہائی بے لبسی کے عالم میں روتا نظر آتا ہے۔ دراصل بات یہ نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جب کوئی بھی چھوٹا یا بڑا کام نیم دلی اور دکھاوے کے لیے کیا جائے تو وہ اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام و نامراد ہی ہوگا۔ اور پھر مشاہدہ یہ بھی بتاتا ہے کہ ایک جانب تو رشوت جیسی لعنت کو ختم کرنے کے اقدامات خواہ نیم دلی سے ہی سہی،

کئے جا رہے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف اپنے اقتدار کے دوام اور اپنی ذاتی انا کی تسکین کے لیے خود ہی چھوٹی بڑی رشوتیں دی جا رہی ہیں۔ کبھی اپنے مخالفین کو چھوٹی بڑی رقوم یا دیگر اقسام و ذرائع سے خریدا جا رہا ہے، تو کبھی اپنا ہمنوا بنانے کے لیے لالچ، دھونس اور سخت گیری کا سہارا لے کر انھیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اُن کی حمایت پر آمادہ ہوں۔ پھر بھی کچھ سر پھرے ان تمام تر لالچ، دھونس اور سخت گیری سے نہ بِک سکے تو پھر انھیں پسِ زندان میں ڈال دیا گیا اور پلٹ کر ان کی خبر تک نہ لی۔ یا پھر کوڑے برسائے گئے اس سے بھی کام نہ چلا تو پھانسیوں کے پھندے ڈال کر اُن کی خودداری کی آواز کو ہمیشہ ہمیشہ ہی کیلئے خاموش کر دیا گیا۔

جنرل ضیاء الحق کے وزیرِ خزانہ ڈاکٹر محبوب الحق کے بیانات وانکشافات نے پوری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر موصوف نے تسلیم کیا کہ پاکستانی خزانے کے اربوں روپے ہر سال رشوت ستانی اور بدعنوانی کے راستے نوکرشاہی کی جیبوں میں چلے جاتے ہیں جبکہ اس بڑی رقم کو قومی خزانہ میں آنا چاہیے تھا جس سے ملک و قوم کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کاروائی یا تو حکومت کی مرضی سے ہو رہی ہے یا پھر اس کی نااہلی کے باعث ہی ایسا ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ دونوں صورتوں میں رشوت کو جائز قرار دینے کی گنجائش موجود ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ بالا بیانات سے یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ پاکستان میں رشوت و بدعنوانی کا مرض لاعلاج ہو چکا ہے۔ اس صورتحال میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ جب تک کہ رائے عامہ کو منظم نہ کیا جائے یا کوئی بڑا اقدام مثلاً "خونی انقلاب" نہ لایا جائے۔ ورنہ جنرل ضیاء الحق کی طرح ہر حکمران اپنی بے بسی کا اُٹھتے بیٹھتے قوم کے سامنے ریڈیو، ٹی، وی پر خطاب کے دوران یا دیگر تقاریب میں انتہائی ڈھٹائی سے مگر بظاہر مجبوری سے یہ اعتراف کرتا نظر آئے گا کہ

"مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ کل تک جو کام ۵۰ روپے میں ہو جاتا تھا آج وہ رشوت کے نرخ بڑھ جانے کے باعث ۵۰۰ روپے میں بھی مشکل سے ہی ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ عوام رشوت دینے پر مجبور ہیں کہ اس کے بغیر وہ اپنا کوئی جائز کام بھی نہیں کروا سکتے۔"

(۶) پریذیڈنٹ ہاؤس پر تعیناتی

میرا تبادلہ ۱۹۷۱ء کی دوسری سہ ماہی میں ایوانِ صدر کے حفاظتی گارڈ میں کر دیا گیا۔ میری ڈیوٹی کی نوعیت یہ تھی کہ مجھے صرف صدرِ مملکت یحییٰ خان کے قیام کراچی کے دوران ایوانِ صدر میں دن یا رات کے وقت صدر کی حفاظت کے فرائض انجام دینے ہوتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنی اصل جائے تعیناتی پر واپس آ جاتا۔ یہ حقیقت ہے کہ صدر ہاؤس کی حیثیت محض ایک قحبہ خانے کی سی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی اپنے انتہائی عروج پر تھی اور بھارت کی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی نے عالمی سیاست کو پاکستان کے خلاف متحرک کر رکھا تھا۔ اس کے برعکس یحییٰ خان اس دوران ہر مہینے، ہفتے عشرے کے لیے کراچی آتے تو ایوانِ صدر میں شراب و کباب اور شباب کی رونقیں نہ صرف یہ کہ بحال ہو جاتیں بلکہ اپنے جوبن پر بھی ہوتیں۔ میں تقریباً پانچ چھ ماہ تک ایوانِ صدر میں تعینات رہا۔ اس عرصے میں میں نے کسی بھی شریف شہری، سیاستدان، عالمِ دین، صحافی، ماہرِ تعلیم یا کسی ایسے انسان کو جو کسی بھی حیثیت سے نیک نام ہو، ایوانِ صدر کے قریب پھٹکتے نہیں دیکھا۔ یہاں صرف مخرب الاخلاق انسانوں جن میں دلّے، بھڑوے، بے ضمیر و بے غیرت، بے حس و ننگِ انسانیت لوگوں کا ہی گزر ممکن تھا۔

یحییٰ خان کی غلاظت کا عالم یہ تھا کہ ان کے جانے کے بعد کئی دنوں تک

ایوانِ صدر کی صفائی ستھرائی کا کام ہوتا رہتا تھا۔ وہاں کی کیفیت اس قدر شرمناک تھی کہ اُسے صفحۂ قرطاس پر لانا ممکن ہی نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہاں سوائے گناہ، تاریکی اور اندھیرے کے، کچھ بھی نہیں تھا۔ بقولِ اکبر الہ آبادی

ع لکھے گا کلک حسرت دنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

یہ عرصۂ ملازمت میرے لیے انتہائی اذیّت ناک اور بیحد تکلیف دہ تھا میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ:-

(۱) کیا اللہ تعالیٰ نے اس شخص یعنی یحییٰ خان کو اقتدارِ اعلیٰ صرف اس لیے عطا کیا ہے کہ یہ عیّاشی، شراب نوشی، زناکاری اور بدکاری کے کھلّم کھلّا مظاہرے انتہائی ڈھٹائی و بے غیرتی سے کرتا پھرے۔

(۲) کیا اس شخص کی عقلِ سلیم سلب ہو چکی ہے اور اُسے اتنا بھی احساس نہیں کہ میرے ملک کے ایک بڑے حصّے مشرقی پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟

(۳) نیکوکاری کے عوامل سو گئے ہیں اور ابلیس ننگا ناچ رہا ہے گویا خدا سویا ہوا ہے۔ اہرمن محشر بداماں ہے۔

(۴) کیا اس وسیع اسلامی مملکت میں کوئی ایک بھی ایسا غیرت مند انسان نہیں جو اس غلیظ انسان کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکے اور اس قوم کو اس کے گناہوں کے عذاب سے بچا سکے۔

چنانچہ اس ذہنی کرب کے نتیجے میں میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں اس غلیظ و کمین انسان کو قتل کر دوں گا۔ اور اس کے ناپاک وجود سے قوم کو نجات دلا دوں گا۔ میں ان باتوں کا اظہار اکثر اپنے دوستوں اور ساتھی پولیس افسران کے سامنے کرتا رہتا تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی میری حمایت پر آمادہ

نہیں تھا۔ جس کا مجھے قطعی افسوس بھی نہ تھا البتہ مجھے اس بات پر سخت افسوس ہے کہ میں یہ کارِ خیر انجام دینے میں ناکام رہا۔

ایوانِ صدر کی رنگینیوں کی داستانیں بڑی دلچسپ اور طویل ہیں اور میرے موضوعِ بحث سے خارج بھی۔ اس لیے میں صرف ان چند واقعات کی حقیقی صورتحال بیان کروں گا جن کا ذکر یحیٰی خان نے کیا ہے یا پھر جو مختلف ذرائع ابلاغ سے عوام الناس تک پہنچ چکے ہیں

(۱) **یحیٰی خان کی آوارگی** یحیٰی خان کے بڑے بھائی آغا محمد علی نے "آتش فشاں" کے مدیر جناب منیر احمد منیر کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں اس دکھ کا اظہار کیا تھا کہ اخبارات و رسائل نے بعض مخالفین کی ایما پر یحیٰی خان کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک سوال کے جواب میں موصوف نے فرمایا تھا کہ:۔

"اس تصویر کو آپ دیکھیں تو اس میں مسجدِ نبوی کا ماڈل بھی نظر آئے گا جو مرحوم شاہ فیصل نے جنرل صاحب کو پیش کیا تھا۔ ایک تختی پر "اللہ" اور "پاک پنجتن" کے نام لکھے ہیں۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ رسالے کے اندر جو مضمون لکھا ہے اس میں وہ خرافات ہیں کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

اس بیان میں آغا محمد علی صاحب نے اپنے بھائی کو ایک پکا مسلمان اور شعائرِ اسلام کا پابند انسان ثابت کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہمیں ان کے اس بیان پر کوئی اعتراض نہیں۔ ممکن ہے وہ درست کہتے ہوں اور جنرل یحیٰی خان ایک پکے مسلمان ہونے ہوئے اس فلسفے پر عمل کر رہے ہوں کہ:۔

ع "رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی"

میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ یحیٰی خان آوارگی اور اوباشی میں

اتنے بے لگام تھے کہ جس کی مثال انسانی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یحییٰ خان دنیا کا وہ واحد حکمران ہے جو رات کی تاریکی میں اپنے حفاظتی عملے کو جُل دے کر ایوانِ صدر سے غائب ہو جاتا اور اپنی پسند کے ماحول میں ساری رات شراب نوشی اور شہوت رانی میں انہماک کیساتھ مشغول رہتا۔ ہم نے کتابوں میں پرانے بادشاہوں کے قصے پڑھے ہیں۔ جو رات کی تاریکی میں بھیس بدل کر گلی کوچوں میں گشت کر کے اپنی رعایا کے مصائب معلوم کرتے تھے۔ جبکہ یحییٰ خان بدکاری کے اڈّوں کی رونقیں بڑھاتا تھا۔ ایوانِ صدر کے بعد دوسرا بڑا عیاشی کا اڈّہ باتھ آئی لینڈ میں پی آئی اے ہاؤس تھا جو پی آئی اے کے سربراہ جناب درّانی کی تحویل میں تھا۔ سیکیورٹی عملے نے یحییٰ خان کے تعاقب اور نگرانی کے لیے "فلائنگ اسکواڈ" کے نام سے ایک الگ دستہ بنایا تھا۔ یہ مسلح دستہ ایک وائرلیس سیٹ والی جیپ میں ہر وقت یحییٰ خان کا تعاقب کرنے کے لیے مستعد رہتا۔ جونہی یحییٰ خان بغیر کسی پروگرام و اطلاع، ایوانِ صدر کی کار میں بیٹھ کر راہِ فرار اختیار کرتا تو یہ دستہ اس کے پیچھے لگ جاتا اور وائرلیس پر یحییٰ خان کے فرار کی اطلاع پولیس کے اعلیٰ افسران کو دے دیتا۔ اس اطلاع پر حفاظتی عملے کو باخبر کر دیا جاتا اور یحییٰ خان جہاں بھی قیام پذیر ہوتا یہ عملہ اس مکان کی حفاظت کے لیے اپنا کام شروع کر دیتا اور شب باشی کے بعد یحییٰ خان کو اُٹھا کر گاڑی میں ڈال کر واپس ایوانِ صدر لایا جاتا تھا۔

(۲) بلیک بیوٹی یحییٰ خان کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے جن خواتین کو شہرت حاصل ہوئی ان میں مسز کے ایم حسین کا نام بھی شامل ہے۔ اس خاتون کا تعارف کراتے ہوئے آغا محمد علی اپنے متذکرہ بالا انٹرویو میں فرماتے ہیں۔

س:۔ رانی کا ذکر چلا ہے تو اس پر تھوڑی سی گفتگو ہو جائے۔

ج :۔ "میں پہلے ایک اور خاتون کا ذکر کروں گا۔ جسے "بلیک بیوٹی" کا نام دیا گیا، میں تو اُسے یہ نام نہیں دوں گا، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ مشرقی پاکستان کے ایک معزّز گھرانے کی معزّز خاتون تھیں، ان کے والد مشرقی پاکستان ہائی کورٹ میں جج تھے۔ ان کے خاوند کھنڈ کر حسین ڈی آئی جی مشرقی پاکستان تھے۔ وہ بہت ہی مہذّب، پڑھی لکھی، کلچرڈ خاتون تھیں۔ تین تو اس نے ایم اے کر رکھے تھے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سُناتا ہوں۔ ۱۹۶۳ء میں سارو ار مشرقی پاکستان ٹریننگ کالج کی پچاسویں سالگرہ منائی گئی۔ میں لاہور میں ڈی آئی جی تھا۔ مغربی پاکستان کی نمائندگی کے لیے مجھے ایس پی صغیر حسین اور اے ایس پی نور لغاری کو منتخب کیا گیا۔ ہم وہاں تین دن رہے۔ بڑی بڑی شخصیتیں اس میں شریک ہوئیں۔ بہت بڑا فنکشن تھا، یہاں تک کہ فیلڈ مارشل ایوّب خان نے بھی اس تقریب میں شرکت کی اور ان کا قیام اسی معزّز خاتون کے ہاں ہوا۔ مسز حسین کا بس یہی کردار تھا اور یار لوگ جو جی میں آتا ہے، لکھ ڈالتے ہیں۔ یہ تک نہیں سوچتے کہ اس سے کسی عزّت دار گھرانے کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"یحییٰ خان نے بھی اقتدار سے علیحدہ ہونے کے بعد جناب مُنیر احمد مُنیر کو ایک انٹرویو دیا تھا جس میں انہوں نے "بلیک بیوٹی" کی ستائش کرتے ہوئے کہا :۔

س :۔ اور وہ بلیک بیوٹی۔؟

ج :۔ وہ بنگالن تھی اور مشرقی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس امین کی بیٹی تھی۔ انتہائی قابل اور باصلاحیت عورت تھی۔ ڈبل ایم اے فرسٹ کلاس، گھوڑ سواری، ٹینس، گاف، سکویش، کوئی چیز نہیں جو وہ نہ کھیلتی ہو۔ میں نے اُسے کہا ساری عورتیں سفیر بن کر جاتی ہیں۔ تو کیوں نہیں بنتی۔ کہنے لگی مسٹر پریذیڈنٹ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی اگر آپ مجھے کسی یورپی ملک میں نامزد کر دیں۔ میں

نے اُسے آسٹریا بھیج دیا۔ کیونکہ وہ وہیں جانا چاہتی تھی اس لیے کہ اس کا میاں
کے ایم حسین سوئٹزرلینڈ میں یا کسی اور قریبی ملک میں سفیر تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ
وہ اور اس کا میاں قریب قریب رہیں۔ اس کا میاں ریٹائرڈ آئی جی پولیس تھا۔
اس کے پانچ چھ بیٹے تھے۔ وہ بھی بہت قابل تھے۔ کہنے لگی یہ بھی ساتھ چلے
جائیں گے ان کی پڑھائی بھی ہو جائے گی۔

بس اتنی بات تھی کہ میرے پیچھے پتہ نہیں کیا کیا افسانے تراشے گئے اور
اُسے بلیک بیوٹی کا نام دیا گیا۔ بلیک بھی اور بیوٹی بھی۔"

یحییٰ خان کا بیان فی نفسہٖ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ یحییٰ خان
اور مسز کے، ایم، حسین کے درمیان خصوصی نوعیت کے تعلقات استوار تھے اور
یہ مہربانیاں انہی تعلقات کا نتیجہ تھیں۔ میں ذاتی طور پر کسی بھی خاتون پر الزام
تراشی کو بدترین گناہ سمجھتا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں نے یحییٰ خان کی بدکرداری
کے ساتھ کسی خاتون کو وابستہ نہیں کیا حالانکہ میں ایسی بہت سی خواتین کے نام
بھی جانتا ہوں جن کے یحییٰ خان کے ساتھ "مراسمِ خاص" تھے لیکن میں "بلیک بیوٹی"
کا نام اس لیے لے رہا ہوں کہ ایک تو آغا محمد علی اور یحییٰ خان یعنی دونوں ہی
بھائیوں نے اس کے ساتھ خصوصی تعلقات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے
جبکہ اس تعلق کے ساتھ میری زندگی کی تلخ یاد بھی وابستہ ہے۔ وہ یہ کہ:۔

"شام تقریباً چھ بجے کا وقت تھا۔ میری ڈیوٹی "فلائنگ اسکواڈ" کے ساتھ
تھی میں نے دیکھا کہ یحییٰ خان کی گاڑی "ایوانِ صدر" کے عقبی دروازے کی جانب
جا رہی ہے۔ سنتری نے سیٹی بجائی۔ میں فوراً اپنی پارٹی کے ساتھ جیپ میں
بیٹھا اور ڈرائیور نے میری جیپ یحییٰ خان کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ عقبی گیٹ
کی چابی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس انچارج ایوانِ صدر کے پاس ہوتی تھی۔ وہ

اتفاق سے تھوڑے سے فاصلے پر تھے ان کو بلا کر لاتے اور گیٹ کھولنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یحیٰی خان اُلجھن محسوس کر رہا تھا۔ یحیٰی خان کی عادت تھی کہ وہ تعاقب کرنے والی پارٹی کو گالیاں بکتا تھا۔ میں نے اس کی پریشانی دیکھ کر فوراً فیصلہ کر لیا کہ اگر اس نے گالی بکنے کی کوشش کی تو میں اُسے گولی مار دوں گا لیکن وہ گاڑی میں بیٹھا رہا۔ دروازہ کھُل گیا۔ اس کی گاڑی اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس قصرِ ناز کے پورچ میں جا رُکی۔ مسز کے، ایم حسین یعنی "بلیک بیوٹی" نے کار کا دروازہ کھول کر اُسے باہر نکالا اور اپنا بایاں ہاتھ یحیٰی خان کے کاندھے پر رکھ دیا۔ جبکہ یحیٰی خان نے اپنا دایاں ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیا اور دونوں خراماں خراماں بالائی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ یحیٰی خان اُسے دیکھتے ہی گالیاں بکنا بھول گیا لیکن پھر بھی میں اس پر فائر کرنے کے لیے اپنا ریوالور نکال رہا تھا کہ ڈرائیور نے میرا ہاتھ پکڑ کر جھٹک دیا اور مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا:۔

"آپ تو زندگی سے بیزار ہیں ہمیں کیوں مرواتے ہیں۔؟"

یحیٰی خان نے تمام رات "بلیک بیوٹی" کے ساتھ بسر کی اور صبح کے وقت حسبِ معمول اُسے اٹھا کر ایوانِ صدر واپس لایا گیا۔ اس واقعہ کے بعد میں نے یقین کر لیا کہ تباہی ہمارا مقدّر بن چکی ہے۔ جسے روکنا میرے بس میں نہیں۔ لہٰذا میں نے کوشش کر کے ایوانِ صدر سے اپنی ڈیوٹی ختم کرا لی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یحیٰی خان کی شراب نوشی، زناکاری اور جنسی آوارگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے لیکن بعض واقعات ایسے ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد ہماری نسلیں شرم کے مارے سر جھکا لیں گی اور یحیٰی خان کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی بُری طرح لعن طعن کریں گی کہ ہم نے اس شخص کو صدرِ مملکت کے طور پر قبول کیوں کئے رکھا۔ اور اس بدبخت و بدکردار کے ہاتھوں ملک کا بیڑہ غرق

کرا دیا۔ اس سلسلے میں مزید چند مثالیں پیشِ خدمت ہیں:"

پنجاب کے سابق انسپکٹر جنرل پولیس راؤ عبدالرشید نے مُنیر احمد مُنیر کے ساتھ اپنے ایک انٹرویو میں سوالوں کا جواب دیتے ہوئے بتایا:۔

س:۔ بعض فلم ایکٹریسوں کے نام بھی لیے جاتے تھے۔ مثلاً ترانہ وغیرہ۔

ج:۔ بہر حال جو لوگ بھی تھے۔ سب کو معلوم ہے۔ راز کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ لوگ پہنچے۔ اس کے بعد جنرل یحییٰ خان آئے۔ جنرل حمید بھی ان کے ساتھ آئے۔ اور بھی جو ان کا مخصوص ٹولہ تھا۔ انعام الرحمٰن علوی سب چیزوں کے انچارج تھے۔ نہ گرمیاں تھیں نہ سردیاں تھیں۔ سوئمنگ پول کے سامنے رات کے ایک، دو، تین بجے تک شراب وغیرہ چلتی رہی۔ بڑا ہاؤ ہُو ہوتا رہا۔ سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں وہاں پشاور کا ایک جرمن جوڑا تھا۔ وہ آدمی لکڑی کی صنعت کاری کا ایکسپرٹ تھا اُسے انہوں نے پاکستان لگایا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی۔ اس کے متعلق مشہور یہ تھا کہ وہ سی آئی اے کی جاسوس ہے اور اس کا یہی کام ہوتا تھا کہ ہر اس محفل میں خاص طور پر فوجیوں کی پارٹی میں وہ کسی نہ کسی طرح ضرور پہنچ جاتی تھی۔ چونکہ عورت خوبصورت تھی وہ ہر جگہ ویلکم ہوتی تھی۔ وہ ایک طرح کا پاسپورٹ تھا۔ چنانچہ وہ محترمہ بھی جنرل یحییٰ خان صاحب کی پارٹی میں نہ صرف موجود تھیں، بلکہ یحییٰ خان کی باقی جو دوست احباب تھیں ان سب میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی ویسے بھی ولیسٹرن تھی۔ ڈکنی (DiKKNI) بہن کر ان کے ساتھ نہا و ہا رہی تھی۔ بہر حال ہوتا یہ رہا۔ کھیل یہ تھا کہ اس محترمہ کو جرنیل اُٹھا اُٹھا کر سوئمنگ پول کے اندر پھینکتے تھے۔ وہ پھر باہر نکلتی تھی۔ اور خوب قہقہے لگتے تھے۔

یہ اس وقت کا حال ہے جب ایسٹ پاکستان میں ہمارے بے شمار فوجی مارے جا رہے تھے اور ایسٹ پاکستان کے آخری دن تھے۔ چونکہ یہ قصہ میرے گھر کے

سامنے بیٹھا تھا۔ میں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اگر یہی حال ہے تو پھر اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ اصل میں فوجی حکمرانوں کی سب سے بڑی کمزوری اور خرابی یہ ہے، چونکہ وہ مختارِ کُل ہوتے ہیں۔ انھیں کسی بات کا ڈر نہیں ہوتا، جوابدہی کا ڈر نہیں ہوتا۔ نہ اخبار میں جوابدہی ہوتی ہے۔ نہ پارلیمنٹ میں جوابدہی ہوتی ہے۔ اور جب وہ اپنی طاقت کے نشے میں ہوتے ہیں پھر انہیں خیال ہی نہیں رہتا کہ کس حد تک جانا چاہیئے۔ پھر وہ ہر حد سے گزر جاتے ہیں۔ انہیں اس وقت احساس ہوتا ہے جب ملک کا سنگین نقصان ہو جائے۔ آپ ساری ہسٹری دیکھیں۔ ان لوگوں نے اس وقت اقتدار چھوڑا ہے جب انہیں کسی شرمناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر یحییٰ خان کو ایسٹ پاکستان میں شرمناک شکست نہ ہوتی تو وہ کبھی اقتدار نہ چھوڑتا۔

تو یہ ایک تاریخی چیز ہے، تاریخی عمل ہے۔ اس کا کوئی علاج فی الحال ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔

س: یحییٰ خان کے مکان کی افتتاحی تقریب کی بات ہو رہی تھی۔؟

ج: ہاں، پھر یہ ہوا کہ یحییٰ خان صاحب پتہ نہیں رات کو سوئے یا نہیں سوئے۔ لیکن چار بجے اپنے صرف انڈر ویئر میں باہر نکل آئے۔ نشے میں بالکل دُھت تھے انھوں نے حکم دیا گاڑی تیار کرو۔ میں اسی وقت راولپنڈی جاؤں گا۔ متعلقہ اسٹاف کے لوگ بیچارے بڑے پریشان۔ انہوں نے کہا جی ابھی گاڑی منگواتے ہیں۔ انہوں نے ایس ایس پی کو فون کیا۔ ایس ایس پی نے ڈی آئی جی کو فون کیا کہ پریذیڈنٹ صاحب تو راولپنڈی جانے کے لیے تیار ہیں اور برآمدے میں ننگے کھڑے ہیں۔ تو یحییٰ خان صاحب کے کمرے میں ایک محترمہ تھیں۔ انہوں نے تھوڑا تھوڑا دروازہ کھول کے انھیں واپس بلانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح تھے۔

پتہ نہیں وہ اس محترمہ سے کس بات پر ناراض ہو گئے تھے۔
س :۔ وہ محترمہ ان کے خاص مہمانوں میں سے کوئی تھیں۔؟
ج :۔ جی ہاں۔
س :۔ یحییٰ خان کے اہلِ خانہ ابھی وہاں نہیں آئے تھے۔؟
ج :۔ نہیں یحییٰ خان کے گھر کی کوئی محترمہ ابھی وہاں نہیں آئی تھیں۔ ابھی تو اس گھر کی اوپننگ سرمیمنی (افتتاحی تقریب) ہو رہی تھی۔

بہر حال اس محترمہ نے کوشش کی، لیکن جناب جنرل صاحب بضد تھے کہ میں اسی وقت جاؤں گا۔ پھر یحییٰ خان صاحب کی ایک اور منظورِ نظر کو فون کیا گیا۔ وہ آئیں اور بڑی منت سماجت کر کے ان کو اندر لے گئیں۔ اس طرح سے کرائسس (بحران) جو تھا وہ ختم ہوا۔ ایسٹ پاکستان کا کرائسس تو کوئی نہیں تھا۔ اصل کرائسس جو تھا وہ یہ تھا کہ یحییٰ خان کو ننگا دھڑنگا کس طرح پنڈی لے جایا جائے۔ تو وہ کرائسس بہر حال ٹل گیا۔

س :۔ وہ محترمہ جنہیں رات کے چار ساڑھے چار بجے فون کر کے بلایا گیا اور وہ صدرِ پاکستان جنرل آغا یحییٰ خان کو راضی کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ وہ کون تھیں؟
ج :۔ کوئی سینئر افسر ہی تھا۔ اس کی بیوی تھیں۔
س :۔ شاہِ ایران نے ایرانی بادشاہت کا جب ڈھائی ہزار سالہ جشن منایا۔ وہاں سُنا ہے کہ یحییٰ خان اتنے دُھت ہو گئے تھے کہ ان کا وردی میں ہی پیشاب نکل گیا۔
ج :۔ جی ہاں۔ یہ تو ایک سُنی سنائی بات ہو گئی۔ ویسے تو ان کے بے شمار قصے مشہور ہیں۔
س :۔ مثلاً
ج :۔ مثلاً یہ کہ جب ایک دفعہ نیپال دورے پر گئے، جہاز میں انہوں نے اتنی پی لی کہ چل نہیں سکتے تھے۔ کوئی گھنٹہ پون گھنٹہ جہاز فضا میں ہی گھومتا رہا کہ ان

کا اتنا نشہ تو اترے کہ چلنے کے قابل ہوں، پھر جہاز اتارا جائے۔ بہر حال بہت سارے قصے مشہور ہیں۔"

اسی طرح پاکستان کے سابق سیکرٹری داخلہ جناب ایم، اے چوہدری اپنی کتاب "مارشل لاء کا سیاسی انداز" میں لکھتے ہیں:۔

" شاہ ایران نے ایران میں شہنشاہیت کے دو ہزار سالہ جشن کے دوران خاص ذاتی کاوش سے روسی لیڈر پڈگورنی (PODGORNY) اور یحییٰ خان کی ملاقات کا اہتمام کیا۔ مقصد اس ملاقات کرانے کا یہ تھا کہ یحییٰ خان کی روس کے ساتھ بلاوجہ تلخ کلامی سے جو بدمزگی پیدا ہو چکی ہے اس کا مدافع کیا جائے تاکہ مشرقی پاکستان کے مسئلے میں روس کی حمایت حاصل ہو سکے۔ شاہ ایران نے کلکتہ میں مقیم عوامی لیگ کے لیڈروں خصوصاً تاج الدین گروپ سے بھی رابطہ قائم کیا کہ اگر پڈگورنی یحییٰ ملاقات کا کوئی مثبت نتیجہ نکلے تو ان کو ایران لے آیا جائے اور یحییٰ خان سے براہِ راست مذاکرات کی تجدید ہو سکے۔ پڈگورنی سے ملاقات کا وقت صبح ساڑھے دس بجے رکھا گیا تاکہ یحییٰ خان علی الصبح شراب کے نشے میں نہ ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا اور اس ذاتِ شریف کو سہارا دے کر روسی لیڈر کے خیمے تک لے جانا پڑا۔ پڈگورنی نے اس کے استقبال میں اسے مسٹر پریذیڈنٹ کہہ کر خطاب کیا۔ یحییٰ خان نے کہا "ایکسی لینسی (EXCELLENCY) آپ تو میرا ذکر ہمیشہ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کہہ کر کرتے ہیں۔ آج مسٹر پریذیڈنٹ کیسے کہہ دیا۔؟ پڈگورنی نے بدستور خوشگوار لہجے میں کہا ایکسی لینسی آپ پریذیڈنٹ ہیں اس لیے آپ کو پریذیڈنٹ کہا۔ یحییٰ نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا اور کہا یہاں سے کہو (یعنی دل سے کہو) پھر ہاتھ گلے پر لے گیا اور کہا یہاں سے نہیں (یعنی حلق سے)۔ پڈگورنی نے اس طرزِ کلام کو ہتک آمیز سمجھا اور بغیر ایک لفظ کہے خیمے سے باہر چلا گیا۔ چنانچہ یہ تاریخ ساز ملاقات اس طرح ختم ہوئی۔

وزارتِ خارجہ کے افسران جو ہمراہ تھے سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اسی شام یحییٰ کی ایک ملاقات یوگوسلاویہ کے صدر مارشل ٹیٹو MARSHAL TITO سے ہوئی۔ ملاقات کے فوراً بعد جب پریس والوں نے مارشل ٹیٹو سے ملاقات کے بارے میں سوالات کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا مشرقی پاکستان کے بچ جانے کی کوئی امید ہے تو مارشل ٹیٹو نے کہا آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ یحییٰ خان مشرقی پاکستان کو بچانے کے لیے سنجیدہ ہے؟"

یہ اس غاصب کے کردار کی چند مثالیں ہیں جس نے طاقت کے بل بوتے پر اس ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور کمزوری کی بنیاد پر اس کے دو ٹکڑے کرا دیئے۔ اس حقیقت سے کوئی بھی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ نے ہر انسان کو قطعی طور پر آزاد پیدا کیا ہے۔ اس نے اپنے نائب کو دنیا میں کسی کا غلام یا دستِ نگر بنا کر نہیں بھیجا۔ البتہ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ہر زور آور اپنے سے کمتر و کمزور پر غالب آجاتا ہے۔ طاقت کے بل بوتے پر ایک دوسرے پر برتری حاصل کر کے خود اس زمین پر خدا بن بیٹھنے والے شاید اللہ کے فطری قانون سے نابلد رہتے ہیں۔ ہمارے وطنِ عزیز پاکستان کا المیہ بھی یہی رہا ہے کہ طاقت کے زور پر ہی یہاں اقتدار پر قبضہ کیا جاتا رہا۔ اور ملک و قوم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھا گیا۔ لیکن ایسے اقتدار کے نشے میں بدمست حکمرانوں اور آمروں نے اپنے انجام کی کبھی فکر ہی نہیں کی۔ اپنے وقتی اقتدار کو دائمی اقتدار جان کر ملک و قوم کی قسمت سے کھیلنا اپنے فرائضِ منصبی کا لازمی حصّہ تصور کیا۔ اللہ جو تمام تر کائنات کا خالق و مالک ہے کو یکسر فراموش کر بیٹھے اور کبھی جبر و تشدّد تو کبھی عیش و عشرت کی انتہاؤں میں غرق ہو کر مخلوقِ خدا پر قہر بنے رہے۔ لیکن ایسے حکمرانوں کو تاریخ نے کبھی بھی نہ صرف یہ کہ معاف ہی نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ مکافاتِ عالم کا سلوک انھیں

صفحۂ ہستی سے ہی مٹا گیا۔ یحییٰ خان کا شمار بھی ایسے ہی مؤخر الذکر حکمرانوں میں ہوتا ہے۔

یحییٰ خان اور امریکہ

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی کردار تو بے شک بدل گئے لیکن پاکستان سے متعلق امریکی پالیسی میں کوئی تبدیلی آنی بھی نہ آئی۔ یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح تمام دنیا اور ہم پر بھی عیاں ہے کہ امریکہ نے نئی آمریت کو سہارا دینے کے لیے دستِ تعاون دراز کر دیا۔ اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے جناب قدرت اللہ شہاب نے اپنی کتاب "شہاب نامہ" میں لکھا ہے کہ " انتقال اقتدار سے چند روز قبل امریکی سفیر متعینّہ پاکستان اپنی حکومت سے صلاح مشورہ کے لیے امریکہ چلے گئے اور ان کے واپس آنے کے فوراً بعد ایوبؔ خان نے عنانِ حکومت جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر دی۔ گویا یہ تبدیلی بھی حقیقتاً امریکہ کے اشارے پر ہی عمل میں آئی تھی"

پاکستان کے سابق سیکریٹری داخلہ جناب ایم۔ اے۔ کے چوہدری اپنی کتاب "مارشل لاء کا سیاسی انداز" میں لکھتے ہیں کہ:۔

" اگلا دور، جو جنرل آغا محمدؔ یحییٰ خان کا مارشل لاء تھا اس کو بھی امریکی پشت پناہی حاصل تھی۔ معاشی امداد نے یحییٰ خان کی حکومت کو استحکام بخشا۔ اور ایک تیسرے ملک کی وساطت سے فوجی امداد بھی جاری ہو گئی۔ جبکہ یحییٰ نے بھی امریکہ سے اپنی وفاداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جس کی واضح مثال یہ ہے کہ ایک موقع پر اس نے امریکہ اور چین کے درمیان براہِ راست خفیہ گفت و شنید کا آغاز کرانے میں ذاتی کردار ادا کیا۔ اس پیشرفت سے امریکی انتظامیہ کی نظر میں یحییٰ خان کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی۔ لیکن جب ۱۹۷۱ء میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ ہوئی تو امریکہ نے ایک بار پھر اپنا سابقہ کردار دہرایا۔ ۲ دسمبر ۱۹۷۱ء

کو پاکستان نے باقاعدہ طور پر امریکہ سے کئے ہوئے معاہدوں کے تحت مدد مانگی اور خاص طور پر اُس شق کا حوالہ بھی دیا جس میں کہ ہندوستان کی طرف سے حملے کی صورت میں امریکہ پاکستان کی امداد کا پابند تھا۔"

" لیکن وہی "ڈھاک کے تین پات" امریکہ نے نہ پاکستان کی مدد کرنا تھی نہ کی۔ دراصل وہ کسی بھی قیمت پر ہندوستان کے ساتھ تعلقات پر ذراسی خراش کا بھی متحمّل ہونا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی شائد کبھی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ نے یہ ضرور کیا کہ وزیرِاعظم بھارت مسز اندرا گاندھی سے اپیل کی کہ وہ مغربی پاکستان پر حملہ نہ کریں۔"

پاکستان کے متعلق امریکی پالیسی آج بھی وہی ہے جو شروع دن سے تھی یعنی :۔

(۱) پاکستان میں آمریت کو مستحکم کیا جائے۔
(۲) پاکستان کے جمہوری اداروں کو تباہ کیا جائے اور
(۳) پاکستان میں ہندوستان کی برتری کا احساس پیدا کیا جائے۔

یہ اسی پالیسی کا شاخسانہ تھا کہ پاکستان میں جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کی حکومت کا تختہ الٹ کر جنرل ضیاء الحق کو اسلام کا داعی بنا کر قوم پر عذابِ الٰہی کی صورت میں مسلّط کر دیا گیا۔ نیز بعض ایسے شواہد بھی ملتے ہیں کہ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ کو پاکستان کے ٹکڑے کرنے میں گہری دلچسپی تھی۔ امریکی پالیسی سازوں کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان، مغربی بنگال، سکّم، بھوٹان اور ناگالینڈ وغیرہ کو ملا کر "ریاستہائے متحدہ بنگال" کے نام سے ایک نئی ریاست تشکیل دی جائے۔ اس سلسلے میں جناب محمد عباس علی نے اپنی کتاب "دی سالویشن آف پاکستان" میں اس ریاست کا نقشہ بھی شائع کیا ہے جب کہ پاکستان کے ایک سابق گورنر جنرل

اور وزیرِ اعظم جناب خواجہ ناظم الدین کا نومبر ۱۹۷۱ء کے شمارے اُردو ڈائجسٹ میں ایک بیان شائع ہوا تھا۔ جس میں موصوف نے کہا تھا کہ امریکی سفیر نے ان سے رابطہ قائم کر کے انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ آپ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے لیے کام کریں لیکن خواجہ صاحب نے اس امریکی تجویز کو مسترد کر دیا تھا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں امریکہ نے جن وجوہات کی بناء پر پاکستان کی مدد کرنے سے گریز کیا تھا ان میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ امریکہ پاکستان کو توڑنا چاہتا تھا۔

(۱) وَن یونٹ کا خاتمہ

جنرل یحییٰ خان نے مسندِ اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد سیاستدانوں سے مذاکرات کئے اور انھیں یقین دلایا کہ عام انتخابات جلد منعقد کرائے جائیں گے۔ ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو یحییٰ خان نے ایک اعلان کے ذریعے وَن یونٹ توڑ کر مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو بحال کر دیا۔ نیز الیکشن پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ حکومت نے آئندہ انتخابات " ایک آدمی ایک ووٹ" کی بنیاد پر منعقد کرانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مشرقی پاکستان آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا صوبہ تھا۔ چنانچہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان قومی اسمبلی میں توازن برقرار رکھنے کے لیے مساوات کا اصول اختیار کیا گیا تھا۔ یحییٰ خان نے یہ دونوں فیصلے شیخ مجیب الرحمٰن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کئے تھے۔ کیونکہ ایوبی دور کی گول میز کانفرنس کو ناکام بنانے میں شیخ مجیب الرحمٰن نے یحییٰ خان کا ساتھ دیا تھا۔

مغربی پاکستان میں ان دونوں فیصلوں پر ناراضگی کا کھلم کھلا اظہار کیا گیا۔ یحییٰ خان نے شیخ مجیب الرحمٰن کو خوش کرنے کے لیے مشرقی پاکستان کو مرکزی

ملازمتوں میں مساوی نمائندگی دینے کا اعلان بھی کر دیا۔ مگر اس اعلان سے خود یحییٰ خان کو الٹا نقصان اٹھانا پڑا۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کے علاقائی سیاستدانوں نے اسے ناکافی قرار دیتے ہوئے مطالبہ کر دیا کہ انھیں مرکزی ملازمتوں میں آبادی کی بنیاد پر نمائندگی دی جائے۔ لیکن اس مطالبے کو پورا کرنا یحییٰ خان کے بس کی بات نہ تھی لہٰذا بنگالیوں کو خوش کرنے کی پالیسی کو بدل دیا گیا۔

(۲) ایل۔ایف۔او کا نفاذ

یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو یحییٰ خان نے سیاسی سرگرمیوں پر سے پابندیاں اٹھا لیں اور سیاسی جماعتوں کو آئندہ انتخابات میں حصہ لینے اور انتخابی مہم چلانے کی اجازت دے دی۔ ۳۰ مارچ کو یحییٰ خان نے "لیگل فریم ورک آرڈر (ایل۔ایف۔او) جاری کیا۔ جس کے اہم نکات حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) قومی اسمبلی ۳۱۳ اراکین پر مشتمل ہوگی۔ جس میں ۱۳ نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہونگی۔ مشرقی پاکستان کے لیے ۱۶۹ نشستیں مخصوص کی گئیں۔ جن میں سے سات نشستیں خواتین کی بھی تھیں۔

(۲) تمام نشستوں پر انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں گے۔

(۳) آئین میں مندرجہ ذیل اصولوں کی تصریح کی جائے گی۔

i۔ پاکستان کا طرزِ حکومت وفاقی ہوگا اور یہ ایک اسلامی جمہوریہ ہوگا۔

ii۔ اسلامی نظریہ کو تحفّظ دیا جائے گا۔

iii۔ سربراہِ مملکت لازمی طور پر مسلمان ہوگا۔

iv۔ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی پاسداری کی ضمانت دی جائے گی۔

v۔ وفاقی اور صوبائی حکومتوں میں اختیارات تقسیم کرتے وقت صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں گے۔ تاہم وفاقی حکومت کو وہ

تمام اختیارات حاصل ہوں گے جو ملک کی آزادی اور علاقائی سالمیت کے تحفّظ کے لیے ضروری ہیں۔

ہمارے ملک کے دونوں حصّوں کے درمیان تفاوت کے تمام مظاہر ایک متعیّنہ مدّت میں ختم کر دیئے جائیں گے۔

(۴) ۱۲۰ دنوں کے اندر آئین تیار کیا جائے گا۔ بصورتِ دیگر قومی اسمبلی کو کالعدم قرار دے دیا جائے گا۔

(۵) صدر کو قومی اسمبلی کے منظور شدہ آئین کی توثیق کرنے، اُسے مسترد کرنے یا اس میں ترمیم کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

نیز قومی اسمبلی میں صوبوں کی نمائندگی کچھ اس طرح تھی۔

مشرقی پاکستان ـــ ۱۶۲ عام نشستیں ـــ ۷ نشستیں خواتین کے لیے۔
پنجاب ـــ ۸۲ عام نشستیں ـــ ۳ نشستیں خواتین کے لیے
سندھ ـــ ۲۷ عام نشستیں ـــ ۱ نشست خواتین کے لیے
بلوچستان ـــ ۴ عام نشستیں ـــ ۱ نشست خواتین کے لیے
شمال مغربی سرحدی صوبہ ـــ ۱۸ عام نشستیں ـــ ۱ نشست خواتین کے لیے

دراصل "ایل۔ ایف۔ او" کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ اس میں آئینی مسوّدہ منظور کرنے کے لیے ارکان کی تعداد مقرّر نہیں کی گئی تھی علاوہ ازیں اس میں ایک اہم نقص یہ بھی تھا کہ آئین کی منظوری کو صدر کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ گویا عملاً آئین کی منظوری قومی اسمبلی کے دائرۂ اختیار سے ہی خارج کر دی گئی تھی۔ اس طرح قومی اسمبلی کی تمام تر کارروائی محض سعیٔ لاحاصل قرار پاتی تھی۔ "ایل۔ الف۔ او" کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے ہفت روزہ "ہالیڈے" نے اپنی اشاعت ۱۵ اپریل ۱۹۷۰ء میں اس پر بڑا دلچسپ تبصرہ کیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ:۔

"ایل۔ ایف۔ او، ایک ایسا معمّہ ہے جس کے حل کے لیے تمام دنیا کے قانون دانوں کو ابد تک سر جوڑ کر بیٹھنا ہوگا۔"

اس پر مستزاد یہ کہ یحییٰ خان کے متضاد بیانات نے قوم کو عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ انہوں نے ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء کو اپنے قوم سے خطاب میں کہا کہ :۔

"اگر قومی اسمبلی مقررہ مدّت میں آئین تیار نہ کر سکی تو نئے انتخابات کرائے جائیں گے۔ یہ نہ بتایا گیا کہ اگر دوسری اسمبلی بھی آئین نہ بنا سکی تو پھر کیا کیا جائے گا۔ اس طرح ۳ دسمبر ۱۹۷۰ء کو یحییٰ خان نے یہ دھمکی دی کہ اگر آئین تیار نہ ہو سکا تو مارشل لا جاری رہے گا۔ لیکن کب تک اُسے بھی صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ یعنی "ان کی زندگی یا قیامت تک"۔

(۳) ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات

بالآخر یحییٰ خان نے "لیگل فریم ورک آرڈر" کے تحت ملک میں عام انتخابات منعقد کرانے کے لیے ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کی تاریخ مقرر کر دی۔ لیکن مشرقی پاکستان میں سیلاب کی وجہ سے یہ عام انتخابات ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء کو منعقد کرائے جا سکے۔ ان انتخابات میں ملک کی ۲۵ سیاسی جماعتوں نے حصّہ لیا۔ انتخابات کے نتائج حکومت اور سیاسی جماعتوں کے لیے قطعاً غیر متوقع تھے۔ اس لیے کہ مشرقی پاکستان کی ۱۶۹ میں سے ۱۶۷ نشستیں عوامی لیگ نے جیت لیں۔ جبکہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کی ۱۴۴ میں سے ۸۶ نشستیں پاکستان پیپلز پارٹی نے حاصل کر لیں۔ صوبائی سطح پر عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں مکمل اکثریت حاصل کر لی۔ جبکہ پنجاب اور صوبہ سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی کو واضح کامیابی حاصل ہو گئی۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں خان عبدالولی خان کی نیشنل عوامی پارٹی اور مولانا مفتی محمود کی جمعیت علمائے اسلام کو اکثریت

حاصل ہوگئی۔ یہ تو تھے وہ انتخابی نتائج جنہوں نے فوجی آمر یحییٰ خان اور تمام دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ حقیقتاً یہ نتائج عالمی سطح پر بھی ایک حیران کن فیصلہ ثابت ہوئے جن کے اثرات یقیناً عالمی سیاست پر بھی پڑنا لازمی اور فطری تھے۔

(۴) یحییٰ خان کا منصوبہ

یحییٰ خان اپنے پیشرو فوجی ڈکٹیٹر ایوب خان کا حشر دیکھ چکے تھے۔ ایوب خان نے آمریت کا لبادہ اتار کر ایک سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کر کے سیاسی انداز میں حکومت چلانے کی کوشش کی جو سعیٔ لا حاصل ثابت ہوئی جب کہ یحییٰ خان نے اس کے برعکس راستہ اختیار کیا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ انتخابات کے ذریعے حکومت، سیاست دانوں کے حوالے کی جائے۔ پھر انھیں آپس میں ٹکرا کر بدنام کیا جائے اور اس طرح اپنے لیے مستقل اور دیرپا اقتدار اعلیٰ پر قابض رہنے کا بندوبست کیا جائے۔ لیکن اسے یحییٰ خان کی بدنصیبی کہیئے کہ وہ اپنے اس منصوبے میں ناکام رہے۔ البتہ ان کے جانشین ایک اور فوجی آمر جنرل ضیاء الحق نے اس منصوبے کو اپنا کر خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی۔ اور وہ گیارہ سال سے زیادہ عرصے اپنی زندگی کے آخری سانس تک اس ملک و قوم کی قسمت سے کھیلتے رہے۔

یحییٰ خان نے اپنے پروگرام کے مطابق مشرقی پاکستان میں مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کو شیخ مجیب الرحمٰن کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مولانا بھاشانی کو لاکھوں روپے کی مالی امداد کے علاوہ ہر قسم کی سہولت بھی فراہم کی۔ تاکہ مجیب الرحمٰن کا زور توڑا جا سکے۔ یہ تمام تر کاروائی مسٹر این اے رضوی ڈائریکٹر انٹیلی جینس بیورو کی معرفت عمل میں لائی گئی۔ جب کہ مغربی پاکستان میں

اس کام کے لیے جنرل عمر کو استعمال کیا گیا۔ جنرل عمر نے بڑے بڑے صنعت کاروں اور سرمایہ داروں سے لاکھوں روپے اکٹھے کر کے خان عبدالقیوم خان کو دیئے۔ یحییٰ خان نے انتہائی کوشش کی کہ مسلم لیگ کو خان عبدالقیوم خان کی سربراہی میں متحد کر دیا جائے کیونکہ مسلم لیگ حسب روایت مختلف حصّوں میں بٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے مختلف حصّوں پر مختلف طالع آزما جُغادریوں کا قبضہ تھا۔ یحییٰ خان کو اپنے اس مقصد میں کامیابی نصیب نہ ہو سکی اور وہ مسلم لیگ کے مُردہ گھوڑے میں جان ڈالنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

یحییٰ خان کو جناب ذوالفقار علی بھٹّو پر اعتماد نہیں تھا اس لیے انہوں نے کوشش کی کہ مغربی پاکستان میں جناب ذوالفقار علی بھٹّو کو اکثرت حاصل نہ کرنے دی جائے۔ یحییٰ خان کے مشیروں نے انہیں مطمئن کر دیا تھا کہ پاکستان کی کوئی بھی سیاسی جماعت ملکی سطح پر مکمل اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی۔ اسطرح تمام سیاسی جماعتیں یحییٰ خان اور فوجی جنتا کے سامنے بے بس اور مجبور ہو کر رہ جائیں گی اور یہی وہ راہِ نجات تھی جس کے ذریعے یحییٰ خان طویل عرصے تک مسندِ اقتدار پر قابض رہیں گے۔

ہنری کسنجر اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "مجھے یحییٰ خان سے یہ پوچھنے کا موقع ملا کہ الیکشن کے بعد صدر کے اختیارات کیا ہوں گے۔؟ یحییٰ خان نہایت مطمئن اور پُر اعتماد تھا۔ اسے امیدِ واثق تھی کہ ملک کے دونوں حصّوں میں بہت سی پارٹیوں کے منتخب نمائندے اسمبلی میں آئیں گے اور آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ صدر ہی ان کے درمیان ثالث ہوگا۔ لٰہذا پاکستان کی سیاست میں حرفِ آخر صدر ہی ہوگا"

یحییٰ خان نے اپنے منصوبے کو کامیابی کا عملی جامہ پہنانے کے لیے

تقریباً تین کروڑ روپے اکٹھے کئے تھے۔ یہ رقم مختلف بنکوں میں رکھی گئی تھی۔ یحییٰ خان کے زوال کے بعد جناب ذوالفقار علی بھٹو نے تحقیقات کرائی تو این۔ اے۔ رضوی ڈائریکٹر انٹیلی جینس بیورو نے کوئی تین لاکھ روپے واپس کئے۔ اسی طرح جنرل عمر نے بھی کچھ رقم واپس کر دی تھی۔

حقیقتاً انتخابی نتائج نے جنرل یحییٰ خان کی بساط الٹ کر رکھ دی تھی اور ان کے اقتدار کے لیے سنگین خطرات پیدا کر دیئے تھے۔ اب وہ اپنے اقتدار کی بقا کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

(۵) انتخابی نتائج کی اہمیت

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات اور انتخابی نتائج نہ صرف پاکستان بلکہ پوری اسلامی دنیا کے لیے بالخصوص انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ پاکستان کے لیے تو یہ انتخابات اس لیے بھی اہم تھے کہ یہ متحدہ پاکستان کے پہلے اور آخری انتخابات تھے۔ ان کی اہمیت اس وجہ سے بھی تھی کہ ان ہی انتخابات کے ذریعے اسلامی دنیا میں ایسے انقلابی اور ترقی پسندانہ سیاسی رجحانات نے جنم لیا جو اسلامی افکار کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(۶) اِسلامی سوشلزم

پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پوری دنیا اور بالخصوص عالمِ اسلام کو ایک نئے سیاسی فلسفے سے رُوشناس کرایا۔ عمرانی علوم میں اس نظریے کو "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح سے متعارف کرایا گیا ہے۔ اس نظریے کی بنیاد چار زرّیں اصولوں پر استوار کی گئی یعنی :۔

(۱) اسلام ہمارا دین ہے۔

(۲) جمہوریت ہماری سیاست ہے۔

(۳) سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ اور

(۴) طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ نے کمالِ تدبّر، تفکّر اور دانشمندی سے دین اور دنیا کے حسین امتزاج کو اپنے نظامِ فکر میں سمو دیا۔ اسلامی سوشلزم ایک ایسا عظیم انقلابی فلسفہ ہے جو اسلام کے فکری، عمرانی، سیاسی، سماجی اور معاشی نظریات کا نچوڑ ہے۔ اور جس کی بنیادوں پر مستقبل قریب میں اسلامی دنیا کی نشاۃ ثانیہ کی ایک شاندار عمارت تعمیر کی جائے گی۔ وہ دن دُور نہیں جب پوری اسلامی دنیا اپنی تعمیر و ترّقی کے لیے "اسلامی سوشلزم" کو ایک "نظامِ حیات" کے طور پر اپنائے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ نظامِ فکر خود پاکستان میں کیوں ناکام ہو گیا۔ تو اس کا جواب نہایت صاف اور سیدھا سا یہ ہے کہ:۔

(۱) پاکستانی معاشرہ جاگیرداروں، وڈیروں، مُلّاؤں اور آمروں کی سخت گرفت میں ہے جبکہ طبقاتی جدّوجہد ابتدائی مراحل میں ہے۔ ترّقی پسند نظریات کی آبیاری کا آغاز ہے اس لیے کوئی بھی انقلابی فلسفہ پاکستان میں اس وقت تک قابلِ عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ معروضی حالات میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آتی۔ اس حقیقت سے قطعی طور پر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ ان حقائق سے بخوبی آگاہ تھے۔ اسی لیے انہوں نے پاکستانی معاشرے میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی کوششیں کی تھیں۔ مثلاً انہوں نے پیداوار پر جاگیرداروں کی گرفت ڈھیلی کرنے کے لیے زرعی اصلاحات نافذ کیں۔ مزدوروں کے حالات بہتر بنائے۔ اور سرمائے کے ارتکاز کی روک تھام کے لیے سوشل سیکیورٹی سسٹم قائم کیا اور دیگر قوانین کے ذریعے مزدوروں کے حقوق تسلیم کرانے کی کامیاب کوششیں کر

کے محنت کش طبقوں کی حوصلہ افزائی کی۔

(۲) اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ انقلابی فلسفہ ہمیشہ انقلابی جماعتیں ہی نافذ کرتی ہیں۔ جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ اس میدان میں تنہا تھے اور یہی ان کی بدنصیبی تھی کہ اس انقلابی جماعت میں مولانا کوثر نیازی، غلام مصطفےٰ کھر، نواب صادق حسین قریشی اور غلام مصطفےٰ جتوئی جیسے رجعت پسند افراد مکمل طور پر چھائے ہوئے تھے۔ یقیناً جو انقلابی جماعت ایسے افراد پر مشتمل ہو گی وہ انقلابی تحریک کو ڈبو کر رکھ دے گی۔

(۳) یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ امریکی سامراج یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا کہ ایشیاء کا کوئی مسلمان اور وہ بھی ترقی پذیر ملک انقلاب کی راہ اختیار کر کے اس کی گرفت سے آزادی حاصل کرلے۔ چنانچہ امریکہ کے تخریب کار ادارے "سی، آئی، اے" نے پاکستان کی رجعت پسند اور انقلاب دشمن سیاسی جماعتوں اور جنرل ضیاء الحق جیسے ننگِ دین، ننگِ ملت اور ننگِ وطن جرنیل کے تعاون سے نہ صرف یہ کہ ذوالفقار علی بھٹوؒ کی حکومت کا تختہ الٹ کر انھیں تختۂ دار پر لٹکا دیا بلکہ ان کی تمام اصلاحات پر بھی پانی پھیر دیا۔ امریکہ نے اپنے اس رجعت پسندانہ اقدام کے بعد یقیناً وقتی طور پر اطمینان و سکون کا سانس لیا ہوگا لیکن انقلاب کی راہ پر چل نکلنے والے ایکبار اگر اس راہ پر گامزن ہو جائیں تو انھیں دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت آگے بڑھنے اور اپنے مقاصد کے حصول میں کامیابی حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں ان کٹھن راہوں میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے اور ناکامیاں بھی ان کا پیچھا اس آسانی سے نہیں چھوڑتیں۔ تاریخِ عالم سے یہ ثابت ہے کہ انقلابی لوگوں کو ان کی ناکامیاں اور مصائب انہیں اپنی منزل تک پہنچنے سے ہرگز روکنے میں کامیاب ثابت نہیں ہوتیں۔

(۷) ذوالفقار علی بھٹو کی انتخابی مہم

جنوری ۱۹۷۰ء میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تھا۔ دراصل یہ انتخابی نہیں بلکہ ایک طرح سے "انقلابی مہم" تھی۔ مولانا محمد علی جوہر کے اس شعر کے مصداق:۔

اذان کعبے میں دی ناقوس دیر میں پھونکا
کہاں کہاں تیرا عاشق تجھے پکار آیا

جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں، چھوٹے سے چھوٹے دیہاتوں، محلوں، گلی کوچوں، غرضیکہ ملک کے گوشے گوشے میں اپنا پیغام انقلاب پہنچایا اور قوم کو یہ سمجھانے اور تبلانے کی کوشش کی کہ ان کی تمام مشکلات و مصائب کا حل معاشی مساوات اور سماجی انصاف کے عملی نفاذ میں ہی ممکن ہے۔ شہید کے پیغام کی صدائے بازگشت ہنوز ملک کے کونے کونے سے آج بھی سنائی دیتی ہے۔ آپ نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو قوم سے اپنے پہلے خطاب میں فرمایا کہ:۔

"گزشتہ چوبیس برسوں سے پاکستان میں ایک عام آدمی کو کوئی تحفظ نہیں دیا گیا۔ اس کی عزت نفس غیر محفوظ رہی ہے، ایک عام آدمی سے میری مراد یہاں کے غریب، مزدور، کسان اور طلبہ ہیں کہ جن پر یہ ظلم ہوتا چلا آیا ہے، کیا عوام کی اکثریت اس ملک کی تقدیر کی مالک اسی بات کی مستحق ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، اس ظلم و ناانصافی جبر و تشدد اور معاشی و معاشرتی ناہمواری کا خاتمہ بہرحال ہونا ہے اور اسے ہم ہی کو کرنا ہے، میری انتہائی کوشش اور دیرینہ خواہش بھی یہی ہے کہ عوام خوشحالی کی زندگی گزاریں، عالمی سطح پر ان کی پذیرائی ہو، وہ اس ملک میں عزت اور شرافت، وقار اور تمکنت اور آسودگی و آزادی کے ساتھ رہ سکیں، جب

تک وہ یہ سب کچھ پا نہیں لیتے، مجھے سکھ اور چین سے بیٹھنے اور آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ البتہ میں عوام کو خوشحالی کی راہ پر، ان کے تعاون کے بغیر نہیں ڈال سکتا۔ یہ مقصدِ اعلیٰ مجھے آپ کو، ہم سب کو مل کر پانا ہے۔ یقین کیجئے آپ کے بغیر یا آپ سے الگ میری اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ ہر فرد کی عزت ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی کو سفارش کے ذریعے انصاف ملے۔ میں کسی کی سفارش قبول نہیں کروں گا۔ میں اپنے کسی رشتہ دار کو اپنے ساتھ تعلق نکالنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ میرا کسی سے کوئی خاندانی تعلق نہیں۔ میرا خاندان میرے عوام ہیں۔ پاکستان کے عوام میرے بچے ہیں۔

میرا یقین ہے کہ آپ کی مدد سے میں ہمالیہ بھی سر کر لوں گا۔ لیکن آپ کے تعاون کے بغیر میں کچھ بھی نہیں۔ میں کسی توپ یا بندوق کے سہارے نہیں ہوں۔ میں صرف آپ کے دلوں میں سوار ہوں۔ میں آپ کو دھوکہ نہیں دوں گا۔ میں ہمیشہ عوام کے ساتھ رہوں گا۔"

آپ نے ۴ جنوری ۱۹۷۰ء کو نشتر پارک کراچی کے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے اپنے جیالے فرزندانِ ملت سے فرمایا کہ:۔

"ہم سرمایہ داروں اور ان کے گماشتوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ عوام کی فتح آخری ہوگی، سرمایہ داروں کے مخصوص اقلیتی ٹولے اور ان کے حواریوں سے عوام کی جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ یہ ٹولہ اپنا جابرانہ تسلط کھو نہیں بیٹھتا۔ یقین کیجئے بالآخر فتح عوام کی ہوگی عوامی فتح کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔"

اسی طرح آپ نے یکم مارچ ۱۹۷۰ء کو گجرات کے عظیم الشان جلسۂ عام سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:۔

"آج ملک کے اندرونی و بیرونی حالات کیا ہیں، یہاں کے عوام کی حالتِ زار پہ اوروں کو بھی رحم آتا ہے۔ ملک ہر طرح سے کمزور ہے۔ دراصل ہمارے ملک کو فوجی ٹولے نے میدانِ جنگ بنا کر تباہ کیا اور یہاں کی عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح کچلنے اور انہیں قیدی بنا کر رکھنے کی کوشش کی گئی۔ جس ملک کو عوام نے قربانیاں دیکر حاصل کیا اسی ملک کے عوام کی بہتری کے لیے تو کیا کیا جاتا البتہ انہیں تختۂ مشق بنایا گیا۔ ان کے نام پر ان کا اور ان کے ملک کی تقدیر کا سودا کیا گیا۔ آج پاکستان کے عوام اپنے ملک میں انگریز کی غلامی کے دور سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ ملک کو اندرونی اور بیرونی یلغاروں سے بچانے اور عوام کو خوشحالی کی راہ پر ڈال کر زندہ قوموں کی طرح پروان چڑھانے کے لیے ازحد ضروری ہے کہ عوام کی حقیقی ترجمان ایک جماعت قائم کی جائے جو اُن ہی کے نمائندوں پر مشتمل ہو، انہی کے لیے کام کرے اور انہی کو ملک کی تقدیر کا مالک بنایا جائے۔ ایسی جماعت کی جیت ان کی جیت اور اس کی شکست ان کی شکست ہو گی۔ یہ جماعت صرف پاکستان پیپلز پارٹی ہی ہو سکتی ہے۔ اگر عوام کی جماعت کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو میں عوام کے ساتھ اسے برداشت کروں گا اور وہ جس راہ پر چلیں گے میں بھی اسی راہ پر ان کے ساتھ ہوں گا۔ ایک بات یاد رکھیں: پچھلے ۲۳ سالوں سے کسی نے بھی عوام کے مفادات کی بات نہیں کی۔"

جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کی آواز درحقیقت قوم کے دُکھے ہوئے دلوں کی آواز تھی۔ جس کا حقیقی و منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ بھٹوؒ صاحب کے پیغام کو توقعات سے کہیں زیادہ پذیرائی نصیب ہوئی۔

جب ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں ہر طرف آگ و خون کی ہولی کھیلی

جارہی تھی اور پورا صوبہ خانہ جنگی کے بلند شعلوں میں جل رہا تھا تو بھٹو صاحب کے حساس دل نے قوم کے نام ۲۹ ستمبر ۱۹۷۱ء کو ایک پیغام جاری کیا جس میں آپ نے فرمایا :۔

" اے لوگو ! ظلم کی اس لمبی رات کو ہمیشہ کے اُجالے میں بدل ڈالو۔ بے یقینی کی اس صورتحال کو آخر یقین میں تبدیل ہونا ہے۔ آپ کو ظلم تشدد کے خلاف آوازِ حق بلند رکھنی چاہیئے، آپ کی کوششوں سے، طوفانوں کے یہ ریلے، سچائی کا قحط، یہ جمود، یہ سقوط سب آنے والے سال کی برق میں جل کے خاک ہو جائے گا۔ غور سے سن لیں، اگر جمہوری راہ آج اپنا راستہ ہموار نہ کر سکی اور اپنی بنیادیں مضبوط نہ کر پائی تو خدا گواہ ہے کہ آمریت اور ظالم غیر جمہوری قوتیں ہمارا مقدر بن کے رہ جائیں گی، خدا نہ کرے یہ حالات پیدا ہوں۔ مگر ان کے پیدا ہونے کی صورت میں دو باتیں نظر آتی ہیں۔ اوّل یہ کہ عوام خاموش تماشائی بنے گھروں میں مقیّد ہو جائیں اور فوجی ان کے ناخدا بن جائیں اور ملک کو داؤ پہ لگا دیا جائے، اور دوسری بات یہ کہ جمہوریت کی بحالی اور سامراجیت، سرمایہ داری اور عوام دشمنی کا خاتمہ کرنے کے لیے عوام ایک جان ہو کر کوشش کریں اور ان دیواروں کو ہمیشہ کے لیے گرا دیں۔ عوامی خواہشات کی ترجمانی کرتے ہوئے میں نے بارہا اعلان کیا ہے کہ بحالیٔ جمہوریت کی یہ جنگ کامیابی کی آخری منزل تک اسمبلیوں کے اندر اور اسمبلیوں کے باہر جاری رہے گی۔ اگر آپ ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے تو حالات اس موڑ پر آجائیں گے کہ عوامی جمہوری راہ اسمبلیوں کی بجائے بلوچستان کے بنجر میدانوں، سرحد کے پہاڑوں، سندھ کے ریگستانوں اور پنجاب کی زرخیز زمین کا رُخ کرے گی۔ میں کوئی ڈرانے دھمکانے والی بات نہیں کر رہا بلکہ حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ اسی بات پر منتج ہوتا ہے۔ ہماری

راہ کیا ہونی چاہیئے۔؟ اسے میں لینن کے الفاظ میں بیان کر کے فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں، لینن کہتا ہے۔

"انسان کی سب سے بڑی متاعِ خیر زندگی ہے اور یہ ایک بار چلے جانے پر کبھی لوٹ کر نہیں آیا کرتی لہٰذا اُسے یعنی انسان کو، ماضی کی عبرتناکی مدِنظر رکھتے ہوئے حال کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے مستقبل کی راہ متعیّن کرنی چاہیئے، اُسے جبر کے تحت تشدّد اور اذیتیں برداشت نہیں کرنا چاہیئں، زندگی اس طرح گزاری جائے کہ مرتے وقت یہ کہا جاسکے کہ ہم نے اِسے بنیادی مقصد کے حصول کی خاطر گزارا اور یہ مقصد انسانی آزادی ہے۔"

(۸) قائدِ عوام کی سیاست

عالمِ اسلام کی پوری اسلامی تاریخ کے میدانِ سیاست میں جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جناب بھٹوؒ اسلامی دنیا کے وہ عظیم سپوت ہیں۔ جنہیں دنیا کے نامور مدبرین، مفکّرین اور سیاستکاروں کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ جناب بھٹوؒ عالمی تاریخ پر نہ صرف یہ کہ گہری نظر رکھتے تھے بلکہ وہ تاریخی قوّتوں کے مدّو جذر کے ماہر نباّض بھی تھے۔ آپ نے سامراجی طاقتوں کے طریقۂ واردات میں نمایاں تبدیلی کی ایک مکمل اور زبردست تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:۔

"سامراج کا سب سے بڑا مقصد نوآبادیوں کے وسائل کا استحصال تھا سامراجی طاقتیں وسیع علاقوں کو توڑ تاڑ کر آپس میں تقسیم کر لیتیں۔ اور پھر محکوم قوم کے وسائل کو سلب کر لیتی تھیں۔ روائتی طرز کے سامراج کے خاتمے کے ساتھ صرف استحصال کے طریقِ کار میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ نوآبادیاتی طاقتوں کو اپنی نوآبادیات سے

قائدِ عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست کا ایک عوامی انداز تصویر میں آپ اپنے اقتدار کے آخری ایام میں امریکی سامراج کے وزیرِ خارجہ سائرس وانس کا خط عوام کو راجہ بازار کے عوامی اجتماع میں دکھا رہے ہیں۔

کنارہ کشی کے ساتھ ہی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کا اصول متروک ہو گیا اور اس کی بجائے نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مگر پرانے ہی مقصد کے حصول کے لیے "ملاؤ اور حکومت کرو" کا اصول بروئے کار آیا۔ بدلے ہوئے حالات میں طریقے کار کا بدلنا ضروری ہو گیا۔ ماضی میں ہر استعماری ریاست اپنے طور پر اپنی نو آبادیوں کا استحصال کرتی تھی۔ اب جبکہ ان طاقتوں نے اپنی مقبوضات کو چھوڑ دیا ہے، ان کے لیے لازم ہو گیا ہے کہ وہ ان سابقہ نو آبادیوں کے وسائل کو ملا کر ایسے اجتماع قائم کریں جن کا مجموعی استحصال زیادہ آسانی سے ہو سکے۔ جس طرح استحصال کرنے والوں کی حالت بدلی ہے اسی طرح استحصال کئے جانے والوں کی حالت کو بدلنا بھی ضروری ہو گیا ہے۔ پہلے سامراجی طاقتیں جُداگانہ طور پر اپنے استحصال کے کام پر نکلتی تھیں۔ اب جبکہ وہ اپنے مشترکہ مفاد کی خاطر متحد ہو گئی ہیں تو ان کے لیے یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ ان کی سابقہ نو آبادیاں اپنے وسائل ایسے اکٹھا کریں کہ ان کا استحصال سہولت سے ہو پائے۔ اس نئی صورتحال کا تقاضا ہے کہ سابق نو آبادیوں اور سابق نو آبادیاتی طاقتوں، دونوں طرح کے ملکوں میں حسبِ ضرورت انتظامات کیئے جائیں، تاکہ شرائطِ تجارت کو استحصال کے زیادہ موافق بنایا جا سکے۔ بڑی منڈیاں مغرب کے ترقی یافتہ ممالک کے لیے زیادہ فائدہ بخش شرائط پر درآمد و برآمد کے مواقع مہیّا کرتی ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ اشیاء کی کھپت اور وسائل کے زیادہ منظّم استحصال کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ وہ بین الاقوامی سطح پر بھاؤ گھٹانے بڑھانے کی سہولت پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے بہت سے فائدے ہیں جو زیادہ تر سابق نو آبادیاتی طاقتوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں "آزاد دنیا" کی سلامتی کے مفادات کی بہتر نگرانی ہوتی ہے۔ لیکن سروکار زیادہ تر اقتصادی استحصال ہی سے رہتا ہے۔ قدیم نو آبادیاتی نظام

کی طرف تحویل کا یہ ایک ناگزیر عمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہماری آزادی ایک موہوم سی شئے بن کر رہ جاتی ہے۔"

جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کے بیان کی صحت اور صداقت ایک عشرے کے عرصے میں ہی ثابت ہو چکی ہے۔ اب افغان مسئلے کا بہانہ بنا کر امریکہ نے ہمیں ایک طرف تو سوویت روس کے مدِمقابل لا کھڑا کیا اور پاکستان کو روس کے خلاف فرنٹ لائن بنا دیا ہے۔ تو دوسری طرف دفاعِ پاکستان کے بہانے وہ ہمارے وسائل کا بے رحمانہ استحصال کر رہا ہے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ نے عالمی سامراجی طاقتوں کے استحصال کا مقابلہ کرنے کے لیے ترقی پذیر ممالک کو مشورہ دیا کہ:۔

"ایسی قوم کے مقاصد کی تکمیل کا امکان اس طرح بڑھایا جا سکتا ہے کہ ایشیاء افریقہ، اور لاطینی امریکہ کی چھوٹی قومیں (جنھیں اجتماعاً "تیسری دنیا" کہا جاتا ہے) کہ اپنی اجتماعی آواز اور استقامت کا بالواسطہ دباؤ ڈالیں اور ایسی عالمی اور نیم عالمی طاقتوں کا سیاسی دباؤ اس کے ساتھ شامل ہو جن کے اغراض و مقاد کے لیے یہ موزوں ہو۔ ایسی طاقتوں کی حمایت کو جو مدد کر سکتی ہوں ترقی پذیر ممالک کی معاونت کے ساتھ ملا کر متعلقہ مملکت ایسے سازگار حالات پیدا کر سکتی ہے کہ عالمی طاقت کو لازماً اپنا مؤقف بدلنا پڑے۔ بڑی حد تک انہی بیرونی قوتوں کے جبر کے ذریعے متعلقہ ریاست نقاط اختلاف پر عالمی طاقت کے رویّے میں تبدیلی لا سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر چھوٹی ریاستوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ، ان کے موقف سے قطع نظر، اپنے متناقض مفادات پر گفت و شنید کا سلسلہ جاری رکھیں، اور جہاں تک ان کے بس میں ہو ان پر اثر ڈالنے کی کوشش کریں، مگر ایسے کہ وہ خود مداخلت اور الٹی میٹم کی حد تک نہ پھنس جائیں۔

سیاسی تصادم کے پہلوؤں کو ایک طرف رکھ کر کوئی چھوٹی قوم سوائے اس تنازعات کے باقی تمام معاملات میں عالمی طاقتوں کے ساتھ دوست اور دوستانہ تعلقات قائم رکھ سکتی ہے۔ اس طرح متعلقہ ریاست کے لیے ایسی عالمی طاقتوں سے جن کے مفادات اس کے اپنے مفادات کے ساتھ ہم آہنگ ہوں، بہتر تعلقات قائم رکھنے میں معقول گنجائش نکل سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ عالمی طاقتیں جن کے مفادات اس چھوٹی قوم کے مخالف ہوں اس کے ان عالمی طاقتوں کے ساتھ مخلصانہ تعلقات پر معترض نہیں ہو سکتیں جن کے ساتھ ان کے مفادات ہم آہنگ ہوں۔ نہ ہی اس وجہ سے اس بڑی طاقت کو جس کے ساتھ چھوٹی طاقت کے مفادات متصادم ہوں، اس کا جواز مل سکتا ہے کہ وہ اس کے معاملات میں مداخلت کرے یا اس کے قومی مفادات میں مخل ہو، کیونکہ حسبِ معمول تعلقات کے لیے کوئی مقدم شرائط نہیں رکھی جائیں گی۔"

جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ کی سیاسی بصیرت کا اندازہ صرف اس ایک مثال سے ہی بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جس میں آپ نے امریکہ اور چین کے تعلقات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "امریکہ اور چین کے تعلقات ہمیشہ کشیدہ نہیں رہ سکتے۔" ابھی آپ کی تحریر کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ امریکی وزیرِ خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر پاکستان کے راستے چین پہنچ گئے اور اس طرح باہمی تعلقات کو معمول کے مطابق بنا لیا۔ جناب بھٹوؔ کے الفاظ یہ تھے:۔

"اگرچہ عوامی جمہوریہ چین اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ ایک دوسرے کے زبردست حریف بن گئے ہیں اور ویتنام کی جنگ نے انھیں بین الاقوامی جنگ کے کنارے لا کھڑا کیا ہے، پھر بھی یہ فرض کر لینا چاہیئے کہ ان کے تعلقات میں ہمیشہ ہی ایسی شدید کشیدگی رہے گی۔ دوسری بڑی طاقتوں کی طرح

ریاست ہائے متحدہ کے اغراض بھی عالمی ہیں، لیکن اس کے اوّلین مفادات یورپ ہی سے وابستہ ہیں، جہاں اُسے سوویت یونین کے بنیادی مفادات کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ کے ساتھ چین کا سب سے بڑا تنازعہ، ویتنام کی جنگ کے علاوہ تائیوان کے مستقبل کا ہے۔ اس امر پر زیادہ بحث کا امکان نہیں کہ ریاست ہائے متحدہ کی سلامتی کے لیے جرمنی زیادہ اہم ہے یا تائیوان۔ اگر نوبت دونوں ملکوں میں سے ایک کے انتخاب یا سیاسی قوّت آزمائی تک پہنچ جائے تو یقیناً امریکہ جرمنی اور یورپ کے مستقبل کو ترجیح دے گا۔ صرف دفاع کے نقطۂ نگاہ سے تائیوان کا ہاتھ سے نکل جانا امریکہ کی سلامتی کے مفادات کو اتنے خطرے میں نہ ڈالے گا جتنا جرمنی کا چلا جانا۔ بحرالکاہل کے علاقے میں بعض ایشیائی مملکتوں میں ریاست ہائے متحدہ کو دفاعی سہولتوں کا ایک سلسلہ میسّر ہے۔ جس سے چین گھیرے میں ہے۔ اور امریکہ کو کئی ایسے جنگی اہمیت کے جزیروں پر بھی تسلّط حاصل ہے جو چین کے ساحل کے سامنے واقع ہیں۔"

(۹) عُلماء اور اسلامی سوشلزم

پاکستان کے رجعت پسند عناصر اور مذہبی علمائے نے "اسلامی سوشلزم" کے خلاف شدید ردِّعمل کا اظہار کیا۔ علماء کے ایک گروہ نے اسے کفر قرار دے دیا اور قوم کو ہر ممکن طریقے سے اس سے دُور رکھنے کی ناکام کوششیں کیں — جناب ذوالفقار علی بھٹّو اور علماء کے طرزِ فکر کو اس طرح سے واضح کیا جا سکتا ہے جو کسی بھی حقیقی اور فرضی چیز میں ہوتا ہے۔ بھٹّو صاحب کا فلسفہ ٹھوس مادّی، معاشی اور سیاسی بنیادوں پر استوار تھا جب کہ علماء کی ساری فصاحت و بلاغت مصنوعی، فرضی اور خیالی کہانیوں کے لیے ہی وقف تھی۔ نتیجتاً عُلماء کی تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں اور مغربی پاکستان کی حد تک جناب ذوالفقار علی بھٹّو

کو ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ انتخابی نتائج سے ثابت ہوگیا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ کا یہ مطالبہ:۔

"روٹی، کپڑا اور مکان ، مانگ رہا ہے ہر انسان"

بالکل جائز اور درست تھا۔ بھٹوؔ صاحب نے محنت کشوں اور پسماندہ طبقات کے لیے جن حقوق کا مطالبہ کیا تھا وہ ان کے طبعی تقاضوں اور فطری ضروریات کے عین مطابق تھے لیکن استحصالی طبقوں اور سرمایہ داروں کے مفادات سے متصادم تھے۔ اس لیے ان طبقوں نے جناب بھٹوؔ کی انقلابی تحریک کو ناکام بنانے کے لیے داخلی اور خارجی سطح پر سازشوں کا جال بچھا دیا اور بالآخر اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں کامیاب ہوگئے لیکن ہر صاحبِ نظر جانتا ہے کہ بھٹو صاحب کی تحریک وقت کی ایک ایسی آواز ہے جسے دبایا یا ختم نہیں کیا جاسکتا۔ بھٹوؔ صاحب کا سیاسی فلسفہ، ترقی پذیر ممالک اور اسلامی دنیا کے لیے حرفِ آخر ہے اور مستقبل قریب میں ان ممالک سے عوامی سطح پر جو بھی تحریک اُٹھے گی وہ اسی سرچشمۂ حیات سے قوّت، توانائی اور روشنی و رہنمائی حاصل کرے گی۔

(۱۰) شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات

مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے غیر معمولی اور واضح اکثریت حاصل کرکے دوسری تمام سیاسی جماعتوں کو عملاً غیر مؤثر بنا دیا تھا۔ مجیب الرحمٰن کی تحریک، بنگالی قوم پرستی میں تبدیل ہوچکی تھی اس لیے مشرقی پاکستان میں پاکستانی قومیت کا تصوّر پس منظر میں چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جناب بھٹوؔ کا اسلامی سوشلزم مشرقی پاکستان کے عوام کو متاثر نہ کرسکا۔ کیونکہ ان کی اوّلین ترجیح بنگالی قومیّت کو تسلیم کروانا تھا۔ جسے پاکستان کی مرکزی حکومت، ملک کی سلامتی اور یکجہتی کے لیے خطرناک تصوّر کرتی تھی۔ آخر کار

یہ کشمکش خانہ جنگی کی شکل اختیار کر گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک ٹوٹ گیا۔ اس طرح بنگلہ دیش نے مشرقی پاکستان کی خاکستر سے جنم لیا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات میں پوشیدہ رُوح، پاکستان کے علاوہ پوری اسلامی دنیا کے لیے نہایت سبق آموز ہے۔ اور اس کے بعض پہلو بھٹو صاحب کے اسلامی سوشلزم کے عین مطابق ہیں۔ مثال کے طور پر بھٹو صاحب کے فلسفے کا ایک اہم اُصول یہ ہے کہ "طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں"۔ گویا مملکت کا انتظام و انصرام عوام کی فلاح اور خواہش کے مطابق چلایا جائے۔ جمہوری نظامِ سیاست کی اصل رُوح بھی یہی اصول ہے۔ اور اسی اصول کی مطابقت میں برِصغیر ہند کی تقسیم اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ وہ ایک علاحدہ قوم ہیں وہ ہندو اکثریت کی بالادستی قبول نہیں کریں گے۔ اور اپنے نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے انھیں ایک علاحدہ وطن کی ضرورت ہے۔ برِصغیر کے مسلمانوں کا یہ مطالبہ بین الاقوامی سطح پر درست تسلیم کر لیا گیا اور برِصغیر کو تقسیم کر کے پاکستان بنا دیا گیا۔ یہی اصول شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات میں کار فرما تھا۔ اور مشرقی پاکستان کی بھاری اکثریت نے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ پھر اس کے بعد کسی بھی جرنیل، کسی بھی ٹوپچی یا اقلیت کی نمائندگی کرنے والی حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اکثریتی فیصلے کو مسترد کر کے اس پر اپنی مرضی مسلّط کرنے کی کوشش کرے۔ البتہ جمہوری نظامِ سیاست میں افہام و تفہیم کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں اور اقلیت رکھنے والے گروہوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اکثریتی گروپ کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کر کے اسے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے پر آمادہ کر لیں۔ یہ کارروائی باہمی گفت و شنید اور آمنے سامنے بیٹھ کر عمل میں لائی جاتی ہے۔ یہ مسئلہ بندوق

کی گولی یا توپ کے دہانے سے طے نہیں کیا جاسکتا۔

چنانچہ اسی اصول کے پیشِ نظر جناب ذوالفقار علی بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن سے چھ نکات پر مفاہمت کرنے کی کوشش کی تھی مگر بنگلہ قوم پرستی کے جنون نے شیخ مجیب الرحمٰن کے فکر و نظر کے دائروں کو سمیٹ کر بنگلہ دیش کی سرحدوں تک ہی محدود کر دیا تھا۔ لہٰذا بھٹو صاحب کی مساعی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔

(۱۱) چھ نکات کا حقیقی پس منظر

شیخ مجیب الرحمٰن کی تحریک بھی دراصل بنگالیوں کے زخم خوردہ دلوں کی دردناک آواز تھی چنانچہ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کا یہ شعر شیخ مجیب الرحمٰن کی حالت پر صادق آتا ہے۔

تھی کسی درماندہ راہرو کی صدائے دردناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

پاکستان کا قیام بلاشبہ مسلم لیگ کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ لیکن اس کا پہلا تاثر جو اقوامِ ہند پر قائم ہوا وہ انتہائی متضاد بلکہ متصادم تھا۔ مسلمانوں کا دل خوشی اور مسرت سے لبریز تھا۔ کیونکہ وہ علیحدہ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جب کہ ہندوؤں کے دلوں میں شکست خوردگی کا احساس غالب تھا۔ یہی وہ بنیادی تضاد تھا جو آج تک دونوں ممالک کے درمیان دوستی اور تعاون کی راہ میں حائل ہے۔ ہندوؤں نے روزِ اوّل سے ہی پاکستان اور مسلمانوں سے انتقام لینے کا عزم کر رکھا ہے۔ ادھر پاکستان اپنے ساتھ بے پناہ سیاسی، سماجی، انتظامی اور اقتصادی مسائل لے کر آیا۔ پاکستان کا سب سے بڑا تضاد اس کی جغرافیائی حیثیت تھی۔ پاکستان

جغرافیائی طور پر دو حصّوں پر مشتمل تھا اور دونوں حصّے ایک دوسرے سے ایک ہزار میل کے فاصلے پر واقع تھے۔ دونوں حصّوں کا درمیانی علاقہ دشمن کے پاس تھا۔ اس کے علاوہ دونوں حصّوں کے عوام صرف مذہب اور عقیدے کے اعتبار سے ہی ایک وحدت میں منسلک تھے۔ قومیّت کا دیگر کوئی عنصر بھی ثقافتی، لسانی اور نسلی اشتراک دونوں حصّوں کے عوام میں موجود نہیں تھا۔ مشرقی پاکستان کے سیاستدان عموماً دو حصّوں کے درمیان موجود جغرافیائی بُعد اور ثقافتی تضاد کی تشہیر کرتے رہتے تھے گویا قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی بنگالی قومیّت نے بھی سَر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی کے مشہور بنگالی رکن ابُوالمنصور احمد نے اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

" پاکستان بھی ایک عجیب ملک ہے اس کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زائد کا فاصلہ ہے۔ مذہب اور مشترکہ جدّوجہدِ آزادی کے سوا ان کے درمیان کوئی اور قدر مثلاً زبان، ثقافت غرضیکہ کچھ بھی مشترک نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں صوبوں میں وہ مشترکہ اقدار عنقا ہیں جن کی موجودگی کسی بھی قوم کی تشکیل کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔"

مسلم لیگ شائدان تضادات کا ادراک نہ کر سکی جو قیامِ پاکستان کے فوراً العبد اُبھر کر سامنے آنے والے تھے۔ جنہیں شاعر کی زبان نے اس طرح بیان کیا ہے:۔

ص گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نُما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

مسلم لیگ نے اس رجائیت کو بھرپُور انداز میں نمایاں کرنے کی کوشش کی

جو حصولِ پاکستان کے ساتھ وابستہ تھی لیکن ان مسائل کا کوئی تسلّی بخش حل نہ پیش کیا جو ملکی سلامتی کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ ان مسائل کا زیادہ تر تعلق آئینی، لسانی، مالی اور سیاسی معاملات سے تھا۔ جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے پاکستان کا آئین خصوصی توجّہ کا مستحق تھا۔ لیکن حکومت مضبوط مرکز کے نعرے تو بے شک لگاتی رہی لیکن دونوں حصّوں کے عوام کے لیے قابلِ قبول آئینی مسودہ تک مرتّب کرنے میں بری طرح ناکام رہی۔

زبان کا مسئلہ بھی لاینحل ہی رہا۔ مضبوط مرکز کے تصوّر سے مشرقی پاکستان میں محرومی کا احساس ابھرنا شروع ہو گیا۔ چنانچہ قیامِ پاکستان کے صرف چند ماہ بعد ہی یعنی مارچ ۱۹۴۸ء میں دستور ساز اسمبلی کے سامنے تقریر کرتے ہوئے بنگالی رکن مسٹر عزیز احمد نے کہا:۔

"محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ نظام میں مشرقی بنگال کو واقعتاً نظر انداز کیا جا رہا ہے۔" مسلم لیگ کا پاکستانی قومیّت کا تصوّر روحانی اور اخلاقی بنیادوں پر قائم تھا جو قومی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ چنانچہ اقتصادی، لسانی اور ثقافتی حیثیتوں نے رفتہ رفتہ اخلاقی اقدار پر غلبہ حاصل کر لیا۔

(۱۲) عوامی ردِّ عمل اگرچہ مشرقی پاکستان میں مسلمان اکثریت میں تھے لیکن صوبے کی معیشت پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران مسلمانوں کا خیال تھا کہ آزادی ان کے لیے خوشحالی لے کر آئے گی۔ لیکن آزادی کے بعد ان کا یہ خیال جو سراسر ایک خواب تھا شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ ہندوؤں کی کثیر آبادی نے اپنے تحفّظ کے لیے صوبے کی معیشت پر اپنی گرفت مضبوطی سے قائم رکھی اور مغربی پاکستان

کیخلاف نفرت کو ابھارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

فروری ۱۹۴۸ء میں مشرقی پاکستان سے ایک ہندو رکن ڈاکٹر درمہندر ناتھ دت نے دستور ساز اسمبلی میں ایک ترمیم پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ "بنگالی" کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ اس وقت تک اراکین اسمبلی کی زبان انگریزی یا اُردو تھی۔ وزیر اعظم خان لیاقت علی خان نے تحریک کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ اس ترمیم کا اصل مقصد پاکستان کے دونوں حصّوں کے درمیان تفرقہ ڈالنا ہے اور یہ کہ پاکستان کی قومی زبان اُردو ہوگی۔

یہ تکرار قومی سطح پر تنازع کی بنیاد بن گئی۔ بنگالیوں نے اعلان کر دیا کہ وہ بنگالی کے مقابلے میں اُردو زبان کو ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ طالبعلموں اور سیاستدانوں نے مرکزی حکومت کے خلاف تحریک چلا دی۔ خواجہ ناظم الدین صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں مسٹر محمّد علی جناح گورنر جنرل پاکستان صوبے کا دورہ کرنے والے تھے۔ چنانچہ خواجہ ناظم الدین نے اپنی پوزیشن مستحکم بنانے کے لیے طلباء کے مطالبات تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ طلباء کے مطالبات حسب ذیل تھے:۔

۱۔ "مشرقی پاکستان کا رواں اجلاس بنگالی کو مشرقی پاکستان کی سرکاری زبان اور صوبے میں تمام سطحوں پر ذریعہ تعلیم بنانے کی قرارداد منظور کرے
۲۔ اسمبلی مرکزی حکومت کو سفارش کرے گی کہ بنگالی کو ملک کی سرکاری زبانوں میں شامل کیا جائے۔
۳۔ تحریک کے دوران گرفتار ہونے والے تمام سیاسی قیدی رہا کئے جائیں۔
۴۔ تحریک کی حمایت اور خبریں شائع کرنے پر کلکتہ اور مشرقی بنگال کے اخباروں پر پابندی واپس لی جائے۔

۵۔ وزیرِ اعلیٰ ریڈیو پر اعلان کریں کہ یہ تحریک حُبّ وطن کے مقاصد اور جذبات کی ترجمان تھی۔

۶۔ وزیرِ اعلیٰ اپنا وہ بیان واپس لیں جس میں انہوں نے مظاہرین کو کیمونسٹ اور ملک دشمنوں کے ایجنٹ قرار دیا تھا۔"

۱۹۵۲ء کے اوائل میں مرکزی حکومت نے بنگالی زبان کے لیے عربی رسم الخط اختیار کرنے کا اعلان کیا اور لسانی مسئلہ ایک بار پھر زندہ ہو گیا۔ فروری ۱۹۵۲ء میں خواجہ ناظم الدین وزیرِ اعظم پاکستان کی حیثیت سے مشرقی پاکستان پہنچے اور ڈھاکہ میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی۔ ان کے اس اعلان نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور لسانی تحریک نے دوبارہ تقویت پکڑ لی اور ملک میں وسیع پیمانے پر ہڑتالیں اور احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ ۲۱ فروری ۱۹۵۲ء کو پولیس کی فائرنگ سے دو طالب علم ہلاک ہو گئے جس کے بعد امن و امان کی بحالی کے لیے فوج طلب کر لی گئی۔ ڈھاکہ میں ہلاک شدگان کے لیے شہید مینار تعمیر کیا گیا جو فی الواقع بنگلہ قوم پرستی کی خشتِ اوّلین تھی۔ بالآخر ۱۹۵۴ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے بنگالی زبان کو ایک قومی زبان کا درجہ دیدیا۔

وہ تمام مسائل جو آئین کے حوالے سے فوری توجہ کے مستحق تھے عدم توجہی کا شکار رہے۔ کیونکہ آئین سازی کا کام فی نفسہ معرضِ التوا میں پڑا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود قانون آزادیٔ ہند میں مناسب ترامیم کے ذریعے ان معاملات کو طے کیا جا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل مسائل کا حل تلاش کیا جانا بہت ضروری تھا۔

(۱) مرکزی حکومت اور دستور ساز اسمبلی میں صوبوں کی نمائندگی کا تناسب۔

(۲) مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں کے درمیان اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ۔

(۳) قومی زبان اور علاقائی زبانوں کا تعین۔

(۴) انتخابات کے طریقۂ کار کا تصفیہ۔

یہ ایک افسوناک حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کے پاس قیام پاکستان سے قبل ملک کے آئینی مسائل کو حل کرنے اور ملکی نظم ونسق چلانے کے لیے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ ڈاکٹر اقبال نے جس مسلم ریاست کا تصوّر پیش کیا تھا۔ وہ ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں پر مشتمل تھی۔ اس علاقے میں بسنے والے مسلمان مذہب کے علاوہ دیگر کئی رشتوں میں بھی منسلک تھے اور ان کے درمیان قومیت کا سب سے بڑا عنصر جغرافیائی وحدت تھی۔ لیکن ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان میں مسلم اکثریت کے علاقوں میں مسلم ریاستوں کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس لیے صوبۂ بنگال یا اس کے کچھ حصّے کا پاکستان میں شامل ہونا ناگزیر تھا۔ ان حالات میں مسلم لیگ کا فرض تھا کہ وہ ملک کا انتظام سنبھالنے کے لیے اور متوقع بنیادی مسائل حل کرنے کے لیے مناسب لائحہ عمل مرتّب کرتی لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اور تقسیمِ ملک کے ساتھ ہی بنیادی مسائل کے ساتھ ہی ہنگامی مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ لہٰذا ایک نوزائیدہ مملکت گھمبیر مسائل کی لپیٹ میں آگئی۔ اور اس کی تخلیق کے ساتھ ہی اس کی ٹوٹ پھوٹ کے آثار بھی نمایاں ہونے شروع ہوگئے۔ بقولِ مرزا غالب :-

ع میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برقِ خرمن کا ہے ، خونِ گرم دہقان کا

آئین کی غیر موجودگی میں علاقائیت کے زہر آلود رجحانات نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ مسٹر لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان نے ۸ نومبر ۱۹۵۰ء کو دستور ساز اسمبلی کے سامنے اپنے خطاب میں ان رجحانات کی نشاندہی کرتے ہوئے اپیل کی کہ صوبائیت کے رجحانات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے لیکن اس قسم کی تمام اپیلیں بے کار ثابت ہوئیں اور مشرقی پاکستان میں بنگلہ قوم پرستی نشوونما پاتی رہی۔ مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے فروری ۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ میں گرینڈ نیشنل کنونشن منعقد کیا گیا۔ اس کنونشن نے اپنی متبادل تجاویز مرتب کیں۔ جن میں مرکز کو صرف دفاع اور امورِ خارجہ کے محکمے تفویض کرنے کی سفارش کی گئی تھی اور مرکز کو صرف بعض مخصوص اشیاء پر ٹیکس لگانے کا اختیار دیا گیا تھا۔ یہ وہ بنیادی دستاویز ہے جس میں مشرقی پاکستان کے لیے مکمل صوبائی خود مختاری کے حصول کا عزم کیا گیا تھا۔ یہ وہ ارتقائی منازل تھیں جن سے گزرنے کے بعد بنگلہ قوم پرستی کی تحریک چھ نکات کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ چھ نکات کسی فوری یا اتفاقی حادثے کی پیداوار نہیں تھے بقول کسے۔

ع ایک جلنے کے سوا اور کوئی کیا جانے
حالتیں کتنی گزر جاتی ہیں پروانے پر

ان آئینی مسائل کے علاوہ کچھ دیگر عوامل بھی تھے جو بنگلہ قوم پرستی کو ہوا دے رہے تھے ان میں ایک اہم مسئلہ معیشت کا بھی تھا مشرقی پاکستان کی معیشت کا زیادہ تر دارومدار پٹ سن پر تھا جس کی تیاری اور برآمدگی کے مراکز کلکتہ میں واقع تھے۔ مشرقی پاکستان میں پٹ سن کا کوئی کارخانہ

نہیں تھا۔ ان حالات میں پٹ سن سے حاصل ہونے والی آمدنی میں کمی واقع ہو جانا بالکل ایک قدرتی بات تھی۔ بنگالیوں کو یہ رنج بھی تھا کہ ملک کے زرِ مبادلہ کی آمدنی کا ساٹھ سے اسّی فیصد تک پٹ سن کی برآمد سے حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اس کی بڑی مقدار مغربی پاکستان میں خرچ کی جاتی ہے۔

ان الزامات میں حقیقتاً صداقت بھی تھی۔ مثال کے طور پر ۴۸-۱۹۴۷ء اور ۶۰-۱۹۵۹ء کے دوران سرکاری شعبے میں مشرقی پاکستان میں ۲۷۵۰ ملین روپے خرچ کیے گئے۔ جبکہ اسی عرصے میں مغربی پاکستان میں ۸۰۱۷ ملین روپے خرچ کئے گئے تھے۔ نجی شعبے میں کُل ترقیاتی اخراجات کا بمشکل ۲۰٪ مشرقی پاکستان میں خرچ کیا گیا علاوہ ازیں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مرکز نے مشرقی پاکستان کی بجائے تمام صنعتیں مغربی پاکستان میں لگائیں۔ بیروزگاری، بھوک و افلاس اور قدرتی آفات وغیرہ نے مل کر مغربی پاکستان کے خلاف نفرت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہر چند کہ خواجہ ناظم الدین کا تعلق مشرقی پاکستان ہی سے تھا اور وہ مرکز میں اہم عہدوں پر فائز بھی رہے تھے لیکن انہوں نے بنگالیوں کے لیے کچھ بھی نہ کیا اور بقولِ مسٹر زیڈ اے سلہری "انہوں نے ملک کو افسوسناک طور پر تقسیم کر دیا"

محمد علی بوگرہ کو ان کا جانشیں بنایا گیا جو وہاں کے منتخب نمائندے بھی نہیں تھے۔ ملک کی پہلی دستور ساز اسمبلی ۷۹ اراکین پر مشتمل تھی۔ جن میں ۴۴ نشستیں بنگالیوں کے پاس تھیں۔ لیکن خواجہ ناظم الدین نے چھ نشستیں مغربی پاکستان کو دیکر بنگالیوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا۔ خواجہ صاحب کے اس ظالمانہ اقدام نے مشرقی پاکستان میں ناامیدی و مایوسی کو مزید جنم دیا۔ ۱۹۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں عام انتخابات کرائے گئے۔ حزبِ اختلاف

کی تمام جماعتوں نے مسلم لیگ کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا۔ اور ۲۱ نکات پر مشتمل "منشورِ آزادی" کو انتخابی منشور بنا کر پیش کیا۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ انتہائی ذلت آمیز شکست سے دوچار ہوئی۔ وزیرِاعلیٰ سمیت تمام صوبائی وزراء شکست کھا گئے۔ اور صوبے کی ۳۰۹ نشستوں میں سے صرف ۹ نشستیں ہی مسلم لیگ کو مل سکیں حزبِ اختلاف کے لیڈر مولوی اے، کے فضل الحق کی قیادت میں نئی حکومت قائم ہوئی۔ اس کے فوراً بعد پورے صوبے میں صنعتی بدامنی اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور بنگالیوں نے غیر بنگالیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ جن میں کئی افراد موت کی نیند سو گئے۔ جبکہ وزیرِاعلیٰ نے اخباری بیان دیتے ہوئے مکمل آزادی کو اپنے مسائل کا یقینی حل بتایا۔

اسی اثناء میں مولوی فضل الحق نے کلکتہ کا دورہ کیا۔ اور ایک استقبالیہ دعوت میں بھی شرکت کی۔ جس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا :۔

"ہمیں یقین ہے کہ ہم مشترکہ زبان و ثقافت کے رشتوں میں بندھے ہوئے دونوں بنگالوں کے درمیان قائم کی جانے والی مصنوعی حد بندیوں کو دور کر دیں گے۔"

مرکزی حکومت نے بنگالیوں کی ناراضگی دور کرنے اور ان کے مسائل کا حل تلاش کرنے کے بجائے طاقت کا سہارا لیا۔ اور صوبائی حکومت کو برطرف کر کے گورنر راج نافذ کر دیا۔ ساتھ ہی جنرل سکندر مرزا کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ مزید یہ کہ اے۔ کے۔ فضل الحق کو غدار قرار دے کر ان پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ ملک کو توڑنے کی سازشیں کر رہے تھے۔ دوسری طرف بنگالیوں نے گورنر راج کے نفاذ پر سخت ردِعمل کا اظہار کیا اور الزام لگایا کہ منتخب حکومت کی برطرفی مشرقی پاکستان کے خلاف سازش کا حصہ تھی۔ اگست ۱۹۵۰ء میں مرکز

نے ایک اور ستم یہ ڈھایا کہ چوہدری محمدّ علی کو پاکستان کا وزیراعظم مقرر کر دیا.
جبکہ اس وقت پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمدّ تھے اس طرح مرکز میں دونوں
بڑے عہدے مغربی پاکستان نے ہتھیا لیے۔ اس کے برعکس اب تک روایت یہ
تھی کہ ان دونوں میں سے ایک عہدہ مشرقی پاکستان کو دیا جاتا تھا جبکہ دوسرا
بڑا عہدہ مغربی پاکستان کے پاس رہتا تھا۔ اس مضحکہ خیز ظالمانہ اقدام نے مشرقی پاکستان
کے اعتماد کو شدید طور پر مجروح کر دیا۔

۱۹۵۶ء میں بنگالی رہنما مسٹر حسین شہید سہروردی کو وزیراعظم بنایا گیا
تھا اور انھیں اختیار دیا گیا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان کی خود مختاری طے کرنے کے
لیے ایک کمیٹی تشکیل دیں لیکن یہ کمیٹی کبھی معرض وجود میں نہ آسکی۔ حتیٰ کہ اکتوبر
۱۹۵۷ء میں سہروردی نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔

ایوبّ خان کا مارشل لاء

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ایوبّ خان نے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ مشرقی پاکستان
میں اُسے مغربی پاکستان کی سازش قرار دیتے ہوئے یہ مؤقف اختیار کیا گیا کہ
مارشل لاء کا اصل مقصد ملک کی سیاسی، اقتصادی اور سماجی زندگی پر جاگیرداروں
کی گرفت کو مزید مضبوط بنانا ہے۔ ان کے خیال میں اگر جمہوری عمل جاری رہتا تو
بنگالی، بتدریج اپنے حقوق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ اس میں
شک و شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ مغربی پاکستان کی سیاست پر جاگیرداروں
کا قبضہ تھا۔ جب کہ مشرقی پاکستان میں جاگیرداری کا کوئی تصوّر تک موجود نہیں
تھا۔ مشرقی پاکستان کی سیاست متوسّط طبقے کے پاس تھی۔ جن میں اکثریت

وکلاء اور ملازمت پیشہ افراد کی تھی۔ سیاسی منظر سے سیاستدانوں کی علیحدگی نے مشرقی پاکستان میں محرومی کے احساس میں مزید اضافہ کر دیا جو بالواسطہ طور پر "بنگلہ قوم پرستی" کے لیے معاون ثابت ہوا۔ ایوب خان نے اپنی بے لگام طاقت اور اختیارات کی وسعت کے اظہار کے طور پر مشرقی پاکستان میں ایک سابق انسپکٹر جنرل پولیس ذاکر حسین کو مشرقی پاکستان کا گورنر بنا دیا۔ گورنر موصوف نے پورے صوبے کو ایک تھانے میں بدل دیا۔ اور ایک تھانیدار کی طرح داروگیر اور خوف وہراس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پولیس کے ہاتھوں تشدد اور دہریت کا نشانہ بننے والوں میں شیخ مجیب الرحمٰن اور روزنامہ "اتفاق" کے ایڈیٹر اور معروف صحافی تفضل حسین بھی شامل تھے۔ اس ظالمانہ کاروائی نے بنگالیوں کے دلوں میں ایوب خان اور بالخصوص مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کے جذبات میں مزید شدت اور توانائی پیدا کر دی لیکن اس کے باوجود ایوب خان نے مشرقی پاکستان کو مطمئن کرنے کے لیے سنجیدہ کوششیں کیں۔ مگر انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کا نظام نافذ کر کے دیہی آبادی کے مسائل کو حل کرنے کا عمل شروع کیا۔ مگر اس کا بھی کوئی خاطر خواہ اور مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اور بنگالیوں میں یہ احساس بڑھتا چلا گیا کہ حکومت انھیں مساوی حقوق دینے کے لیے تیار نہیں بلکہ بنیادی جمہوریتوں کے ذریعے اپنے اقتدار کو طول دینا چاہتی ہے۔ بنگالیوں کی بعض شکایتیں بالکل جائز اور درست تھیں۔ آبادی کے اعتبار سے بنگالی اکثریت میں تھے لیکن اس کے باوجود انھیں کبھی بھی مرکزی کابینہ میں آبادی کی بنیاد پر نمائندگی نہیں دی گئی۔ مرکزی وزارتوں کی تفصیل کا گوشوارہ درج ذیل ہے۔

گوشوارہ

وزرا، وزرا مملکت، ڈپٹی وزرا کی کل تعداد (ایک وقت میں)	مغربی پاکستانیوں کی تعداد	بنگالیوں کی تعداد	بنگالیوں کی نمائندگی کا فی صد تناسب
لیاقت علی خان کی کابینہ (۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء تک)			
۱۹	۱۳	۶	۳۱٫۰۲ فیصد

تین ڈپٹی منسٹر اور اسی کابینہ میں وزیر اور وزیر مملکت بن گئے۔ کل تعداد میں وزیر اعظم بھی شامل ہیں۔

وزرا، وزرا مملکت، ڈپٹی وزرا کی کل تعداد (ایک وقت میں)	مغربی پاکستانیوں کی تعداد	بنگالیوں کی تعداد	بنگالیوں کی نمائندگی کا فی صد تناسب
خواجہ ناظم الدین کی کابینہ (۱۹ اکتوبر ۱۹۵۱ء سے ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء تک)			
۱۵	۹	۶	۴۰ فیصد
محمد علی بوگرہ کی کابینہ (۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء سے ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء تک)			
۱۴	۹	۵	۳۵ فیصد
دوبارہ تشکیل شدہ کابینہ (۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء تا ۱۱ اگست ۱۹۵۵ء تک)			
۱۶	۹	۷	۴۴ فیصد
چوہدری محمد علی کی کابینہ (۱۱ اگست ۱۹۵۵ء تا ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء تک)			
۱۷	۱۰	۷	۴۱ فیصد
سہروردی کی کابینہ (۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء تا ۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء تک)			
۱۴	۶	۸	۵۷ فیصد
آئی آئی چندریگر کی کابینہ (۱۸ اکتوبر ۱۹۵۷ء تا ۱۶ دسمبر ۱۹۵۷ء تک)			
۱۶	۹	۷	۴۴ فیصد
نون کی کابینہ (۱۶ دسمبر ۱۹۵۷ء تا ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء تک)			
۲۷	۱۵	۱۲	۴۴٫۵ فیصد

وزرا، وزرا مملکت، ڈپٹی وزرا.. کی کل تعداد (ایک وقت میں)	مغربی پاکستانیوں کی تعداد	بنگالیوں کی تعداد	بنگالیوں کی نمائندگی کا فیصد تناسب
ایوب خان کی کابینہ (پہلی) (۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء تا ۱۷ فروری ۱۹۶۰ء تک			
۱۲	۱۲	۳	۲۵ فیصد
ایوب خان کی دوسری کابینہ (فروری ۱۹۶۰ء تا ۸ جون ۱۹۶۲ء تک			
۱۶	۱۱	۵	۲۶ فیصد
ایوب خان کی تیسری کابینہ (۲۸ جون ۱۹۶۲ء تا ۲۳ مارچ ۱۹۶۵ء تک)			
۱۷	۹	۸	۴۷ فیصد
ایوب خان کی چوتھی کابینہ (۲۳ مارچ ۱۹۶۵ء تا ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء تک)			
۱۷	۱۱	۶	۳۵ فیصد
یحییٰ خان کی کابینہ (۱۴ اگست ۱۹۶۹ء تا ۲۲ فروری ۱۹۷۱ء تک)			
۱۱	۶	۵	۴۵٫۴ فیصد

مشرقی پاکستان میں طلباء کی تحریک

ایوب خان کا صدارتی نظام حکومت مشرقی پاکستان میں سخت تنقید کی زد میں رہا۔ بنگالیوں کو یقین تھا کہ مغربی پاکستان کی فوج اور سول نوکر شاہی کسی بھی بنگالی کو صدارت کے منصب پر ہرگز فائز نہیں ہونے دیگی۔ ۱۹۶۲ء میں ایوب خان کیخلاف طلباء نے تحریک شروع کر دی۔ کئی مقامات پر مظاہرے ہوئے۔ ہڑتالیں ہوئیں اور احتجاجی جلوس بھی نکالے گئے۔ اس تحریک کے نتیجے میں حسین شہید سہروردی کو گرفتار کر لیا گیا اور تحریک کی ساری ذمہ داری بھارتی ایجنٹوں پر ڈال دی گئی۔ بعد ازاں ایوب خان نے اعلان کیا کہ:-

"کلکتہ اور کابل کو تخریبی کارروائیوں کے لیے بنیاد کے طور پر استعمال کیا جا رہا

ہے،، جب مشرقی پاکستان کے عوام نے پارلیمانی نظام کا مطالبہ کیا تو ایوب خان نے
اس کیخلاف ایک بڑی دلچسپ دلیل دی۔ آپ نے فرمایا :۔

”مشرقی پاکستان کا مطالبہ ہے کہ ملک میں پارلیمانی نظام نافذ کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مغربی پاکستان والوں کو یہ مطالبہ قابلِ قبول نہ ہو۔ کیا آپ پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔؟“

گویا ایوب خان ملک توڑنے پر تیار تھے۔ مگر قوم کا مطالبہ ماننے پر تیار نہ تھے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان کے دفاع کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ عوام نے اپنے آپ کو تنہا اور یکسر غیر محفوظ سمجھنا شروع کر دیا۔ جنگ کے دوران مشرقی پاکستان مکمل طور پر بھارت کے رحم و کرم پر رہی تھا۔ ایک طرف تو بھارت نے اپنی آئندہ کارروائی کے لیے مشرقی پاکستان کیخلاف کارروائی کرنے سے احتراز کیا جبکہ دوسری طرف جناب ذوالفقار علی بھٹو وزیر خارجہ پاکستان نے قومی اسمبلی میں اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان کو 'چین' نے بچایا ہے۔ راقم الحروف کو ایک مرتبہ جناب حسین شہید سہروردی کے ساتھ ایک محفل میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا۔ جس میں موصوف نے پاکستان کی سیاست کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ :۔

”ہندوستان کے خلاف کبھی بھی جنگ کرنے کی بات نہ سوچنا۔ یاد رکھو یہ جنگ پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دے گی“

۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران مجھے مرحوم کے یہ الفاظ کئی بار یاد آئے اور ہر دفعہ ملک ٹوٹتا ہوا نظر آیا۔ ۲۴ / اپریل ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں 'لندن آبزرور' نے لکھا کہ :۔

جولائی ۱۹۷۲ء شملہ کانفرنس (انڈیا) میں شرکت کے لیے روانگی کے وقت لاہور ائیرپورٹ
پر چوہدری ظہور الٰہی مسٹر بھٹو (تب صدرِ پاکستان) کو الوداع کہہ رہے ہیں۔

"بھارت کے خلاف گذشتہ ستمبر کی جنگ کے نتیجے میں پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہونے کے خطرے سے دوچار ہے۔"

اخبارِ مذکور نے عوامی لیگ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھا کہ :۔

"مشرقی پاکستان اس وقت تک بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے معاملات میں خود مختار اور آزادانہ وسائل کا مالک نہیں بن جائے گا۔"

معاہدۂ تاشقند کیخلاف ملک گیر مظاہرے

۱۹۶۵ء کی جنگ کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں خود مختاری کا مطالبہ مزید طاقت پکڑ گیا۔ یہ جنگ "معاہدہ تاشقند" پر منتج ہوئی۔ اس معاہدے کے خلاف مغربی پاکستان میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی۔ پُر تشدد مظاہروں اور بلوؤں کے نتیجے میں پولیس فائرنگ اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جبکہ مشرقی پاکستان میں اس معاہدے پر کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا گیا۔ بنگالیوں کا عام تاثر یہ تھا کہ مسئلہ کشمیر غالباً مغربی پاکستان کا مسئلہ ہے۔ اس لیے وہ اس مسئلے پر کسی قسم کی تحریک چلانے کے حق میں نہیں تھے۔ جبکہ عوامی لیگ کے قائد شیخ مجیب الرحمٰن نے جنگ کے نتائج کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے مشرقی پاکستان کی خود مختاری کے لیے چھ نکات کا پروگرام پیش کر دیا۔ ان کے چھ نکات کی تفصیل درج ذیل ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات

چھ نکاتی فارمولے کا متن

(عوامی لیگ کے دستور میں شائع شدہ اصل اور ترمیم شدہ)

نکتہ نمبر (۱) اصل آئین کو قرار دادِ لاہور پر مبنی ایک وفاق پاکستان اور ایک ایسے پارلیمانی نظام کا ضامن ہونا چاہیئے جس میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست منتخب ہونے والی مقننّہ کو بالادستی حاصل ہے۔

ترمیم شدہ ملک کا طرزِ حکومت وفاقی اور پارلیمانی ہو گا جس کے تحت وفاقی مقننّہ اور صوبے کی مقننّاؤں کے لیے انتخابات براہِ راست اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں گے۔ وفاقی مقننّہ میں نمائندگی آبادی کی بنیاد پر دی جائے گی۔

نکتہ نمبر (۲) اصل وفاقی حکومت کے پاس صرف دو محکمے یعنی دفاع اور امورِ خارجہ ہوں گے۔ جب کہ باقی تمام محکمے صوبوں کے زیرِ انتظام ہوں گے۔

ترمیم شدہ وفاقی حکومت کے پاس صرف دفاع اور امورِ خارجہ اور ذیل میں درج شدہ نقطہ نمبر ۳: میں بیان کی گئی شرائط کے تحت کرنسی کے شعبے ہوں گے۔

نکتہ نمبر (۳) اصل (ا) دونوں صوبوں کے لیے علیحدہ مگر آسانی سے قابلِ بدل کرنسیوں کا اجراء کیا جائے۔

(ب) تمام ملک کے لیے ایک ہی کرنسی مقرّر کی جاسکتی ہے۔ اس صورت میں ملک کے مشرقی حصّے سے مغربی حصّے میں دولت کی منتقلی کو روکنے کے لیے

آئین میں تصریحات کی جائیں۔ مشرقی پاکستان کے علیحدہ محفوظ مالیاتی ذخائر رکھے جائیں اور اس کے لیے الگ اقتصادی اور مالیاتی پالیسی طے کی جائے۔

ترمیم شدہ ملک کے دونوں حصوں کی دو الگ الگ کرنسیاں ہوں جو باہمی طور پر یا آزادانہ طور پر قابلِ بدل ہوں یا پھر ملک کی ایک کرنسی کی صورت میں محفوظ مالیاتی ذخائر کا ایک وفاقی نظام ہوگا جس کے تحت علاقائی ریزرو بنک قائم کیے جائیں گے، جو ایک حصّے سے دوسرے حصے میں وسائل اور سرمائے کی منتقلی کو روکنے کے ذمّے دار ہوں گے۔

نکتہ نمبر (۴) اصل ٹیکسوں کے نفاذ اور حصول کا اختیار صوبوں کو ہوگا اور یہ کہ وفاقی حکومت کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ فیڈریشن کو اپنے مطلوبہ اخراجات کے لیے ریاستی ٹیکسوں میں سے حصّہ دیا جائے گا۔ وفاقی فنڈ تمام ریاستی ٹیکسوں پر لگائی جانے والی ایک متعیّنہ شرح پر مشتمل ہوگا۔

ترمیم شدہ صوبے اپنی اقتصادی پالیسی خود تیار کریں گے۔ وفاقی حکومت کو دفاع اور امورِ خارجہ کی ضروریات کے لیے مطلوبہ مالیاتی وسائل دستیاب ہوں گے اس مقصد کے لیے وفاقی حکومت آئین میں طے شدہ طریقِ کار کے تحت متعیّنہ شرح اور انداز سے مالی وسائل خود بخود وضع کرنے کی مجاز ہوگی۔ متعلقہ آئینی تصریحات میں اس امر کا خیال رکھا جائے گا کہ وفاقی حکومت کی مالی ضروریات اس انداز میں پوری کی جائیں کہ ایسا کرتے ہوئے صوبائی حکومتوں کا اپنی اقتصادی پالیسی پر کنٹرول متاثر نہ ہو۔

نکتہ نمبر (۵) اصل (۱) دونوں حصّوں میں زرمبادلہ کی آمدن کے دو علیحدہ حسابات رکھے جائیں گے۔

۲ ۔ مشرقی پاکستان کی آمدنی حکومتِ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی آمدنی حکومتِ مغربی پاکستان کے زیرِ انتظام ہو گی ۔

۳ ۔ وفاقی حکومت کی زرِ مبادلہ کی ضروریات دونوں حصے مساویانہ طور پر کسی طے شدہ تناسب کے تحت پوری کریں گے ۔

۴ ۔ دونوں حصوں کے درمیان ملکی مصنوعات کی نقل و حمل ڈیوٹی کے بغیر ہو گی ۔

۵ ۔ آئین کے تحت صوبائی حکومتیں بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات کے اجراء وہاں تجارتی مشنوں کے قیام اور ان کے ساتھ تجارتی سمجھوتے کرنے کی مجاز ہو گی ۔

ترمیم شدہ آئین کے تحت صوبوں کی زرِ مبادلہ کی آمدن کے علیحدہ حسابات کا نظام قائم کیا جائے گا ۔ جو کہ متعلقہ صوبے کی حکومت کے زیرِ انتظام ہوں گے ۔

وفاقی حکومت کی زرِ مبادلہ کی ضروریات صوبائی حکومتیں آئین میں دیئے گئے طریقِ کار کے تحت متعینہ تناسب کی بنیاد پر پوری کریں گی ۔ حکومتوں کو ملک کی خارجہ پالیسی جو کہ وفاقی حکومت کی ذمہ داری ہو گی ، کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے غیر ملکی تجارت اور امداد کے معاملات طے کرنے کا آئینی اختیار ہو گا ۔

نکتہ نمبر (۶) اصل مشرقی پاکستان کے لیے ملیشیا یا نیم فوجی فورس کا قیام ۔

ترمیم شدہ صوبائی حکومتیں قومی سالمیت میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے کے لیے ملیشیا یا نیم فوجی فورس قائم کرنے کی مجاز ہوں گی ۔

چھ نکات اور افواہیں چھ نکات کی تیاری کے متعلق مختلف افواہوں کی تفصیل حسب ذیل ہے :

۱ ۔ ان نکات کا خالق الطاف گوہر ہے ۔ جس نے ہارون خاندان کے توسط

سے یہ نکات شیخ مجیب الرحمٰن کے حوالے کیے۔

۲۔ مغربی پاکستان کی نوکر شاہی کو بنگالیوں سے خطرہ تھا۔ اسی لیے اس نے مشرقی پاکستان سے نجات حاصل کرنے کے لیے چھ نکات مرتّب کیے۔

۳۔ مغربی پاکستان کے سرمایہ دار اور جاگیر دار طبقے، مشرقی پاکستان کو ملکی معیشت پر ایک بوجھ تصوّر کرتے تھے۔ ان کے خیال میں مشرقی پاکستان سیلابوں اور قدرتی آفات کی سرزمین تھی اور وسائل کی کمی اس کی ترّقی و خوشحالی کی راہ میں حائل تھی۔ اس لیے انہوں نے نوکر شاہی سے مل کر مشرقی پاکستان کو الگ کرنے کے لیے چھ نکاتی پروگرام پیش کرایا۔

۴۔ یہ نکات عوامی لیگ نے بنگالی ماہرینِ اقتصادیات کے صلاح مشورے سے مرتّب کیے تھے۔

بہرحال صحیح صورتِ حال کچھ بھی ہو اس حقیقت سے یقیناً انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر ان نکات کی غیر معمولی تشہیر کی گئی، پاکستان کے تمام ٹرسٹ کے اخبارات نے ان نکات کو نمایاں سرخیوں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ شائع کیا بلکہ ان پر تبصرے اور اداریے بھی تحریر کیے۔ بین الاقوامی سطح پر لندن ٹائمز، اکنامسٹ، نیو یارک ٹائمز اور دیگر معروف اخبارات نے بھی ان نکات کو نمایاں طور پر شائع کیا۔ اور شیخ مجیب الرحمٰن کو ایک "قومی ہیرو" کے طور پر تمام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ پبلسٹی کے اس انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تمام تر کارروائی کے پیچھے پاکستان کی حکومت، نوکر شاہی اور با اثر افراد کا ہی ہاتھ کارفرما تھا۔ اس کی وجوہات بھی باآسانی سمجھ میں آسکتی ہیں، جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ ایوب حکومت کو "اعلانِ تاشقند" کی شدید ترین مخالفت کا سامنا تھا، اس

معاہدے سے اہلِ مغربی پاکستان ایوب خان سے خوش نہیں تھے۔ چنانچہ ایوب خان چھ نکات کا ہوّا کھڑا کر کے "معاہدہ تاشقند" کی مخالفت کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔ نیز چھ نکات کی اشاعت سے سیاست دانوں کے درمیان انتشار و افتراق کی خلیج بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔

۲۔ بین الاقوامی سطح پر چھ نکات کی صحت اور صداقت کو تسلیم کرانا بھی مقصود تھا تاکہ حکومتِ پاکستان کی مدافعانہ کوششوں کو ناکام بنا کر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو یقینی بنایا جا سکے۔

ایوب خان کا دورۂ مشرقی پاکستان

مئی ۱۹۶۶ء میں ایوب خان نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ وہ جہاں بھی گئے انہوں نے چھ نکات کی مذمت تو بیشک کی مگر فی الواقع انہیں چھ نکات کی مقبولیت اور اس سے پیدا ہونے والے متوقع نتائج کا احساس بھی ہو چکا تھا اور انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ ملک اب خانہ جنگی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ انہوں نے امریکہ اور پاکستان کے حالات کا موازنہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:۔

"اگر حالات نے مجبور کر دیا تو پاکستان کو بھی اپنی وحدت برقرار رکھنے کے لیے خانہ جنگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

چھ نکات کی بین الاقوامی تشہیر

بھارت پاکستان کا ازلی و ابدی دشمن ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں قطعی کوئی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں۔ مگر افسوس! اس حقیقت کے باوجود بھی پاکستان نے اپنے خلاف جارحانہ کارروائیوں کی دعوت دینے سے کبھی بھی گریز نہیں کیا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان کے دفاع

سے مجرمانہ غفلت کا قصّہ ابھی لوگوں کی زبان پر ہی تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کی بین الاقوامی طور پر تشہیر کر کے بھارت کو ایک اور موقع فراہم کر دیا گیا کہ وہ آگے آئے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں اپنا کردار ادا کرے۔ بھارت نے حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی پروپیگنڈہ مشینری کو تیز کر دیا۔ آل انڈیا ریڈیو نے چھ نکات کی تائید میں ایک خاص پروگرام نشر کرنا شروع کر دیا۔ جبکہ بھارتی اخبارات نے بھی شیخ مجیب الرحمٰن کی قدِ آدم تصاویر شائع کیں اور انھیں ایک "قومی ہیرو" کے طور پر ابھارنا شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں بھارت نے وسیع پیمانے پر مغربی پاکستان کے خلاف لٹریچر چھپوا کر مشرقی پاکستان میں تقسیم کرادیا اور دونوں حصّوں کے درمیان نفرت و عداوت پھیلانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اُدھر شیخ مجیب الرحمٰن نے پورے صوبے کا دورہ کیا اور ہر مقام پر کھلے بندوں بنگالی قومیّت کا نعرہ لگایا۔ انہوں نے اپریل ۱۹۶۶ء میں لندن ٹائمز کے نامہ نگار کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا:۔

"میں کسی کی نو آبادی کے طور پر مزید زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ ہماری حکومت کشمیر میں ریفرینڈم کے لیے برسرِ پیکار ہے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ مشرقی پاکستان میں چھ نکات پر ریفرینڈم کرلے۔ پھر دنیا دیکھے گی کہ پچاسی فیصد عوام میرے ساتھ ہیں۔"

شیخ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری

مئی ۱۹۶۶ء میں شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے ۷ جون ۱۹۶۶ء کو مشرقی پاکستان میں عام ہڑتال کی گئی۔ اس موقع پر سرکاری دفاتر پر بھی حملے کئے گئے۔ غیر بنگالیوں کی دکانوں اور کاروں کو نذرِ آتش کیا گیا۔ اور انھیں مارا پیٹا بھی گیا۔ جسکے باعث

امن عامہ کی حالت تباہ ہو گئی۔ مغربی بنگال سے ہندو تخریب کار مشرقی صوبے میں داخل ہو گئے۔ اور انہوں نے کامیاب تخریب کاری کر کے علاقے میں عدم تحفظ اور بے چینی پیدا کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ اس نراجیت اور انتشار کا نتیجہ شیخ مجیب الرحمٰن کے حق میں نکلا۔ جس سے ان کی مقبولیت اور قوت میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مرکزی حکومت حالات کا مقابلہ کرنے اور بنگالیوں کو مطمئن کرنے میں بُری طرح ناکام رہی۔

اگرتلہ سازش کیس

جنوری ۱۹۶۸ء میں سرکاری سطح پر اگرتلہ سازش کا انکشاف کیا گیا اس مقدمے میں ۳۵ ملزمان ملوث تھے جن کا تعلق پاکستان عوامی لیگ، بحریہ، اور سول سروس سے تھا۔ مجیب الرحمٰن کا اس مقدمے سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہی وہ اس سازش میں شریک تھے۔ جن دنوں میں یہ سازش تیار کی گئی تھی اس وقت مجیب الرحمٰن جیل میں تھے۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ ان کو اس مقدمے میں محض دشمنی کی بنا پر ہی پھانسا گیا تھا۔ مشرقی پاکستان کے لیڈر پروفیسر غلام اعظم کا بیان ہے کہ مجیب الرحمٰن اس مقدمے میں ملوث نہیں تھا۔ گورنر عبدالمنعم خان نے اصرار کر کے انہیں ملزم بنایا تاکہ اس کو سیاسی طور پر ختم کیا جا سکے۔

مقدمے کی سماعت کے لیے پاکستان کے ریٹائرڈ چیف جسٹس جناب ایس۔ اے۔ رحمٰن کی سربراہی میں ایک ٹریبونل قائم کیا گیا۔ لیکن اس مقدمے نے شیخ مجیب الرحمٰن کی مقبولیت میں مزید اضافہ کر دیا اور انھیں "قومی ہیرو" بنا دیا۔ اس کے علاوہ بنگالیوں نے چھ نکات کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیدیا۔ آخر کار حکومت کو یہ مقدمہ واپس لینا پڑا اور جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن کو ننگے پاؤں ہی واپس آنا پڑا۔

اگرتلہ سازش کیس کی ناکامی اور ایوبی اقتدار کو خطرہ

اگرتلہ سازش کی ناکامی ایوبی اقتدار کے لیے انتہائی مہلک ثابت ہوئی اور اس کاروائی سے مشرقی پاکستان کے علاوہ مغربی پاکستان میں بھی یہ تاثر پیدا ہوگیا کہ ایوب خان نے سیاسی انتقام کی خاطر مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں کے خلاف ایک جھوٹا مقدمہ بنا کر انھیں بدنام کرنیکی انتہائی مذموم کوشش کی۔ ایوب خان چونکہ ایک آمر تھا۔ اس لیے نہ تو وہ مجیب الرحمٰن کا سیاسی میدان میں مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان اور بالخصوص مشرقی پاکستان کے سیاستدانوں کا اعتماد حاصل کرسکا اور نہ ہی باعزت طور پر اقتدار سے الگ ہوجانے کی کوئی معقول کوشش کرسکا۔ یہ بات ہر آمر کی فطرت میں شامل ہوتی ہے کہ وہ اس وقت تک اقتدار سے چمٹا رہتا ہے جب تک کہ اس کے گلے میں رسّی ڈال کر اسُے زبردستی کھینچ کر مسندِ اقتدار سے ہٹایا نہیں جاتا۔ ایوب خان بخوبی دیکھ رہے تھے کہ ملک کا وجود خطرے میں ہے۔ اور حالات ان کی گرفت سے نکل چکے ہیں۔ معقولیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ اقتدار سے الگ ہوجاتے اور کسی دوسرے وطن پرست کو آگے بڑھ کر حالات درست کرنے کا موقع دیتے مگر وہ آمرانہ روایات پر سختی سے جمے رہے تا آنکہ قوم نے انتہائی تکلیف دہ حالات سے گذر کر انہیں کرسئ اقتدار سے ہٹادیا۔

یہ ہے مختصر کہانی اس تکلیف دہ سیاسی سفر کی جس سے گذر کر مشرقی پاکستان میں قوم پرستی کی تحریک فیصلہ کن مراحل میں داخل ہوگئی۔ چھ نکات کی بنیاد پر شیخ مجیب الرحمٰن کی کامیابی کا صاف اور واضح مطلب یہ تھا کہ پاکستان کی سیاسی اور نظریاتی و جغرافیائی صورتحال نہایت نازک موڑ پر آگئی ہے۔ پاکستان کے تحفظ اور سلامتی کے لیے زبردست سیاسی بصیرت کو بروئے کار

لانے کی ضرورت تھی تاکہ ملک کی جغرافیائی سرحدوں کو سکڑنے سے بچایا جا سکتا اور دونوں حصّوں کو مساوی طور پر مطمئن کیا جا سکتا۔ عملاً صورتِ حال یہ تھی کہ ملک فوجی آمریت کی گرفت میں تھا۔ ملکی سطح پر شیخ مجیب الرحمٰن اکثریتی جماعت کا قائد تھا جبکہ مغربی پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی اکثریت میں تھی گویا اصل معاملات ان تینوں فریقوں کے درمیان طے ہونا تھے اور یہ معاملات "لیگل فریم ورک آرڈر" کی روشنی میں طے کئے جانے تھے۔ اصولی طور پر ضروری تھا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کیا جاتا اور تمام جماعتیں مل کر ایک متفقہ آئین تیار کرتیں اور ملک کو جمہوریت کی راہ پر ڈالا جاتا۔ افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ مجیب الرحمٰن نے انتخابات جیتنے کے بعد سخت رویّہ اختیار کر لیا۔ انہوں نے دس دسمبر ۱۹۷۰ء کو اپنی پہلی پریس کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ :۔

" آئین چھ نکات کی بنیاد پر تیار ہوگا۔ اور اس میں مکمل علاقائی خودمختاری کی ضمانت دینی ہوگی "۔

قومی اسمبلی کے اجلاس کی طلبی اور سیاسی کشمکش

یحییٰ خان نے ۳۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا جو بعد میں ملتوی کر دیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے متعدد بار اعلان کیا کہ آئین چھ نکات کی بنیاد پر ہی بنایا جائے گا۔ دوسری طرف جناب ذوالفقار علی بھٹو، عوامی لیگ کے رہنما سے چھ نکات پر لچک پیدا کرنے کے خواہاں تھے لیکن شیخ مجیب الرحمٰن اپنی ہی روش پر ڈٹے ہوئے تھے۔ یحییٰ خان اور مغربی پاکستان کے قائدین نے مجیب الرحمٰن کو مغربی پاکستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی جو انہوں نے مسترد کر دی۔ سیاسی فضا جو پہلے ہی مکدّر تھی اب اس ماحول میں مزید تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کا موقف جناب ذوالفقار علی بھٹو کا موقف یہ تھا کہ چھ نکات ملک کی سلامتی کے لیے انتہائی خطرناک ہیں۔ نیز ایسا آئین جو محض اکثریتی جماعت کی مرضی سے تیار کیا جائے اور جس میں چھوٹی جماعتوں کی رضامندی شامل نہ ہو، پائیدار نہیں ہو سکتا۔ جناب بھٹو نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو اعلان کیا کہ :۔

"پاکستان میں طاقت کے سرچشمے پنجاب اور سندھ ہیں اور چونکہ پاکستان پیپلز پارٹی کو ان دونوں حصوں میں بھاری اکثریت حاصل ہوئی ہے۔ لہٰذا آئین کی تشکیل یا کسی بھی مرکزی حکومت کے قیام کے لیے ان کا تعاون ضروری ہے"

عوامی لیگ کا شدید ردِّعمل عوامی لیگ نے اس پر شدید ردِّعمل کا اظہار کیا اور دوسرے ہی دن یعنی ۲۱ دسمبر ۱۹۷۰ء کو عوامی لیگ کے جنرل سیکرٹری تاج الدین احمد نے اپنے جوابی بیان میں کہا کہ :۔

"ہمیں قومی اسمبلی میں واضح اکثریت حاصل ہے اور عوام نے اپنے ووٹوں کے ذریعے ہمیں آئین اور مرکزی حکومت بنانے کا اختیار دیا ہے۔ وہ دن گئے جب پنجاب اور سندھ قوّت کا سرچشمہ ہونے کے دعویدار تھے"

سیاستدانوں کا ایک غلط تاثر بنگلہ دیش کے قیام کے فوراً بعد مغربی پاکستان کے سیاستدانوں کی طرف سے یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی کہ بھٹو صاحب کی ہوسِ اقتدار نے بنگلہ دیش کے قیام میں معاونت کی تھی اگر بھٹو صاحب حزبِ اختلاف کی کرسی سنبھال لیتے تو پاکستان نہ ٹوٹتا۔

حقیقتِ حال ہماری نظر میں یہ نقطۂ نظر سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ تھوڑی

دیر کے لیے ہم ۱۹۴۶ء کے ہندوستان پر نظر ڈالتے ہیں کہ انتخابات میں ہندوؤں کی جماعت کانگریس اکثریت حاصل کر چکی ہے۔ دوسرے نمبر پر مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ ہے جو کانگریس کے مقابلے میں اقلیت میں ہے اس لیے دستور ساز اسمبلی کے سامنے دو مسئلے ہیں یعنی :-

۱۔ حکومت کی تشکیل اور

۲۔ آئین کی تیاری

مسلم لیگ کا دعویٰ ہے کہ ان کی شمولیت اور تعاون کے بغیر دونوں مسائل طے نہیں کیے جا سکتے۔ مسلم لیگ کا یہ دعویٰ حکومت اور کانگریس دونوں نے تسلیم کر لیا اور کسی طرف سے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا گیا ہرچند کہ دستور ساز اسمبلی کوئی دستور مرتب نہ کر سکی لیکن عبوری حکومت میں مسلم لیگ برابر کی شریک تھی اور اس عبوری حکومت میں وزارتوں کی تفصیل یہ تھی :-

کانگریس :-	۶
مسلم لیگ :-	۵
اچھوت :-	۱
عیسائی :-	۱
پارسی :-	۱
جملہ :-	۱۴

مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں حسب ذیل ارکان کو نامزد کیا تھا۔

۱۔ جناب نوابزادہ خان لیاقت علی خان

۲۔ جناب آئی آئی۔ چندریگر

۳۔ جناب راجہ غضنفر علی

۴۔ جناب سردار عبدالربّ نشتر۔
۵۔ جناب جوگندر ناتھ منڈل

ایک واضح حقیقت

وزارتوں کی مندرجہ بالا تقسیم نسلی بنیاد پر کی گئی تھی جب کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے درمیان تنازعہ علاقائی نمائندگی کا تھا۔ لہٰذا آئین کی تدوین اور حکومت کی تشکیل کے لیے ضروری تھا کہ مغربی پاکستان کی اکثریتی جماعت کو مناسب نمائندگی دی جاتی کیونکہ چھ نکات کی بنیاد پر آئین کی ترتیب صرف مشرقی پاکستان کا مطالبہ تھا اور مغربی پاکستان میں اس مطالبے کے خلاف سخت نفرت تھی۔

بھٹوؔ صاحب کی حقیقت پسندی

جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ نے اپنے مندرجہ بالا فارمولے پر عمل کرتے ہوئے موجودہ پاکستان کے دو صوبوں یعنی بلوچستان اور سرحد میں اکثریتی جماعتوں کی حکومتیں قائم کیں اور ۱۹۷۳ء کا آئین تمام سیاسی جماعتوں کی رضامندی سے مرتّب کیا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ آئین کی اہمیّت و عظمت اور تقدّس سے بخوبی واقف تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ آئین محض اکثریت کی بنیاد پر منظور ہونے والا قانون نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک ایسا برتر قانون ہوتا ہے۔ جس سے پوری قوم کی اجتماعی امنگوں کی ترجمانی ہوتی ہے۔

یحییٰ خان کی بدنیتی

یحییٰ خان محض ایک تماشائی بن کر بیٹھا ہوا تھا حالانکہ یہ اس کی آئینی ذمہ داری تھی کہ وہ قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد کر کے آئینی معاملات طے کرنے کی دیانتدارانہ کوشش کرتا۔ لیکن یحییٰ خان نے اس ضمن میں کوئی بھی نیم دلانہ کوشش تک کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی شاید اس لیے کہ خود اس کے ذہن میں اپنے اقتدار کے بچاؤ کا

کوئی خاص منصوبہ پرورش پا چکا ہوگا اور وہ اسی اُدھیڑ بُن میں لگا ہوا ہوگا کہ کس طرح ان دونوں صوبوں کے اکثریتی لیڈروں کو آپس میں لڑایا جائے اور ان میں عدم اعتماد، بغض و عناد کی وسیع خلیج حائل کر کے نہ صرف یہ کہ ان کو عوام النّاس میں رسوا کیا جائے بلکہ بین الاقوامی طور پر بھی ان دونوں قوّت بخش لیڈروں کو بے اثر و ناکام ثابت کر دیا جائے۔

بنگلہ دیشی ارکان کا حلف

۳ جنوری ۱۹۷۱ء کو رمنا ریس کورس گراؤنڈ میں عوامی لیگ کا ایک جلسہ ہوا۔ جس میں قومی اسمبلی کے ارکان سے مندرجہ ذیل حلف اٹھوایا گیا:۔

"ہم ہر حال میں چھ نکات اور گیارہ نکاتی پروگرام پر عوامی فیصلے کی پاسداری کریں گے۔"

اس موقع پر شیخ مجیب الرحمٰن نے جلسے سے خطاب کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا:۔

"شہدا کا خون رائیگاں نہیں جانے دیا جائے گا۔ ہم اکثریت کے نمائندے ہیں اس لیے ہم آئین تشکیل دیں گے اور راستے میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو کچل دیا جائے گا۔"

عوامی لیگ کا جلسہ اور جئے بنگلہ کا پرچم

اس جلسۂ عام میں اسٹیج پر جو جھنڈا لگایا گیا تھا اس پر "جیئے بنگلہ" کے الفاظ درج تھے۔ اس جلسۂ عام میں کئی غیر ملکی سفارت کاروں نے بھی شرکت کی تھی۔ حلف برداری کی اس رسم اور جلسۂ عام کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ لگا لینا کچھ مشکل نہ تھا کہ بنگلہ دیش کی تخلیق حقیقت کا روپ دھارنے والی ہے۔ اس پر مجیب الرحمٰن کا رویّہ منفرد تھا۔ آپ نے دوسرے ہی دن ۴ جنوری ۱۹۷۱ء

کو اعلان کیا کہ :۔

شیخ مجیب الرحمٰن کی دھمکی

"مغربی پاکستان چھ نکاتی پروگرام پر عملدرآمد کو روکنے کی مساعی کر رہا ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو میں عوام سے کہوں گا کہ وہ انقلاب کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔"

گویا شیخ مجیب الرحمٰن کی جانب سے مغربی پاکستان کے تمام سیاسی قائدین اور حکومتِ پاکستان کو یہ واضح الفاظ میں دھمکی تھی اور یہ بھی باور کرانا مقصود تھا کہ اب تمہاری کوئی حیثیت نہیں اور میں ہی حقیقی طور پر سب کچھ ہوں۔ جو میں چاہوں گا وہی ہو گا جبکہ تمہاری حیثیت اس حصّے میں کچھ نہیں ہے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے رویّے کو دیکھتے ہوئے دوسری سیاسی جماعتوں اور طلباء تنظیموں نے بھی جنگِ آزادی کا ہیرو بننے کے لیے موقع سے خوب فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ نیشنل عوامی پارٹی کے قائد اور بزرگ رہنما مولانا عبدالحمید خان بھاشانی نے ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ پاکستان کی بنیاد پر "آزاد بنگال" کا مطالبہ کر دیا۔

ہفتۂ طلباء اور آزادی کے نعرے

۱۹ جنوری ۱۹۷۱ء کو طلباء نے اپنے گیارہ نکاتی پروگرام کی تائید میں ہفتہ منانے کے دوران بنگلہ دیش کی مکمل آزادی کے نعرے بلند کئے اور اعلان کیا کہ اگر کسی بھی منتخب نمائندے نے چھ نکاتی اور گیارہ نکاتی پروگرام سے انحراف کیا تو اُسے بنگال سے نکال دیا جائے گا۔ آئینی بحران نے مشرقی پاکستان کے انتہا پسند عناصر کو آگے بڑھنے کا موقع از خود فراہم کر دیا اور شیخ مجیب الرحمٰن کے بلیے چھ نکات پر افہام و تفہیم کو مشکل بنا دیا۔

یحییٰ اور مجیب ملاقات

بعد از خرابئ بسیار ۱۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان ملاقات ہوئی

اور اس ملاقات کے اختتام پر یحییٰ خان نے شیخ مجیب الرحمٰن کو مستقبل کا وزیر اعظم قرار دیا۔ لیکن حقیقتِ حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ مجیب الرحمٰن نے یحییٰ خان کو آئین کا مسوّدہ تک دکھانے سے انکار کر دیا تھا اور ساتھ ہی انہیں دھمکی بھی دی کہ اگر قومی اسمبلی کا اجلاس جلد نہ بلایا گیا تو سنگین نتائج کی ذمّہ داری بھی خود یحییٰ خان پر ہی ہوگی۔ دراصل یہ ملاقات یحییٰ خان اور مجیب الرحمٰن کے درمیان مذاکرات کا نکتۂ اختتام تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے یحییٰ خان کو صدرِ مملکت کی حیثیت سے اپنے عہدے پر قائم رہنا تو منظور کر لیا۔ لیکن انہوں نے باقی جرنیلوں کو کسی بھی قسم کی مراعات دینے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کے اس واضح انکار پر فوجی قیادت نے فوراً محسوس کر لیا کہ مجیب الرحمٰن برسرِ اقتدار آنے کے بعد دفاعی بجٹ میں کمی کر کے فوج کو مفلوج کر دے گا۔ اور اس طرح جرنیلوں کا مستقبل تاریک ہو کر خطرے میں پڑ جائے گا۔

یحییٰ خان کی مایوسی

دراصل اس ملاقات نے یحییٰ خان کو انتہائی ناامید اور مایوس کر دیا تھا۔ اس مایوسی کا اظہار یحییٰ خان کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے ڈھاکہ ایئرپورٹ پر روانگی کے وقت دیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ:۔

"جب شیخ مجیب الرحمٰن اقتدار سنبھال لیں گے تو اس وقت میں وہاں نہیں ہوں گا۔"

یحییٰ، بھٹّو ملاقات

اب یحییٰ خان اپنی ٹیم کے ہمراہ ڈھاکہ سے سیدھے لاڑکانہ پہنچے اور جناب ذوالفقار علی بھٹّو کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس "یحییٰ، بھٹّو" ملاقات کو مشرقی پاکستان میں شک و شبہہ کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

بھٹوؒ کا آئینی فارمولا

تاہم ۲۷ جنوری ۱۹۷۱ء کو جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ مندرجہ ذیل آئینی فارمولا لے کر ڈھاکہ پہنچے۔

۱۔ مشرقی پاکستان کے لیے علیحدہ کرنسی نہیں ہوگی۔ تاہم مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان میں سرمائے کی منتقلی کو روکنے کے لیے مؤثر اقدامات کئے جائیں گے۔

۲۔ بیرونی تجارت جو کہ براہِ راست خارجہ پالیسی سے منسلک ہے مرکز کے پاس رہے گی البتہ ہر صوبے کی برآمدات سے ہونے والی آمدنی اسٹیٹ بنک میں کھولے گئے اس کے متعلقہ کھاتے میں مرکزی حکومت کا متعینہ حصّہ وضع کرنے کے بعد جمع کرائی جاسکے گی۔

۳۔ دفاع اور امورِ خارجہ کے محکمے اور ٹیکیشن کے متعدد بہ اختیارات مرکز کے پاس رہیں گے۔

۴۔ صدر یحییٰ خان کا اقتدار آئین کے تحت منتخب سربراہ کے طور پر قائم رہیگا۔

بھٹوؒ، مجیب ملاقات

چنانچہ بھٹوؒ صاحب نے مندرجہ بالا آئینی فارمولے کی اساس پر شیخ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کئے۔ مگر ان مذاکرات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اور مجیب الرحمٰن نے مایوسی کے عالم میں اعلان کر دیا کہ وہ مغربی پاکستان کے دوسرے گروپوں کے قائدین سے مذاکرات کریں گے۔

بھٹوؒ، یحییٰ ملاقات

بھٹوؒ صاحب نے ۱۱ فروری ۱۹۷۱ء کو یحییٰ خان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ اپنی کتاب "عظیم المیہ" میں لکھتے ہیں کہ:۔

" صدر کو بتایا گیا کہ مغربی پاکستان میں سیاسی مذاکرات اور بڑے بڑے شہروں میں مفاہمت کے لیے رائے عامہ کی تشکیل کے لیے تین یا چار عام جلسوں کے انعقاد

فوراً بعد قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا جائے۔ صدر کو یہ بھی بتایا گیا کہ بنیادی اہمیت کا یہ کام کرنے کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن سے ایک وسیع تر سمجھوتے کے لیے ایک آخری کوشش کی جائے گی اور اس کے بعد ہم قومی اسمبلی میں جا سکیں گے۔ ہم چند ہی ہفتوں میں قومی یکجہتی کو قربان کئے بغیر چھ نکات کے معتد بہ حصے پر مفاہمت کی منزل پر پہنچ چکے ہیں البتہ بیرونی تجارت اور غیر ملکی امداد سے متعلق نکتے کا مشکل مرحلہ مزید وقت کا متقاضی ہے۔"

قومی اسمبلی کے اجلاس کی طلبی اور بھٹو کا ردِّ عمل

اس ملاقات کے دوران یحییٰ خان نے اعلان کر دیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ۳ مارچ کو ڈھاکہ میں ہو گا۔ اس اعلان پر جناب بھٹو کا ردِّ عمل کچھ اس طرح کا تھا:۔

" یہ اعلان ہمارے لیے حیرت کا باعث ہے۔ ہم اس کے لیے پوری طرح تیار نہیں تھے۔ ہمارے صلاح مشورے جاری تھے اور ابھی ہم نے مغربی پاکستان کے عوام سے ایک ایسے آئین کے بارے میں اُن کی رائے نہیں پوچھی تھی جو غیر معمولی مراعات پر مبنی تھا۔ چنانچہ ہمارے لیے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنا ممکن نہیں ہے۔"

اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے جناب بھٹو نے پشاور میں ایک پریس کانفرنس کے دوران ۱۵ فروری کو اعلان کیا کہ:۔

" ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم محض ایک پارٹی کے پہلے سے تیار کردہ آئین کی توثیق کرنے اور بے عزت ہو کر واپس آنے کے لیے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شامل ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہو کہ وہاں سمجھوتے اور مفاہمت کی کوئی گنجائش موجود ہے تو میں آج وہاں جانے کے لیے تیار ہوں۔ میری جماعت فوری انتقالِ اقتدار

کی از خود خواہاں ہے۔"

یحییٰ اور فوجی جرنیلوں کے مخصوص مقاصد

اس کے برعکس یحییٰ خان اور ان کے ساتھی جرنیلوں کے اپنے کچھ مخصوص مقاصد تھے جن کے حصول کے لیے وہ اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔ چنانچہ یحییٰ خان نے ۲۲ فروری کو مشرقی پاکستان کے گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا اجلاس طلب کر کے فیصلہ کر لیا کہ اگر مجیب الرحمٰن اپنے چھ نکات میں ترمیم پر آمادہ نہیں ہوتا تو اس کے خلاف فوجی کاروائی شروع کر دی جائے۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان میں فوجی دستوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ جس سے عوامی لیگ نے بھی حالات کی سنگینی کا اندازہ لگا لیا اور فوراً چھ نکات میں ترمیم کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ مذاکرات کو کامیاب بنانے کے لیے مشرقی پاکستان کے حکام نے یحییٰ خان سے مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے کی درخواست کی۔ مگر یحییٰ خان نے وہاں جانے سے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود عوامی لیگ نے یک طرفہ طور پہ ۲۷ فروری کو ایک مسوّدہ آئین منظور کر لیا جس کے نمایاں پہلو حسبِ ذیل تھے:۔

عوامی لیگ کا مسوّدہ آئین

۱۔ ملک کا نام وفاقی جمہوریہ پاکستان ہو گا۔

۲۔ مشرقی پاکستان کا نام بنگلہ دیش اور صوبہ سرحد کا نام پختونستان ہو گا۔

۳۔ ملک کے دو دارالحکومت ہوں گے۔ سرمائی دارالحکومت ڈھاکہ میں اور گرمائی دارالحکومت اسلام آباد میں ہو گا۔

۴۔ جنگ یا ہنگامی حالات کا اعلان قومی اسمبلی کی رضامندی کے بغیر نہیں کیا جا سکے گا۔

۵۔ آرمی یا پھر بحریہ اور فضائیہ کے مرکزی دفاتر بنگلہ دیش میں ہوں گے۔

۶۔ امورِ خارجہ، دفاع اور کرنسی کے محکمے مرکز کے پاس رہیں گے۔

۷۔ دونوں صوبوں کے لیے دو ریزرو بنک قائم کئے جائیں گے۔

۸۔ بیرونی قرضوں کی ادائیگی صوبوں میں ان کے استعمال کے تناسب سے کی جائے گی۔

۹۔ مرکز کے پاس ٹیکسیشن کے کوئی اختیارات نہیں ہوں گے۔

۱۰۔ وفاقی حکومت کے لیے صوبوں سے مالیاتی فراہمی فی کس آمدنی، اخراجات، درج ذیل فیصد کے مطابق کی جائے گی۔

بنگلہ دیش	۲۷
پنجاب	۳۷
سندھ	۲۱
بلوچستان	۸
پختونستان	۷

قومی اسمبلی کے اجلاس کا التوا

یحییٰ خان نے مجیب الرحمٰن کے رویے میں تبدیلی کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور یکم مارچ کو اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس اعلان میں آئندہ اجلاس کے لیے کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان کے گورنر جناب ایس۔ ایم۔ احسن کی جگہ جنرل یعقوب خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا۔ جبکہ یحییٰ خان کی سول کابینہ تو پہلے ہی برطرف کی جا چکی تھی۔

مشرقی پاکستان کے نئے گورنر کا تقرر اور ان کا استعفیٰ

جناب احسن اپنی میانہ روی

اور مجیب الرحمٰن کے ساتھ دوستی کی وجہ سے بنگالیوں کی نظروں میں ایک پسندیدہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی تبدیلی سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ مرکزی حکومت کیطرف سے فوجی کاروائی ناگزیر ہو چکی ہے۔ لیکن جنرل یعقوب خان نے اندازہ لگا لیا کہ مسائل کو سلجھانا ان کے بس کی بات نہیں۔ لہٰذا انہوں نے ۴ مارچ کو ہی استعفٰی دیدیا۔ چنانچہ یحییٰ خان نے ان کی جگہ جنرل ٹکّا خان کو گورنر بنا کر بھیجا لیکن ڈھاکہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے ان سے حلف لینے سے انکار کر دیا۔

اجلاس کے التوا پر احتجاج

۲ مارچ کو مجیب الرحمٰن نے اسمبلی کے اجلاس کے التوا کیخلاف احتجاج کرنے کی اپیل کی۔ اس موقع پر ملک گیر ہڑتال کی گئی جسمیں لوٹ مار، جھگڑا فساد، قتل و غارت اور آتشزدگی کا بازار گرم کر دیا گیا ــــ پورے ملک میں انقلابی دستے قائم کر دیئے گئے اور تعلیمی اداروں کو تربیتی کیمپوں میں تبدیل کر دیا گیا۔

مشرقی پاکستان سے انخلا کا آغاز

اس صورتحال سے پریشان ہو کر مغربی پاکستان کے باشندوں نے مشرقی پاکستان سے انخلا شروع کر دیا۔ پی، آئی، اے کے جہازوں میں نشستیں حاصل کرنے کے لیے رشوت کی شرح پانچ سو روپے فی ٹکٹ تک پہنچ گئی۔

پارلیمانی گروپوں کے قائدین کا اجلاس

یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کے بجائے دس مارچ کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے پارلیمانی گروپوں کے قائدین کا اجلاس طلب کر لیا۔ اس اجلاس میں جن رہنماؤں کو شرکت کی دعوت دی گئی ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :۔

۱۔ شیخ مجیب الرحمٰن عوامی لیگ (صدر)

۲۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو	پاکستان پیپلز پارٹی (چیئرمین)
۳۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ	صدر کونسل مسلم لیگ
۴۔ مولانا مفتی محمود	سیکریٹری جنرل جمیعت العلمائے اسلام
۵۔ خان عبدالولی خان	صدر نیشنل عوامی پارٹی
۶۔ مولانا شاہ احمد نورانی	صدر جمیعت العلمائے پاکستان
۷۔ پروفیسر عبدالغفور	جماعت اسلامی
۸۔ مسٹر محمد جمال	کنونشن مسلم لیگ
۹۔ مسٹر نورالامین	صدر پاکستان جمہوری پارٹی
۱۰۔ میجر جنرل جمال داد	آزاد امیدوار قبائلی علاقہ جات

شیخ مجیب کا اعلان بائیکاٹ

شیخ مجیب الرحمٰن نے اس کانفرنس کو ایک سنگدلانہ مذاق قرار دیتے ہوئے شرکت سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ پورے صوبے کے مختلف شہروں میں غیر مسلح آبادی کو ہلاک کیا جا رہا ہے۔ گلی کوچوں میں شہیدوں کا خون بہہ رہا ہے۔ سینکڑوں زخمی اسپتالوں میں موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہیں لہٰذا ان حالات میں کسی بھی کانفرنس کے انعقاد کا کوئی جواز نہیں ہے۔ دوسرے دن جماعت اسلامی اور مسلم لیگ نے بھی کانفرنس کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

یحییٰ خان کا قوم سے خطاب

۶ مارچ کو یحییٰ خان نے قوم سے خطاب کیا اور مشرقی پاکستان میں حالات کو معمول پر لانے کے لیے اپنی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ۲۵ مارچ کو ڈھاکہ میں منعقد ہوگا۔ اس پر شیخ مجیب الرحمٰن نے دوسرے ہی دن اجلاس میں شرکت کے لیے چار شرائط پیش کر دیں، جو یہ ہیں:۔

شیخ مجیب کی شرائط

۱۔ مارشل لاء اٹھالیا جائے۔
۲۔ فوج کو بیرکوں میں واپس بھیجا جائے۔
۳۔ مشرقی پاکستان میں ہونے والے ہنگاموں کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔
۴۔ اقتدار منتخب نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔

متوازی حکومت کے قیام کا اعلان

اس کے ساتھ ہی ۷ مارچ کو مجیب الرحمٰن نے ایک متوازی حکومت قائم کرنے کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے عوام کو ہدایات بھی جاری کر دیں کہ حکومت کو ٹیکس کی ادائیگی بند کر دی جائے۔ نیز مغربی پاکستان کے ساتھ ٹیلی فون کا رابطہ بند کر دیا جائے۔ تمام بنک مغربی پاکستان کو رقوم کی ادائیگی بند کر دیں اور ریڈیو، ٹی، وی اور اخبارات صرف عوامی لیگ کی خبریں نشر اور شائع کریں۔

شیخ مجیب الرحمٰن کی ان ہدایات پر فوراً عمل شروع کر دیا گیا۔ اس طرح مشرقی پاکستان پر مرکز کا اقتدارِ اعلیٰ عملاً ختم ہو کر رہ گیا۔ پورا مشرقی پاکستان زبردست خونریز فسادات کی لپیٹ میں آگیا۔ اور بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ان کے مظالم کی تفصیل انتہائی بھیانک اور تکلیف دہ ہے۔ جن کا حال ڈاکٹر صفدر محمود اپنی کتاب میں اس انداز سے بیان کرتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے فسادات اور غیر بنگالیوں کا قتلِ عام

"مارچ کے پہلے پندرھواڑے میں صوبے بھر میں ناقابلِ بیان مظالم روا رکھے گئے۔ ضلع بوگرہ کے سانتا ہار کے علاقے میں پندرہ ہزار افراد کو گھیرے میں لے کر نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ عورتوں کے ننگے جلوس نکالے گئے اور ماؤں کو اپنے بیٹوں کے خون پینے پر مجبور کر دیا گیا۔ چٹاگانگ کے ایک چھوٹے سے علاقے میں دس ہزار افراد

کو جن میں ساڑھے سات سو عورتیں اور بچے شامل تھے. موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ پبنہ کے نزدیک سراج نگر میں ۳۵۰ عورتوں اور بچوں کو ایک ہال کمرے میں بند کر کے زندہ جلا دیا گیا۔ میمن سنگھ میں دو ہزار خاندانوں پر مشتمل ایک بستی کو مکمل طور پر ملیا میٹ کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے دوسرے شہروں سے بھی اسی طرح کی رپورٹیں منظر عام پر آئیں۔ بیرونی اخبارات نے بھی عوامی حقوق کے نام پر روا رکھے جانے والے ان مظالم کی دلدوز تفصیلات شائع کیں۔

مارچ کے تیسرے ہفتے میں ڈھاکہ کی گلیاں لاشوں سے اٹی پڑی تھیں۔ سڑکوں پر گندگی کے ڈھیر لگے تھے۔ شہر غذائی قلت کا شکار ہو چکا تھا اور مسلح نوجوانوں کے گروہ غیر بنگالیوں کے گھروں پر حملہ آور ہو کر انہیں تباہ و برباد کر رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ڈھاکہ مکمل خانہ جنگی کے کنارے پر پہنچ چکا ہے۔ جب ڈھاکہ کی گلیوں میں غیر بنگالیوں کو ہلاک کیا جاتا تو مکتی باہنی کے کارکن اپنی بربریت کے ثبوت کو چھپانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتے۔ قتل و غارت کے ایک ایسے ہی مظاہرے کے بعد ایک عوامی لیگی نے کہا کہ "ان لاشوں کو یہیں پڑا رہنے دو.... عبرت کے نشان کے طور پر...."

بربریت کی چند ایک مثالیں

خود مختاری کے لیے چلائی جانے والی تحریک کے داعیوں نے پہلے ریاست کے اندر ایک اور ریاست قائم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بعد میں مجیب الرحمٰن نے مختلف انواع کے دباؤ کے پیش نظر "متوازی حکومت کے قیام" کا اعلان کر دیا۔ مارچ اپریل کے دوران " بنگالی قومیت کا مدتوں سے رکا ہوا سیلاب کنارے توڑ کر باہر نکلا اور تمام صوبے میں غیر بنگالیوں کے خلاف تشدد آمیز نفرت کی لہر دوڑ گئی"۔ ڈھاکہ میں بنگالیوں نے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے بورڈ توڑ

ڈالے اور غیر بنگالیوں کی دکانوں کو تباہ کر دیا۔ وہ کئی مقامات پر پنجابیوں اور بہاریوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے موت کے منہ میں لے گئے۔ غیر بنگالیوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان کے گلے کاٹے گئے۔ ایسا کرنے میں مرد، عورت اور بچوں کی کوئی تفریق روا نہ رکھی گئی۔ میمن سنگھ میں ایک پوسٹ ماسٹر نے صحافیوں کو اپنے جسم پر چھروں سے لگائے گئے زخم دکھاتے ہوئے بتایا کہ وہ بنگالی بلوائیوں کے قتل عام کا نشانہ بننے والے پانچ ہزار غیر بنگالیوں میں سے بچ رہنے والے ۲۵ افراد میں سے ایک ہے۔"

بنگالی طلباء کے بین الاقوامی احتجاجی مظاہرے

بنگال کے انتہا پسند طلباء نے لندن اور نیویارک میں مظاہرے کئے پاکستانی پرچم کو نذرِ آتش کیا گیا اور پاکستانی سفارت خانوں پر بنگلہ دیشی پرچم آویزاں کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کے ساتھ ہی اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل سے کہا گیا کہ بنگلہ دیش کو اقوامِ متحدہ کا رکن بنایا جائے۔ اس ساری کاروائی پر حکومتِ پاکستان کی طرف سے کسی قسم کے ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اور نہ ہی مشرقی پاکستان میں نظم و نسق کی بحالی کے لیے فوج کی طرف سے کوئی کاروائی عمل میں لائی گئی۔ یحییٰ خان نے سیاستدانوں بلکہ پوری قوم کو دھوکے میں رکھا اس کی حقیقت خان عبدالولی خان کے اس بیان سے واضح ہوتی ہے جو انہوں نے حمود الرحمٰن کمیشن کے سامنے دیا تھا۔ ولی خان نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ:۔

حمود الرحمٰن کمیشن میں ولی خان کا بیان

"۲۳ مارچ کو جب میں مجیب الرحمٰن سے ان کی رہائش گاہ پر ملا تو انہوں نے مجھے یحییٰ خان کا ایک خط دکھایا تھا جس میں مجیب الرحمٰن سے کہا گیا تھا کہ وہ ڈھاکہ میں ان کی آمد کا انتظار کریں۔ صدر نے مجیب الرحمٰن کو یقین

دلایا تھا کہ بنگالی عوام کو چھ نکات سے بھی بڑھ کر حقوق دیئے جائیں گے"۔

شیخ مجیب کا یکطرفہ اعلانِ آزادی

۷ مارچ کو عملاً شیخ مجیب الرحمٰن نے یکطرفہ اعلانِ آزادی کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی مشرقی پاکستان پر مرکزی حکومت کا کنٹرول ختم ہو چکا تھا۔ اِدھر مغربی پاکستان میں ایک اہم پیشرفت یہ ہوئی کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور قیوم مسلم لیگ کے علاوہ تقریباً تمام پارلیمانی گروپوں نے جن میں جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، جمیعت علمائے اسلام، جمیعت علمائے پاکستان اور کنونشن مسلم لیگ کے گروپ شامل تھے نے شیخ مجیب الرحمٰن کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان سے شیخ مجیب الرحمٰن کو جزوی طور پر مغربی پاکستان سے بھی حمایت حاصل ہو گئی اور اس طرح سے ان کے مطالبات میں مزید قوّت و توانائی پیدا ہو گئی۔

یحییٰ خان ۱۵ مارچ کو ڈھاکہ پہنچے۔ ان کی اس غیر معمولی تاخیر پر ہر طرف سے تعجّب و حیرت کا اظہار بھی کیا گیا۔ عام تاثر یہی تھا کہ:۔

؎ "بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے"

یحییٰ، مجیب، بھٹّو ملاقات

۱۶ تا ۲۵ مارچ کے درمیانی عرصے میں یحییٰ خان جناب ذوالفقار علی بھٹّو اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان آئینی بحران کا حل تلاش کرنے کے لیے مذاکرات ہوتے رہے جس کا ایجنڈا حسبِ ذیل نکات پر مبنی تھا:۔

مذاکرات کا ایجنڈا

۱۔ مارشل لاء اٹھا لیا جائے۔

۲۔ مرکزی اور صوبائی کابینہ کی تشکیل کا انتظام کیا جائے۔

۳۔ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کو قانون سازی کے اختیارات دیئے جائیں۔

۴۔ مشرقی پاکستان کو جغرافیائی حیثیت کے پیشِ نظر زیادہ خود مختاری دی جائے۔

یہ تھے وہ نکات جو ان طویل ترین مذاکرات میں سرِفہرست تھے بالآخر یہ مذاکرات اپنے آخری اور منطقی انجام پر ناکامی سے دوچار ہوئے۔ آخر کار مشرقی پاکستان کو معنوی طور پر علیحدہ کرنے کے بعد یحییٰ خان واپس لوٹ آئے۔ اور رات کی تاریکی میں مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا۔

یحییٰ کا قوم سے خطاب اور خانہ جنگی کا آغاز

۲۶ مارچ کو یحییٰ خان نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے عوامی لیگ کو خلافِ قانون قرار دے دیا۔ اور تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی جبکہ اخبارات پر مکمل سینسر شپ نافذ کر دی گئی۔ ۲۵ مارچ کی رات سے ملک میں خانہ جنگی کا آغاز کر دیا گیا۔ بہت سے بنگالی بھاگ کر بھارت چلے گئے۔ ۳۱ مارچ کو بھارتی پارلیمنٹ نے ایک قرارداد منظور کی جس میں مشرقی پاکستان میں امنِ عامہ کی صورتحال پر تشویش کا اظہار کیا گیا تھا اور تمام دنیا سے مداخلت کی اپیل بھی کی گئی تھی۔ بھارت نے پاکستان سے انتقام لینے کے لیے بنگالیوں کی دل کھول کر مدد کی۔ مُکتی باہنی کو فوجی تربیت دینے کے لیے تربیتی کیمپ قائم کئے گئے۔ ان کو اسلحہ فراہم کیا گیا اور پاکستانی فوج کو شکست دینے کے لیے انہیں اخلاقی، مالی اور فوجی امداد بھی مہیا کی گئی۔ یحییٰ خان کی حکومت سیاسی سطح پر اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے قطعی نااہل ثابت ہوئی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس حکومت نے خانہ جنگی کو ختم کرنے اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی حمایت حاصل کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش ہی نہیں کی۔ بلکہ اس حکومت نے اپنی تمام تر توجہ جنگی کارروائیوں پر ہی مرکوز رکھی۔ ہماری نظر میں فوجی کارروائی انتہائی غیر منصفانہ

اور غیر دانشمندانہ فعل تھا اور اس کا ہرگز کوئی اخلاقی، قانونی، آئینی اور سیاسی جواز نہیں تھا۔ مشہور دانشور ڈاکٹر صفدر محمود کے خیال میں فوجی حکمران نئی صورتحال کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہی سے محروم تھے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :۔

"پاکستان میں اختلافات اور کشیدگی کے فروغ اور صورتحال میں پیچیدگی میں اضافے کا باعث بننے والے سیاسی عوامل کی فہرست بیحد طویل ہے۔ سیاسی رہنماؤں کے غیر مفاہمت پسندانہ رویے کے علاوہ خودساختہ محافظ کے طور پر فوج کے کردار، بیرونی عمل دخل، انتہا پسندوں کے دباؤ اور مغربی پاکستان کے رہنماؤں کی طرف سے نئے سیاسی حقائق سے روگردانی نے مشرقی اور مغربی پاکستان میں موجود خلیج کو کشادہ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا سیاسی ڈھانچہ اس طرح تشکیل دیا گیا تھا کہ اس میں نوکرشاہی کے سیاسی اداروں پر غلبے، مغربی پاکستان کی بالادستی اور فوج کی مالیاتی خودمختاری کے تمام امکانات موجود تھے۔ ہر نئی حکومت نے اس نظام کی حفاظت ضروری سمجھی تھی۔ اب پہلی مرتبہ عام انتخابات کے نتیجے میں ملک کے اقتدار کے اس ڈھانچے کو خطرات کا سامنا تھا۔ دفاعی بجٹ کے سلسلے میں مجیب الرحمٰن کا رویہ فوجی حکمرانوں کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل حقائق قابلِ ذکر ہیں :۔

چند ضروری حقائق

(۱) یحییٰ خان ایک غاصب حکمران تھا۔ اس کی حکمرانی کو محض نظریۂ ضرورت کے تحت جائز تسلیم کیا گیا تھا تاکہ اس کے عرصۂ حکمرانی میں کیے گئے اقدامات کو قانونی جواز فراہم کیا جاسکے۔ اس نے مارچ ۱۹۶۹ء میں ملکی آئین منسوخ کر دیا اور ملک کو مارشل لاء کے گڑھے میں دھکیل دیا۔ جبکہ اس کا فرض تھا کہ وہ پہلی فرصت میں انتخابات کرا کر آئینی نظام کو بحال کر دیتا۔ آئینی ضرورت کے علاوہ ملکی

حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے کردے۔ اُسے معلوم تھا کہ ایوب خان کے خلاف عوامی تحریک نے ملکی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ہوشمندی کا تقاضا تھا کہ ایسی افسوسناک صورتحال کا اعادہ نہ ہونے پائے لیکن یحیٰی خان نے تقریباً دو سال تک ملک کو بے آئین ہی رکھا اور مارشل لاء کے تحت ہی حکومت چلاتا رہا۔ اس پر طُرّہ یہ کہ یحیٰی خان نے ملکی معاملات میں کسی دلچسپی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔ بلکہ اس کی ساری دلچسپیاں اور توجّہ شراب نوشی اور زناکاری پر ہی مرکوز رہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی پاکستان میں محرومی کا احساس گہرا تر ہوتا چلا گیا۔

(۲) جمہوری نظامِ حکومت میں اکثریت کا فیصلہ ہی حرفِ آخر ہوتا ہے۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے مشرقی پاکستان میں انتہائی غیر معمولی اکثریت حاصل کر لی تھی اس لیے مشرقی پاکستان کے متعلق کوئی بھی پالیسی مجیب الرحمٰن کی مرضی کے خلاف نافذ نہیں کی جا سکتی تھی۔ اکثریتی جماعت کو خلافِ قانون قرار دینا اور اس کے قائد کو غدّار ٹھہراتے ہوئے گرفتار کر لینا صرف ایک غیر آئینی اقدام ہی نہیں تھا بلکہ یہ ایک ایسی احمقانہ کاروائی بھی تھی جس نے پورے مشرقی پاکستان میں نفرت اور انتقام کی آگ کو بھڑکا کر رکھ دیا تھا۔ جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ مرکز کا اقتدار ہی بھسم ہو کر رہ گیا۔

(۳) پاکستان کا قیام سیاسی تحریک اور ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کے نتیجے میں عمل میں آیا تھا گویا یہ ملک ووٹ کی قوّت سے حاصل ہوا تھا۔ اس لیے کسی بھی نام نہاد جرنیل، آمر یا نجات دہندہ کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ محض ڈنڈے اور طاقت کے استعمال سے عوام پر اپنی مرضی و منشاء کو مسلّط کرنے کی کوشش کرے۔ اس لیے یحیٰی خان کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ مشرقی پاکستان پر فوجیں لے

کر چڑھ دوڑتا اور اپنے ہی ہموطنوں کو نشانہ بنا کر موت کی نیند سُلا دینا۔ اس لیے یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان کے سلسلے میں جو بھی اقدامات کئے بالآخر ان کا منطقی نتیجہ بہت جلد دنیا کے سامنے آگیا۔ بنگالی بھائی اس ملک کے شہری تھے ان کے خلاف فوجی کاروائی اور وسیع پیمانے پر قتل و غارتگری، لوٹ مار اور تشدّد ایک ظالمانہ، بے رحمانہ اور قابلِ نفرت اقدام تھا۔ یاد رہے کہ نفرت سے نفرت ہی جنم لیتی ہے اس سے محبت کے پھول ہرگز نہیں کھلتے۔ یہ ایک فطری حقیقت ہے جس سے کوئی بھی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا۔ جبکہ ہمارے حکمراں اس کے برخلاف توقع رکھتے تھے جس کا نتیجہ ہم سب کے سامنے ظاہر ہو کر ہی رہا۔

(۴) مغربی پاکستان کے بعض سیاستدان، جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کو فوجی کاروائی کا ذمّہ دار ٹھہراتے ہیں ان کا یہ دعویٰ اس بنیاد پر ہے کہ بھٹوؒ (مرحوم) کے یحییٰ خان اور دوسرے جرنیلوں کے ساتھ تعلقات تھے اس لیے حکومت کی پالیسیاں بھٹوؒ صاحب کی مرضی سے بنتی ہیں۔ درحقیقت یہ مفروضہ جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کو صریحًا بدنام کرنے کے لیے ہی گھڑا گیا ہے۔ اس ضمن میں حسبِ ذیل حقائق قابلِ غور ہیں:۔

(ل) جناب بھٹوؒ ایک سیاستدان تھے اور انھیں ملکی معاملات، آئین کی تدوین اور دیگر مسائل پر اپنا پروگرام پیش کرنے کا حق حاصل تھا۔ اب اگر بھٹوؒ صاحب کا پروگرام حکومت یا کسی سیاسی جماعت کے نکتۂ نظر سے مختلف تھا تو اس کا بھٹوؒ صاحب کے پروگرام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بھٹوؒ صاحب نے نیک نیتّی، ایمانداری اور سوچ و بچار کے بعد ملکی مفاد کے لیے اپنا پروگرام پیش کر دیا۔ جن کو پسند آیا انہوں نے قبول کر لیا اور جنہیں پسند نہیں آیا انہوں نے مُسترد کر دیا۔ اب کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بھٹوؒ صاحب کے پروگرام کو مختلف حیلے بہانے

اختیار کر کے اُسے ملک دشمن ٹھہرانے کی کوشش کرے۔

(ب) حکومت بھٹو صاحب کے پاس نہیں تھی۔ بلکہ جرنیلوں کے پاس تھی۔ ملک کے مفاد میں کوئی پالیسی مرتب کرنا یا کوئی بھی پالیسی نافذ کرنا حکومت کی ذمہ داری تھی نہ کہ خود بھٹو صاحب کی۔ اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ بھٹو صاحب کے جرنیلوں سے تعلقات تھے اور وہ انھیں مشورے بھی دیتے تھے تو اس سے کہاں یہ لازم آتا ہے کہ جرنیل صاحبان بھٹو صاحب کے مشوروں پر عمل کرنے کے پابند بھی تھے۔

(ج) انتخابات کے بعد بھٹو صاحب کی سرگرمیوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے آئینی بحران کو حل کرنے کے لیے انتہائی سنجیدگی سے دوڑ دھوپ کی مگر ان کی مساعی کامیاب نہ ہو سکیں اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت یحییٰ خان کے پاس تھی اور اکثریتی جماعت کی قیادت شیخ مجیب الرحمن کر رہے تھے۔ اس اعتبار سے بھٹو صاحب کی حیثیت بنیادی نہیں بلکہ ثانوی تھی۔ اس لیے کسی غلط کارروائی کی ذمہ داری بھٹو صاحب پر ڈالنا انتہائی افسوسناک ہے۔

(۵) شیخ مجیب الرحمن اور مشرقی پاکستان کے دوسرے رہنما ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ پاکستان کی بنیاد پر صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کرتے رہے ہیں۔ ہماری نظر میں ان کا یہ مطالبہ قرار دادِ پاکستان کی معنویت سے ہرگز متصادم نہیں تھا بلکہ اس کے عین مطابق تھا۔ قرار دادِ پاکستان کے مصنفین کو بخوبی علم تھا کہ جغرافیائی اعتبار سے پاکستان دو حصّوں پر مشتمل ہوگا۔ ایک حصّہ ہندوستان کے شمال مشرق میں اور دوسرا حصّہ شمال مغرب میں واقع ہوگا۔ درمیان میں ایک ہزار میل کا علاقہ ہندوستان کے پاس ہوگا۔ اس لیے کم از کم پاکستان کے دو حصّوں کی حد تک صوبائی خود مختاری ضروری ہوگی۔ اس لیے قرار دادِ پاکستان میں "ریاست" کے بجائے "ریاستوں" کا

لفظ استعمال کیا گیا تھا۔ لہٰذا قرار دادِ پاکستان کی روشنی میں بھی مشرقی پاکستان کی طرف سے صوبائی خود مختاری کا مطالبہ بالکل جائز اور درست تھا۔ قرار دادِ پاکستان کا متن درج ذیل ہے۔

قرار دادِ پاکستان

"کل ہند مسلم لیگ کی کونسل اور مجلس عاملہ کے اقدام جو کہ آئینی مسئلہ کے متعلق ہے۔ جس کی نشاندہی ۲۷ اگست، ۱۷ اور ۱۸ ستمبر ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء کی قرار دادوں میں کی گئی ہے۔ اس کی منظوری دیتے ہوئے اور تصدیق کرتے ہوئے کل ہند مسلم لیگ کا یہ اجلاس وفاق کے اس منصوبے کی جو کہ حکومت ہند کے ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کا ایک حصہ ہے۔ پُرزور طریقہ سے اس امر کا اظہار کرتا ہے کہ اس ملک کے مخصوص حالات میں وہ مکمل طور پر غیر موزوں اور ناقابلِ عمل ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے پوری طرح سے ناقابلِ قبول ہے۔

مزید برآں یہ اجلاس اس خیال کا اظہار اور بھی پُرزور انداز میں کرتا ہے۔ کیونکہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کا وائسرائے ہند کا اعلان جو کہ حکومت کی جانب سے تھا اس امر کی یقین دہانی کراتا ہے کہ یہ حکمتِ عملی اور منصوبہ جو حکومت ہند کے ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء پر مبنی ہے اس پر ہندوستان کی مختلف جماعتوں، مکتبہ فکر اور قومیتوں سے تبادلۂ خیال کے بعد مزید غور کیا جائے گا۔ ہندوستان کے مسلمان اس وقت تک مطمئن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس آئینی منصوبے پر از سرِ نو غور نہ کیا جائے اور اسے مکمل طور پر تبدیل نہ کیا جائے۔ مزید برآں یہ کہ کوئی متبادل آئینی منصوبہ مسلمانانِ ہند کے لیے اس وقت تک قابلِ قبول نہ ہو گا جب تک کہ وہ ان کی رضامندی اور منظوری سے نہ بنایا جائے گا۔ قرار پایا کہ غور و غوص کے بعد کل ہند مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ بغیر اس کے اس ملک میں قابلِ عمل

اور مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔ یعنی یہ کہ حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسبِ ضرورت ردّو بدل کر کے متصل واحدوں کو ایسے منطقے بنا دیا جائے کہ وہ علاقے جن میں مسلمان بہ اعتبارِ تعداد اکثریت میں ہیں جیسے ہندوستان کے شمالی و مغربی اور مشرقی منطقوں میں اس طرح یکجا ہو جائیں کہ وہ ایسی خود مختار ریاستیں بنیں جن کے واحد اندرونی طور پر با اختیار اور خود مختار ہوں۔ یہ کہ ان واحدوں میں اور ان علاقوں میں اقلیتوں کے لیے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفّظ کے لیے ان کے مشورے بقدرِ ضرورت مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات معیّن طور پر دستور کے اندر مہیّا کئے جائیں اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں جہاں مسلمان اقلیّت میں ہیں حسبِ ضرورت مؤثر اور واجب التعمیل تحفظات ان کے اور دوسری اقلیّتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لیے ان کے مشورے سے معیّن طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں۔

یہ اجلاس مجلس عاملہ کو یہ مزید اختیار دیتا ہے کہ وہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق دستور کی ایسی اسکیم مرتّب کرے جس میں اس کا انتظام ہو کہ یہ جداگانہ علاقے ایسے تمام اختیارات لے سکیں جیسے دفاع، اُمورِ خارجہ، رسل و رسائل کروڑگیری (کسٹمس) اور دوسرے اُمور جو ضروری ہوں۔"

(۲) اب ہم نظری پہلوؤں سے ہٹ کر عملی پہلوؤں کی طرف آتے ہیں۔ عملاً صورت یہ تھی کہ یحییٰ خان کے پاس صرف دو ہی راستے تھے یعنی:۔

(۱) وہ مجیب الرحمٰن کے مطالبات تسلیم کر لیتے یا پھر

(۲) انھیں یکسر مسترد کر دیتے۔

اوّلاً یہ کہ اگر یحییٰ خان شیخ مجیب الرحمٰن کے مطالبات مان لیتے تو یقیناً ملک سلامت رہتا۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ مرکز کمزور ہو جاتا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرکز کی کمزوری پاکستان کی کمزوری کے مترادف تھی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ "ہرگز نہیں" عصر حاضر کے سیاسی نظریات نے اختیارات کی مرکزیت کے تصوّر کو باطل کر دیا ہے اور اس کی جگہ اختیارات کی تقسیم کے اصُول کو بہتر قرار دیا ہے۔ پاکستان کے معروضی حالات اور جغرافیائی محلِ وقوع کا تقاضا تھا کہ مشرقی پاکستان کو مکمل خود مختاری حاصل ہوتی تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر ترّقی کے راستے پر گامزن ہونے کی کوشش کرتا۔ مشرقی پاکستان کی ترقی، خوشحالی اور استحکام پورے پاکستان کی ترّقی و خوشحالی کا باعث بنتے۔

دوئم یہ کہ یحییٰ خان نے دوسرا راستہ اختیار کیا یعنی مجیب الرحمٰن کے مطالبات کو یکسر مسترد کر کے فوجی طاقت کے بل بوتے پر مشرقی پاکستان پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوشش کی۔ یہ کاروائی حسبِ ذیل وجوہات کی بناء پر ناپسندیدہ، غلط اور قابلِ مذمّت تھی۔

(۱) مشرقی پاکستان میں بنگلہ قومیت کی تحریک نے تمام آبادی کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا تھا۔ اور حصولِ مقاصد کے عزم نے پوری قوم میں قربانی کا بے پناہ جذبہ پیدا کر دیا تھا جسے فوجی طاقت سے بھی شکست دینا ممکن نہ تھا۔

(۲) پوری دنیا اور بالخصوص بھارت کی ہمدردیاں بنگالیوں کے ساتھ تھیں۔ اس سیاسی پس منظر میں فوجی قوّت پر انحصار کرنا فاش سیاسی غلطی تھی۔

(۳) یہ سوچنا کہ اسلام آباد میں بیٹھ کر بنگالیوں کی مرضی کیخلاف مشرقی پاکستان پر طاقت سے حکومت کی جا سکتی ہے، سراسر احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف تھا۔ امریکہ کی مثال دنیا کے سامنے ہے کہ اپنی پوری طاقت اور وسائل

کے استعمال کے باوجود امریکہ ویتنام کو شکست دینے میں کامیاب نہ ہوسکا، تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ پاکستان اپنے محدود وسائل اور جغرافیائی بُعد کے باوجود مشرقی پاکستان پر فوجی برتری حاصل کرلیتا۔

(۴) مشرقی پاکستان کے عوام مسلمان تھے اور اس ملک کے شہری بھی۔ پاکستان کی فوج مغربی پاکستان کے مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ بھائی کے ہاتھوں بھائی کا قتلِ عام کرانا ایک سنگین اور ناقابلِ معافی جرم ہے۔ یہ درست ہے کہ قتلِ عام کی ابتداء بنگالیوں نے کی تھی لیکن کوئی بھی برائی قابلِ تقلید ہرگز نہیں ہوتی بلکہ قابلِ نفرت و حقارت ہی ہوتی ہے۔ اس لیے بنگالیوں کی کاروائی کو مسلح فوج کشی کا جواز نہیں بنایا جاسکتا تھا۔

۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کی رات کو فوجی کاروائی کا آغاز کر دیا گیا۔ اس سے قبل فوج نے اہم مقامات اور مکتی باہنی کے ٹھکانوں کو نشانہ بنانے کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر تیار کرلیا تھا۔ مکتی باہنی بیشک ایک مسلح تنظیم تھی۔ لیکن ایک مکمل اور بھرپور فوجی حملے کے سامنے ہرگز نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ اسی لیے وہ پسپا ہوگئی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی مکتی باہنی کا فوجی ہیڈ کوارٹر تھا۔ جہاں اسلحہ اور گولہ بارود جمع کیا گیا تھا۔ یونیورسٹی خالی کردی گئی تھی اور گولہ بارود قبضہ میں لے لیا گیا تھا۔ اس کاروائی میں ہزاروں افراد جان سے مارے گئے یا پھر زخمی ہوگئے ـــ جبکہ لاکھوں افراد نے بھارت میں پناہ لے کر جان بچائی۔ بھارت نے سرحدی علاقے میں پہلے سے ہی تربیتی کیمپ قائم کر رکھے تھے۔ جہاں بنگالیوں کو فوجی تربیت دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کے جاتے ہی فوجی تربیت کا آغاز کردیا۔ صوبائی پولیس تقریباً چھتیس ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ تقریباً تین چوتھائی پولیس اپنے اسلحہ سمیت مکتی باہنی سے مل گئی۔ بھارت میں بنگالیوں کو گوریلا تربیت دی جاتی تھی۔ یہ

لوگ بھارت سے آتے اور اپنے ہدف کو تباہ کر کے واپس بھاگ جاتے جبکہ اس کارروائی کے نتیجے میں ہزاروں بے گناہ افراد انتقام کا نشانہ بنتے تھے۔ اسی لیئے مشرقی پاکستان میں خانہ جنگی کے دوران انتہائی المناک واقعات رونما ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک فاتح فوج نے دشمن ملک پر فتح حاصل کر لی ہے۔

جنرل ٹکا خان کو زندگی میں پہلی دفعہ جرنیلی کے بھرپور جوہر دکھانے کا موقع ملا تھا اس لیے انہوں نے اس میں کوئی کمی نہ آنے دی اور دشمن فوج کا قلع قمع کر دیا۔ اس طرح کا موقع جنرل فیض علی چشتی کو بھی ملا تھا۔ جب انہوں نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی آئینی حکومت کے خلاف فوجی بغاوت کے دوران جرنیلی کے جوہر دکھائے تھے۔ بنگالیوں کے متعلق پاکستان کی نوکر شاہی کا نظریہ انتہائی ذلت و حقارت آمیز تھا۔ یہ باوقار اور پُر شکوہ حضرات ان غریبوں کو انسانیت کے دائرے تک سے ہی خارج سمجھتے تھے۔ مسٹر ایم۔ اے۔ کے چوہدری خانہ جنگی کے دوران مشرقی پاکستان کے انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ انہوں نے نہایت محتاط انداز میں چند واقعات تحریر کیئے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) "وسط مئی ۱۹۷۱ء میں مجھے بطور انسپکٹر جنرل پولیس مشرقی پاکستان تعینات کر کے بھیجا گیا۔ ڈھاکہ روانہ ہونے سے قبل میں ایک اور پولیس افسر کے ہمراہ سید نذیر احمد رضوی کے پاس گیا تاکہ مشرقی پاکستان کے متعلق کوئی خاص ہدایت ہو تو لے لی جائے۔ رضوی صاحب اسوقت انٹیلی جنس بیورو کے ڈائریکٹر تھے۔ مشرقی پاکستان کے ہنگاموں میں ان کا داماد قتل ہو گیا تھا۔ مجھے جو ہدایت رضوی صاحب نے دی وہ بہت مختصر اور عجیب تھی۔ انہوں نے کہا کہ اپنے ساتھ بہت سے نوجوان پٹھان سپاہی لے جاؤ اور وہاں ان کو کھلا چھوڑ دو تاکہ آئندہ بنگالی نسل نیلی آنکھوں والی پیدا ہو۔ رضوی صاحب چونکہ اپنے داماد کی موت پر سوگوار تھے میں نے ان

کی بات کو اس صدمے کا نتیجہ سمجھ کر سُنی اَن سُنی کر دیا۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ یہ بات دل سے کہہ رہے تھے۔

یعنی محترم رضوی صاحب منظم زنا کاری کا درس دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ جس انتظامیہ کا سربراہ یحییٰ خان ہو گا اس سے اس قسم کی تعلیمات کی توقع ہی کی جا سکتی تھی۔

جناب چوہدری صاحب ٹکا خان کے عدلِ جہانگیر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

(ب) "پی آئی اے کے ایک ملازم پر مکتی باہنی سے رابطہ رکھنے کا شبہ تھا اور اس کی گرفتاری مطلوب تھی۔ گرفتار کرنے والی پارٹی نے گھر کے تمام مرد پکڑ لیے۔ ان میں سے اس لڑکے کا ستّر سالہ ذیابیطس کا مریض باپ اور ایک سرکاری ماہر امراضِ چشم ڈاکٹر بھی شامل تھے۔ مجھے علم ہوا تو میں نے آدھا دن لگا کر اور گورنر ٹکا خان کی مداخلت سے بیچارے بے گناہ افراد کو رہا کروایا۔ جب تک یہ لوگ رہا ہوئے ذیابیطس کا بوڑھا مریض قریب المرگ ہو چکا تھا۔

ایک دن اطلاع آئی کہ ڈھاکہ کے مضافات میں ایک دھماکہ ہوا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ گاؤں کے تمام مردوں کو سڑک پر منہ کے بل لٹایا ہوا تھا اور ہاتھ پاؤں پھیلا رکھے تھے۔ ان میں کئی سفید ریش باعزّت لوگ بھی تھے ایک افسر اُن کے درمیان کھڑا اپنی قوّت کے مظاہرے سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرے کہنے پر ان لوگوں کو رہا کیا گیا اور وہ بے چارے اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گئے۔

کئی ایک بنگالی افسر شک کی بناء پر گرفتار کر لیے گئے تھے۔ بہت سے دیگر افسران بھی اسی مد میں گرفتار تھے۔ ان افسران کو ایک کیمپ جیل میں رکھا ہوا تھا جس کے گرد کانٹے دار تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ نہ تو ان افسران پر کوئی مقدمہ چلایا جا رہا تھا اور نہ ہی انھیں چھوڑنے کا کوئی ارادہ نظر آتا تھا۔ میں نے

گورنر سے بار بار کہا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے کیا جائے تا کہ ان بے چاروں کے خاندانوں میں تشویش ختم ہو۔ بالآخر گورنر نے مجھے اپنا نمائندہ بنا کر کیمپ جیل میں بھیجا تاکہ میں دریافت اور تفتیش میں مدد دوں۔ میری کاوش سے بہت سے افسران جنکے خلاف کوئی خاص شہادت نہیں تھی رہا ہو گئے۔"

خود فریبی کا انجام تباہی

یہ تھے وہ چند حقائق جو آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ ان مختصر لیکن جامع حقائق سے آپ ان انتہائی تکلیف دہ اور صبر آزما حالات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جن سے اس وقت بنگلہ قوم کے بے شمار مرد و زن، بچے، بوڑھے اور جوان دوچار تھے۔ ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ بنگالی قوم کے تمام ہی لوگ بے گناہ اور معصوم تھے لیکن اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق ان پر ہونے والے یکے بعد دیگرے ہر طرح کے مظالم جو عرصۂ دراز سے ہوتے رہے تھے کو وہ کب تک سہتے اور خاموش رہ کر ظلم و ستم کا نشانہ بنے اپنی قسمتوں کے نام نہاد ٹھیکیداروں کا منہ تکتے ہوئے اپنی زندگیاں جو سراسر ایک مسلسل عذاب بنی ہوئی تھیں گزارتے رہتے۔ ہر چیز کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ "ظلم پھر ظلم ہے۔ بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔"

ہماری قوم کی سب سے بڑی ایک بدنصیبی یہ بھی رہی ہے کہ ہم حقائق کو سرے سے تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے اور خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ کبوتر بلّی کو سامنے دیکھ کر موت کے خوف سے سہم جاتا ہے لیکن اپنی آنکھیں موند کر بیٹھا رہتا ہے شاید یہ سمجھ کر کہ اس طرح بلّی اس پر حملہ آور نہیں ہوگی یا موت کا خطرہ ٹل جائے گا۔ حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہوتی ہے۔ بلّی تاک میں رہتی ہے اور جب کبوتر کو آنکھیں

بند کئے دیکھتی ہے اور کوئی مدافعانہ حربہ استعمال کرنے سے عاری پاتی ہے تو ایک ہی جست میں اُسے لقمہ بنا لیتی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ کبوتر کس طرح اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور بلّی نے اپنا کام منٹوں بلکہ سیکنڈوں میں دکھا دیا۔
یہی حال ہمارا بھی ہے کہ ہم خطرات کو واضح طور پر دیکھتے ہوئے بھی ان کا کوئی مداوا نہیں کرتے بلکہ خوش فہمی کا شکار ہو کر وقت گزارتے رہتے ہیں۔ حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ اگر ہم ابتداء ہی سے حقائق کا سامنا کرتے اور اپنے ہی مشرقی پاکستانی مسلمان بھائیوں کی جائز شکایات کا خوشدلی سے ازالہ کرتے رہتے تو یقیناً ہمیں دسمبر ۱۹۷۱ء کے ان المناک و ذلّت آمیز حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا اور اس آسانی سے ملک دو لخت نہ ہوتا۔ اور ہمیں اسلامی تاریخ کے سیاہ ترین باب کے رقم کرنے پر تمام دنیا کے سامنے یوں رسوا نہ ہونا پڑتا۔

ستم ظریفی حالات کی یہ رہی کہ ہر ایک ظلم اور زیادتی کے بعد کسی نے بھی اُسے ظلم و زیادتی ہی نہیں سمجھا بلکہ اُسے اپنا حقِ حکمرانی جانا اور طاقت و حکمرانی کے نشے میں بدمست رہ کر یکے بعد دیگرے پہلے سے بھی بڑھ کر مزید ستم ڈھاتے رہے اور احتجاج کی صورت میں اپنے ان بھائیوں کو غلیظ اور غیر شریفانہ خطابات سے بھی نوازتے رہے۔ شاید یہ جان کر کہ یہ مملکت خداوند تعالےٰ نے دی ہی ہمیں اس لیے ہے کہ ہم خود عیش و عشرت کی زندگی گزاریں، طاقت کے بل بوتے پر دوسروں کے جائز حقوق غصب کریں اور پھر اظہارِ ندامت تو کجا ان پر فخر بھی کرتے رہیں۔ اس ناروا اور ظالمانہ سلوک کا آغاز قیامِ پاکستان کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر لمحے مختلف انداز سے اضافہ ہی ہوتا گیا لیکن فوجی آمروں جن میں ایوّب خان اور

یحییٰ خان سرِ فہرست ہیں۔ نے سول نوکر شاہی کے ڈھائے گئے مظالم کو بھی شرمندہ کر دیا۔ حقائق کو جتنا بھی دبایا جائے وہ بالآخر سامنے آکر ہی رہتے ہیں۔ بنگلہ دیش کا وجود ہمارے ناعاقبت اندیشانہ طرزِ عمل ہی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے ان مظالم کی داستانیں خود ہم سننے تک آمادہ نہیں جبکہ دنیا بھر کے حرّیت پسند عوام نے بنگلہ قوم پرستوں کو ان کی جدوجہد پر سلام پیش کیا۔

اللہ کا قانون سب ہی انسانوں کے لیے ایک ہے اس لیے کہ وہ سب ہی کا خالق و مالک ہے۔ یہ ہماری ناسمجھی یا خوش فہمی ہی ہے کہ خدا تو صرف ہمارا ہی ہے۔ ان خود فریبیوں کا سبب محض یہی ہے کہ ہم نے دینِ اسلام کے زرّین اصولوں اور قرآنِ پاک کی روشن ہدایتوں اور اپنے پیغمبرِ اسلام کی روشن تعلیم ہی کو خیرباد کہہ دیا اور دنیاوی معاملات کے ساتھ ساتھ دینی امور میں بھی منافقت کو اپنا اصولِ زندگی بنا لیا۔ جس کا خمیازہ ہم نے بنگلہ دیش کے وجود کی شکل میں اٹھایا۔ ہمارا اگر یہی حال رہا تو نہ جانے اور کیا کیا دیکھنا پڑے کہ مکافاتِ عمل اٹل ہے۔ ۲۱ اپریل ۱۹۷۱ء کو بھارتی حکومت نے اعلان کیا کہ مشرقی پاکستان سے ۲،۵۸،۷۳۴ (دو لاکھ اٹھاون ہزار سات سو چونتیس) افراد ہجرت کر کے بھارتی علاقے میں داخل ہو چکے ہیں۔ مئی ۱۹۷۱ء میں بھارتی انسٹیٹیوٹ آف ڈیفنس اسٹڈیز کے ڈائریکٹر مسٹر سبرامنیم نے انڈین کونسل آف ورلڈ افیئرز کے سامنے اپنا ایک مقالہ پیش کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ :۔

" لاکھوں مہاجرین کو غیر معیّنہ مدّت تک پالنے کی بجائے اقتصادی نقطۂ نظر سے بہتر ہوگا کہ بنگلہ دیش کا مسئلہ جنگ کے ذریعے طے کر دیا جائے۔ کیونکہ مشرقی پاکستان زیادہ دیر تک بھارت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چین اس جنگ میں ہرگز مداخلت نہیں کرے گا۔ البتہ پاکستان مغربی محاذ پر جنگی کاروائی شروع

کرسکتا ہے۔"

یہ مقالہ "لندن ٹائمز" نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۷۱ء میں شائع کیا تھا۔ بھارتی حکومت مئی/جون ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے کے لیے پورے طور پر تیار تھی۔ مگر چیف آف اسٹاف نے مون سُون اور موسمی حالات کی خرابی کی وجہ سے جنگی کارروائی کو ملتوی کرادیا اور فیصلہ کیا کہ اس مقصد کے لیے سردیوں کا موسم بہترین ثابت ہو گا۔ اس تاخیر سے بھارت کو یہ فائدہ بھی پہنچا کہ بھارت نے تقریباً ایک لاکھ بنگالیوں کو فوجی تربیت دے کر پاکستان آرمی کے مدِمقابل لا کھڑا کیا۔ اس کے علاوہ بھارت نے سیاسی سطح پر بھی کئی کامیابیاں حاصل کیں۔ بھارت نے پوری دنیا میں پاکستان کے خلاف پروپیگنڈہ کرکے عالمی رائے عامّہ کو پاکستان کے خلاف منظّم کر دیا۔ اس کے علاوہ بھارت نے اگست میں روس کے ساتھ بیس سالہ دفاعی معاہدے پر دستخط کئے۔ اور ۱۲ نومبر ۱۹۷۱ء کو اسرائیل سے اسلحہ خریدنے کا معاہدہ بھی کر لیا۔

یحییٰ خان نے ۲۱ مئی ۱۹۷۱ء کو عام معافی کا اعلان کیا اور بھارت میں پناہ لینے والوں سے واپس وطن آنے کی اپیل بھی کی۔ مگر اس معافی اور وطن واپسی کا نتیجہ کچھ الٹا ہی ہوا کیونکہ واپس لوٹنے والوں میں زیادہ تر گوریلے ہی تھے۔ جنہوں نے واپس آکر تخریبی کارروائیوں میں اضافہ کرکے کئی کامیاب کارروائیاں کیں، مثلاً ۱۵ اگست کو چٹاگانگ کی بندرگاہ پر تین بحری جہاز اور ایک تیل بردار جہاز ڈبو دیئے گئے۔ کئی پل اور فیکٹریاں تباہ کر دی گئیں۔ لیکن اس کے باوجود یحییٰ خان اور ان کے ساتھی جنرل عبدالحمید، جنرل پیرزادہ، جنرل عمر اور دیگر اعلیٰ افسران کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان کا مسئلہ حل ہو چکا ہے۔ یحییٰ خان نے جناب جسٹس کارنیلئس کو پاکستان کے آئین کی تیاری پر مامور

کر دیا۔ اس عجیب و غریب صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے مصر کے مشہور صحافی اور دانشور جناب محمد حسنین ہیکل نے نہایت افسوس کے ساتھ لکھا تھا کہ:۔

"پاکستان کا برسرِ اقتدار طبقہ اپنی ناک کے آگے نہیں دیکھ سکتا"۔

اپنی تمام تر تیاری مکمل کرنے کے بعد ۲۲ر نومبر ۱۹۷۱ء کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کر کے باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا۔ ۲۳ر نومبر کو یحییٰ خان نے ملک میں ہنگامی حالت نافذ کرنے کا اعلان کر دیا۔ پاکستانی فوج کو دوطرفہ محاذِ جنگ کا سامنا تھا۔ یعنی سامنے سے تو بھارت کی فوج تھی اور عقب سے مکتی باہنی کے گوریلے گھات لگائے حملہ کر رہے تھے۔ ۳ر دسمبر کو مشرقی پاکستان پر دباؤ کم کرنے کی غرض سے یحییٰ خان نے مغربی محاذ کھول دیا اور اس طرح پورا ہی ملک جنگ کی لپیٹ میں آگیا۔ یحییٰ خان نے ان حالات کے نتائج کی ذمہ داری منتقل کرنے کے لیے ۷ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو مخلوط کابینہ تشکیل دی۔ جس میں جناب نورالامین کو وزیرِ اعظم اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کو نائب وزیرِ اعظم اور وزیرِ خارجہ مقرر کیا گیا۔ جو اقوام متحدہ کے اجلاس میں شرکت کے لیے نیویارک روانہ ہو گئے۔ ۱۵ر دسمبر کو پولینڈ نے پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ بند کرانے کے لیے ایک قرارداد پیش کی۔ جس کا متن یہ تھا:۔

پولینڈ کی قرارداد

۱۔ حکومتِ پاکستان ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کو اقتدار منتقل کر دے گی۔

۲۔ اقتدار کی منتقلی کے بعد جنگ بند ہو جائے گی۔

۳۔ جنگ بندی کے بعد افواجِ پاکستان مختلف منتخب مقامات پر جمع ہوں گی اور مشرقی پاکستان سے ان کا انخلاء ہو گا۔

۴۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے باشندے اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے جائیں گے۔

۵۔ بھارتی فوجوں کا انخلاء پاکستانی فوجوں کی واپسی کے بعد ہوگا بھارتی افواج کی واپسی نئی قائم شدہ حکومت کے صلاح مشورے سے شروع ہوگی۔

۶۔ قرارداد میں بھارت اور پاکستان کو یہ امر تسلیم کرنے پر زور دیا گیا تھا کہ جو علاقے طاقت سے حاصل کیے گئے ہیں انہیں واپس کیا جائے گا۔ اس اصول کا اطلاق مغربی محاذ پر حاصل شدہ علاقوں پر بھی ہوگا۔

۷۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کر دیا جائے گا۔

اس قرارداد پر پاکستان کے نمائندے جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ نے جس ردِّ عمل کا اظہار کیا اس کی تفصیل اخبارات میں کچھ اس طرح شائع ہوئی تھی:۔

"پاکستانی نمائندے مسٹر ذوالفقار علی بھٹوؔ جو نامزد نائب وزیرِ اعظم اور وزیر خارجہ بھی تھے یہ قرارداد دنیا بھر کی نمائندگی کرنے والوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دی اور اجلاس سے اٹھ کر باہر چلے گئے اور کہا کہ وہ پاکستان پر شرمناک قبضے میں فریق بننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انہوں نے اس موقع پر جذبات سے مغلوب ہو کر کہا کہ سلامتی کونسل نے بھارتی جارحیت کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ ہم یہاں ہتھیار ڈالنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ عالمی ادارے کو سیکرٹری جنرل کی نہیں جلادؔ کی ضرورت ہے اس موقع پر انہوں نے فرانس اور برطانیہ کی مذمّت بھی کی اور کہا کہ ان ملکوں کو غیر جانبدار بننے کی بجائے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرنا چاہیئے تھا انہوں نے بھارتی وزیر خارجہ مسٹر سورن سنگھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ وہ آزاد ملک میں بہرے دار بنتا

پسند کریں گے۔ لیکن بھارت میں وزیر خارجہ بننا نہیں۔ مشرقی پاکستان کا سقوط ہو جائے یا مغربی پاکستان کا ہم اپنی بقا کے لیے ایک ہزار سال تک جنگ لڑیں گے۔"

واک آوٹ کرنے کے بعد انہوں نے اخبار نویسوں سے کہا کہ وہ بھارت کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالیں گے وہ یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے دشمن سے جنگ لڑیں گے۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو کے اس مندرجہ بالا ردِ عمل کی وجہ سے ان کے مخالف اکثر انھیں تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر مسٹر بھٹو اس قرارداد کو منظور کر لیتے تو پاکستان دو ٹکڑے ہونے سے بچ جاتا۔ لیکن اِن مخالفین کے اس استدلال کو دیکھ کر ہمیں سخت حیرت ہوتی ہے اور یہ مصرعہ بے ساختہ زبان پر بار بار آتا ہے کہ:۔

ع "بایں عقل و دانش بباید گریست"

قرارداد کا متن بالکل واضح بتا رہا ہے کہ یہ قرارداد پاکستان کو جوڑنے کے لیے نہیں بلکہ اسے توڑتے ہی کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اس پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا تھا بلکہ مغربی پاکستان کا وہ حصہ جس پر جنگ کے دوران بھارت نے قبضہ کر لیا تھا اس قرارداد کے توسط سے مستقل طور پر بھارت کو دیا جا رہا تھا۔ اس صورت میں کون محبِ وطن شخص اس قرارداد کو منظور کرنے کی جسارت کر سکتا تھا۔ لیکن عملی اعتبار سے ہمارے مقدر میں شکست تھی۔ مگر اس بدترین اور ذلت آمیز شکست کی کوئی مثال اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جنگ کے پس منظر اور نتائج پر پوری دنیا کے ماہرین نے تبصرے کیے تھے۔ یہ مسئلہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے لیکن پاکستانی قوم اس تلخی کی شدت کو رہتی دنیا تک محسوس کرتی رہے

گی یہاں ہم صرف چند نہایت اہم تبصروں کا ذکر کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں:۔

۹۔ بھارت کے ایک مقتدر رہنما اور سابق وزیر اعظم جناب مرارجی ڈیسائی نے ایک اطالوی صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ "اپریل سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک بھارتی فوج کے باقاعدہ سپاہی مکتی باہنی کے روپ میں پاکستانی فوج سے برسرپیکار رہے۔ اس خفیہ کارروائی میں پانچ ہزار جانوں کے ضیاں کے بعد مسز اندرا گاندھی نے پاکستان کے خلاف کھلی جنگ کا اعلان کر دیا۔ اندرا جنگ جیتنے میں کامیاب ہو گئیں کیونکہ یحییٰ خان بے وقوف تھا۔"

سقوطِ ڈھاکہ:۔ قرار دادِ پولینڈ ویسے بھی غیر مؤثر ہو چکی تھی۔ اس لیے کہ اس قرار داد کے پیش ہونے سے پہلے ہی جنرل راؤ فرمان علی ڈھاکہ میں مقیم اقوام متحدہ کے نمائندے سے جنگ بندی کی اپیل کر چکے تھے اور اس اپیل کی روشنی میں ۱۶ دسمبر کو "جنرل نیازی" نے بھارتی فوج کے کمانڈر "جنرل اروڑا" کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اور اسی کے ساتھ مغربی پاکستان میں بھی جنگ بندی کر دی گئی تھی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ قرار داد منظور ہو جانے سے پاکستان بچ جاتا سراسر ایک خوش فہمی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ ان تمام تر حقائق کی روشنی میں جناب بھٹو کے مخالفین کی کسی بھی دلیل یا اعتراض میں ذرہ برابر کوئی حقیقت یا وزن نظر نہیں آتا۔ حقائق سے پردہ پوشی کبھی بھی حقائق کو نہیں بدل سکتی اور غالب کے الفاظ میں صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ:۔

ع " دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔"

جنرل نیازی کے ہتھیار ڈالنے کے ساتھ ہی پاکستان کی ۹۳ ہزار فوج جنگی قیدی بن گئی۔ اور "بنگلہ دیش" ایک حقیقت بن کر دنیا کے نقشے پر ابھر آیا۔ فتح اور شکست جنگ کے لازمی نتیجے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ہر قوم
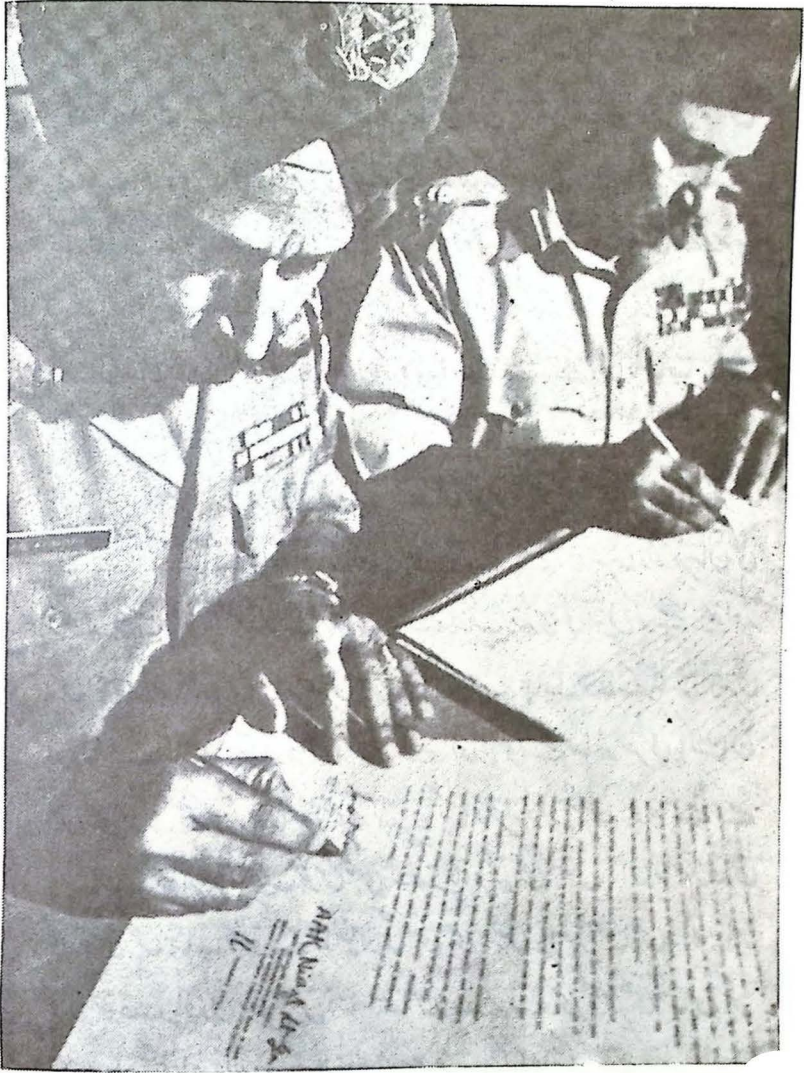
ڈھاکہ ۱۶ر دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء جنرل نیازی اور جنرل اروڑا ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کر رہے ہیں۔

کے حصے میں ایک نہ ایک نتیجہ ضرور آتا ہے۔

(ب) مشرقی پاکستان کے آخری انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر ایم۔ اے۔ کے چوہدری لکھتے ہیں کہ:۔

"یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان کی جوائنٹ کونسل جو گورنر، مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر، چیف سیکرٹری اور گورنر کے فوجی مشیر پر مشتمل تھی سے کہا کہ وہ حالات کے مطابق خود ہی فیصلہ کریں کہ کیا کرنا چاہیئے۔ کونسل نے بہتیرا کہا کہ ابھی تک ہمارا آپ کا رابطہ برقرار ہے لہٰذا آپ ہی حالات کے مطابق ہدایت دیں۔ یحییٰ خان نے اصرار کیا کہ کونسل فیصلہ کرے۔ جب کونسل نے صرف مشرقی پاکستان کے محاذ پر جنگ بندی کے لیے سلامتی کونسل کو ایک قرارداد بھجوائی تو یحییٰ خان نے یہ کہہ کر وہ قرارداد منسوخ کرادی کہ کونسل نے اپنے اختیارات سے تجاوز کر کے مشرقی اور مغربی دونوں محاذوں پر جنگ بندی کی تجویز دی ہے۔ اس قرارداد کی منسوخی کے تین دن بعد اس نے مشرقی پاکستان کے گورنر اور فوجی کمانڈر کو ہتھیار ڈالنے کی ہدایت کر دی۔ یہ بات میرے ذاتی علم میں ہے کہ ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء کی صبح کو ہتھیار ڈال دینے کی ہدایت ملنے کے بعد جب گورنر مشرقی پاکستان نے صدرِ پاکستان کو ٹیلی فون کیا تو ان کی بات نہ ہو سکی۔ اسٹاف افسروں نے کہا کہ صدر صاحب بہت مصروف ہیں۔ گورنر کے اصرار پر انہوں نے کہا کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔؟ گورنر نے کہا کہ آدھا ملک جا رہا ہے، کیا میں بطورِ نمائندہ صدر اور گورنر صدر سے بات بھی نہیں کر سکتا۔ اسٹاف افسر نے جواب میں ٹیلی فون بند کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یحییٰ خان شراب کے نشے میں چور تھا اور بات کرنے کا اہل نہیں تھا۔ ہتھیار ڈالنے کے نتیجے میں لامحالہ مشرقی پاکستان ملک کا حصہ نہ رہا۔ اس طرح ملک توڑنے کے اس ناقابلِ معافی جرم کو یحییٰ خان

اور اس کے ٹولے نے ڈرامائی انداز میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا لیکن ان کی خواہشات کے برعکس خود ان کی بچہ سقہ والی حکومت بھی ختم ہو گئی۔

مشرقی پاکستان میں اس ذلت آمیز شکست کے بعد پاکستانی فوج لڑکھڑا گئی۔ اس نے اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کیا جو اس وقت مغربی پاکستان میں اکثریتی پارٹی کے قائد تھے۔ قوم نے یحیٰی خان پر بڑی لعن طعن کی۔ اچھا ہوا کہ اُسے حفاظتی حراست میں رکھ لیا گیا تھا ورنہ لوگ یقیناً اُسے برسرِ عام پھانسی دینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ اس حفاظتی حراست کے زمانے میں جب وہ ایک پولیس کی کار میں لے جایا جا رہا تھا تو لوگوں نے دیکھ لیا اور بے تحاشا پتھر کار پر مارے۔"

حقیقت یہ ہے کہ یحیٰی خان اور اس کے ساتھی جرنیلوں بشمول جنرل نیازی اور جنرل راؤ فرمان علی نے پاکستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرا کے انتہائی سنگین اور ناقابلِ معافی جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس دنیا میں تو وہ جرائم کی سزا سے بچ گئے لیکن اللہ تعالےٰ کے ہاں اس کے انصاف سے ہرگز نہ بچ سکیں گے۔ اگر ان کے خیال میں ہماری تباہی کی اصل ذمہ دار مسز اندرا گاندھی ہیں تو بھی انہیں بطورِ گواہ پیش ہو کر اپنی صفائی ضرور پیش کرنا پڑے گی۔ بقولِ مرزا غالب :-

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

جرنیلوں کے جرائم کی نوعیت دو طرح کی تھی جو منفی اور مثبت اقدام سے مرتب ہوئے تھے۔ انتخابات کے بعد مشرقی پاکستان میں حالات کو دانستہ طور پر بگڑنے دیا گیا اور اصلاح کی کوئی بھی کوشش سنجیدگی اور دیانتداری سے نہیں کی گئی۔ بالآخر خرابی ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی جہاں سے پُرامن اور باوقار واپسی کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ پھر جب خرابی کی آخری منزل پر پہنچ

کہ جنگ کی ابتدا کر دی گئی تو پھر اس شرمناک اور ذلت آمیز انداز میں ہتھیار ڈالنے کی سنگین غلطی بھی کی گئی۔ اگر کوئی ایک جرنیل بھی سینہ تان کر زندگی کے آخری سانس تک لڑنے کا پُرعزم اعلان کر دیتا تو ہم یقین و وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کی بہادر فوج کبھی ہتھیار نہ ڈالتی، سپاہی جان دینے کے لیے تیار تھے مگر جرنیلوں کا دم گھُٹ رہا تھا۔ دنیا کی مادی لذتیں انھیں شہادت کے پُرخطر لیکن عظیم راستے سے روک رہی تھیں۔

میں جب کبھی نام نہاد مجاہدِ اعظم جنرل ضیاء الحق اور اس کے رفقاء اور خاص کر اس کے تیس مار خاں جرنیل فیض علی چشتی کے کردار کو دیکھتا ہوں تو مجھے پنجاب کی وہ رومانوی داستانیں جنہیں 'ہیر رانجھا'، 'سوہنی مہینوال'، 'سیف الملوک'، 'بدیع الجمال' اور 'مرزا صاحباں'، جنہوں نے بہت شہرت پائی ہے یاد آتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میاں محمد صاحب کی سیف الملوک اور سید وارث شاہ کی 'ہیر رانجھا' پنجابی ادب کی شاہکار ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے ہجر و وصال کی کیفیات کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کتابوں کو دنیا کے ادبِ عالیہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں 'سوہنی مہینوال' کا ایک نقشہ آیا ہوا ہے جو کچھ اس طرح سے ہے کہ:۔

"سوہنی رات کے وقت مٹی کے گھڑے کے سہارے دریائے چناب عبور کر کے اپنے محبوب مہینوال سے ملنے کے لیے جنگل میں جایا کرتی تھی۔۔۔ اس کی نند نے سوہنی کو ڈبونے کے لیے پکّے کے بجائے کچّا گھڑا رکھ دیا۔ سوہنی کچّا گھڑا ہی لے کر حسبِ معمول دریا میں کود گئی۔ کچّا گھڑا مٹی بن کر پانی میں بہہ گیا۔ اور سوہنی کو دریا کی موجوں نے گھیرے میں لے لیا۔ جب سوہنی ڈوب رہی تھی تو اس نے پکار کر کہا:۔

ص پچھاں ہٹ پچھاں وے چنہاں دیا پانیڑیاں
جیجھے پیا مارنا ایں بیگانیاں زنانیاں
کچا گھڑا توڑیا تے سوہنی نوں توں روہڑیا
پکا گھڑا توڑ داتے و یکھدے جوانیاں

ترجمہ: "اے چناب کے پانی پیچھے ہٹ۔ تو کیوں پرائی عورتوں کے گلوگیر ہو رہا ہے۔ تو نے کچا گھڑا توڑ دیا اور سوہنی کو بہا دیا۔ ہم تیری طاقت کو دیکھ لیتے، اگر تو پکا گھڑا توڑتا۔"

کہنا دراصل یہ ہے کہ مارشل لا کی طاقت سے اپنی ہی قوم کو فتح کرتے رہنا بڑی آسان بات ہے۔ کاش اس طاقت کا مظاہرہ کبھی دشمن کے سامنے بھی کیا جاتا۔

اتنی بڑی شکست کے بعد جرنیل بمشکل تمام اقتدار سول حکومت کو منتقل کرنے پر راضی ہوئے تو جناب ذوالفقار علی بھٹو نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ جناب بھٹو صاحب نے ہندوستان کے ساتھ شملہ معاہدہ کیا اور ۹۳ ہزار جنگی قیدیوں کو بغیر کسی جنگ اور کشت و خون کے اپنے کمالِ تدبّر سے دشمن کی قید سے آزاد کرا لیا۔ یہی نہیں بلکہ پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ بھی بھارتی فوج کے قبضے سے واپس لیا۔ نیز ۱۹۷۳ء کا آئین نافذ کیا۔ بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بھٹو صاحب نے سماجی انصاف اور اقتصادی مساوات تک پہنچنے کے لیے ملک کے معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچے میں دُور رس تبدیلیاں کیں۔ آپ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ آپ نے فرانس سے ایٹمی ری ایکٹر پلانٹ حاصل کر کے ایٹمی توانائی حاصل کرنے کی گستاخی کی تھی۔ چنانچہ اگست ۱۹۷۶ء میں امریکی وزیر خارجہ مسٹر ہنری کسنجر پاکستان آیا اور جناب بھٹو صاحب

کو اقتصادی اور سیاسی امداد کی پیش کش کی بشرطیکہ پاکستان ایٹمی توانائی حاصل کرنے کی کوشش ترک کر دے۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اس امریکی پیشکش کو مسترد کر دیا۔ اس پر مسٹر کسنجر نے جناب بھٹو کو دھمکی دی کہ:۔

"ہم تمھاری حکومت کا تختہ الٹ دیں گے اور تمھاری ذات کو ایک ہولناک مثال بنا دیں گے۔"

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جناب بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ اور ان کو ہولناک مثال بنانے کے لیے تختہ دار پر بھی چڑھا دیا گیا۔

شکست کے بعد یحییٰ خان کا منصوبہ

مشرقی پاکستان میں شکست کھا جانے اور ملک کا ایک بڑا حصہ علیحدہ ہو جانے کے بعد بھی جنرل یحییٰ خان اور ان کے رفقاء اقتدار چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے یحییٰ خان نے ڈائریکٹر انٹیلی جینس بیورو این اے رضوی سے باقی ماندہ پاکستان کے لیے ایک آئین بنوایا تھا۔ جس میں یحییٰ خان کو تاحیات صدر مملکت بنایا جانا تھا لیکن راہِ اقتدار میں مشکل یہ آن پڑی کہ عوام تو عوام خود فوج نے بھی یحییٰ خان کے منصوبے کی تائید و حمایت سے انکار کر دیا تھا۔ یحییٰ خان نے فوج کا تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنے چیف آف اسٹاف جنرل حمید کو جنرل ہیڈ کوارٹر بھیجا۔ چنانچہ جنرل حمید نے فوجی افسران سے خطاب کرنے کی کوشش کی مگر وہ اتنے زیادہ مشتعل تھے کہ انہوں نے جنرل حمید جو کہ ان کے افسران اعلیٰ تھے کی بات سننے سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ انھیں مارنے پیٹنے کی بھی کوشش کی۔ چنانچہ جنرل حمید بمشکل تمام اپنی جان بچا کر واپس آئے اس لیے کہ ان کے پاس اس واحد راستے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا چنانچہ انھوں نے

اقتدار کی منتقلی

"بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے"

صدر جنرل آغا محمد یحییٰ خان جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کو اقتدار کی منتقلی کے لیے سبکدوشی کی دستاویزات پر دستخط کر رہے ہیں ۔

یحییٰ خان کو بتا دیا کہ انھیں اب اقتدار چھوڑنا ہی پڑے گا۔

دوسری طرف ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو گوجرانوالہ میں فوجی افسروں اور جوانوں نے مطالبہ کر دیا کہ یحییٰ خان اقتدار فی الفور سول حکومت کے حوالے کر دیں۔ فوج میں اس واضح علامتی بے چینی کی اطلاع ملتے ہی فوج کی ہائی کمانڈ نے یحییٰ خان سے کہا کہ وہ اقتدار سے علیحدہ ہو جائیں بصورت دیگر فوج کی یکجہتی ختم ہو جائے گی۔ ان واقعات نے یحییٰ خان کو یقین دلا دیا کہ اب فوج بھی اس کا وجود برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔ لہٰذا انھوں نے ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اقتدار جناب ذوالفقار علی بھٹو کو منتقل کر دیا۔ جو کہ باقی ماندہ پاکستان میں ایک واضح اور بڑی اکثریت کی حامل عوامی جماعت کے سیاسی قائد تھے۔

جناب ذوالفقار علی بھٹو ایک نہایت ہی ذہین انسان تھے اور وہ تاریخی قوتوں کے عمل اور ردِعمل کا گہرا شعور رکھتے تھے اس لیے قدرتی طور پر آپ کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا کیونکہ آپ ترقی پسند نظریات کے علمبردار تھے۔ ۱۹۵۸ء میں جب آپ ایوب خان کی کابینہ میں شامل ہوئے تو امریکی دباؤ کے باوجود آپ نے پاکستان کے خارجہ تعلقات میں خوشگوار اور صحت مند رجحانات کو آگے بڑھایا تھا۔ آپ نے روس کے ساتھ تیل کی تلاش کا معاہدہ کیا تھا اور چین کے ساتھ سرحدی تنازعہ طے کر کے چین اور پاکستان کے درمیان پائیدار دوستی کی بنیاد رکھی تھی اور یہ اسی دوستی کا نتیجہ تھا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں چین نے پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ جناب بھٹو کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے ہندو ذہنیت کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوششیں کی تھیں اور خاص طور پر ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران اقوامِ متحدہ میں بھارت کے خلاف زوردار تقریریں کر کے بھارت کی نام نہاد امن پسندی کی قلعی کھول دی

تھی۔ یہ سب باتیں امریکہ کے لیے بڑی ناپسندیدہ تھیں۔ چنانچہ امریکی حکومت کے اشارے پر ہی ایوب خان نے جناب بھٹوؒ کو وزارتِ خارجہ سے علیٰحدہ کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔

اقتدار حاصل کرنے کے بعد بھٹوؒ صاحب نے مغربی بلاک اور خاص طور پر امریکہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے اور ایک تیسرے ملک کی وساطت سے امریکہ سے اسلحہ بھی خریدا لیکن اس کے باوجود امریکہ کے شکوک و شبہات رفع نہ ہو سکے اور امریکہ نے کبھی بھی جناب بھٹوؒ کو قابلِ اعتماد دوست تسلیم نہ کیا۔ اس کے علاوہ ایک اہم مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ تاریخی طور پر پاکستان کو اس مقام پر لے آئے تھے کہ یا تو پاکستان امریکہ کا دستِ نگر بن کر رہ جائے یا پھر دنیا میں ایک آزاد و خود مختار اور ترقی پسند ملک کی حیثیت سے اپنا جائز مقام حاصل کرے۔ چنانچہ جناب بھٹوؒ نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے آپ نے نہایت جامع اور ٹھوس پالیسی مرتب کی اور اس پالیسی کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے مختلف لیکن ٹھوس اقدامات کا آغاز کر دیا۔ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

(۱) اسلامی سربراہی کانفرنس

پاکستان اپنے محلِ توع، مذہبی روایات اور تاریخی و سیاسی پس منظر کے حوالے سے پوری اسلامی دنیا کے لیے بے پناہ اُمیدوں اور توقعات کا حامل ہے۔ بھٹوؒ صاحب نے پاکستان کے مرکزی کردار کو مضبوط و مستحکم بنانے اور دنیائے اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لیے تمام اسلامی دنیا کے سربراہوں کو پاکستان آنے کی دعوت دی۔ اس طرح پاکستان نے ان اکابرین کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔

اسلامی سربراہی کانفرنس میں اتحاد و یگانگت اور تعاون کو فروغ دینے کے لیے نہایت اہم فیصلے کیے گئے۔ اسلامی دنیا کا اتحاد، امریکہ کے اتحادی اسرائیل کے لیے کسی بھی طور پر قابلِ قبول نہیں تھا۔ اس لیے اسرائیل اور خاص طور پر امریکہ جو اسرائیل کے قیام اور بقاء کا ضامن ہے کے لیے پاکستان اور جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ کا یہ اقدام ہرگز ناقابلِ برداشت تھا لہٰذا امریکہ نے پاکستان اور جناب بھٹوؔ کی اس کاروائی کا انتہائی سختی سے نوٹس لیا۔

(۲) ایٹمی ری ایکٹر کا معاہدہ

چونکہ بھٹوؔ صاحب حقائق کی دنیا کے انسان تھے اور ٹھوس بنیادی حقیقتوں کو خوب پہچانتے تھے۔ جبکہ وہ اس بنیادی اور روشن حقیقت کے بھی معترف تھے کہ آج کی دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا ہے۔ کوئی بھی ملک اس کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا آپ نے فرانس سے ایٹمی ری ایکٹر حاصل کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ امریکہ اور اسرائیل کو اس معاہدے سے بھی سخت تشویش لاحق ہو گئی۔ ان دونوں اتحادیوں کو شک تھا کہ اگر پاکستان نے ایٹمی توانائی حاصل کر لی تو اس کا نشانہ لامحالہ اسرائیل ہی کو بنایا جائے گا۔ لیکن جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ نے اس دباؤ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور اس راہ میں حائل کسی بھی رکاوٹ، دھمکی اور دباؤ کو ہرگز قبول نہ کیا۔ اس ضمن میں ایک قابلِ ذکر واقعہ یہ ہے کہ اگست ۱۹۷۶ء میں امریکی وزیرِ خارجہ جناب ڈاکٹر ہنری کسنجر نے پاکستان کا دورہ کیا اور وزیرِاعظم جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ کو سیاسی اور اقتصادی امداد کی بھرپور پیشکش کی۔ مگر شرط یہ رکھی کہ "پاکستان، ہندوستان کے مقابلے میں ایٹمی توانائی حاصل کرنے کی کوشش سے دستبردار ہو جائے۔"

جناب بھٹوؔ نے ان کی تجویز کو مسترد کر دیا۔ چنانچہ ہنری کسنجر نے تمام

ایک یادگار تصویر

اسی ضیافت میں ہنری کسنجر نے جناب بھٹو کو ان کی حکومت
کا تختہ الٹنے اور ان کی ذات کو ایک خوفناک مثال بنانے کی دھمکی دی تھی

سفارتی آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے بھٹو صاحب کو دھمکی دی کہ :۔

" ہم تمہاری حکومت کا تختہ الٹ دیں گے اور تمہاری ذات کو ایک خوفناک مثال بنا دیں گے "

ہم گزشتہ ابواب میں اس امر کا جائزہ بھی لے چکے ہیں کہ امریکہ کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے کہ کسی طرح پاکستان کو ہندوستان کی طفیلی ریاست میں تبدیل کر دیا جائے۔ یا کم ازکم پاکستان کے دل میں ہندوستان کی برتری کا احساس مستحکم کر دیا جائے۔ ہنری کسنجر کا مطالبہ اس کے اسی جذبے کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ یا تو پاکستان امریکی مطالبات کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا یا پھر امریکی انتقام کا نشانہ بننے کے لیے تیار ہو جاتا۔ ان حالات میں پاکستان کا کوئی بھی قوم پرست لیڈر امریکی مطالبات کو تسلیم کر کے پاکستان کے مفادات کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا تھا۔ کجا کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو جو پوری اسلامی دنیا کے لیے آزادی اور حرّیت کی واضح علامت بن چکے تھے۔ چنانچہ جناب بھٹو نے امریکی وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر کا مطالبہ مسترد کر کے اپنی ذات اور اقتدار کو تو بے شک خطرے میں ڈال دیا تھا لیکن امریکی دباؤ کا مقابلہ نہایت دلیری سے کیا۔

امریکہ اور اسرائیل نے اپنے پرانے نیاز مند اور وفادار پیروکار جنرل ضیاء الحق کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کر کے انھیں دعوتِ پیش قدمی دی۔ چنانچہ ضیاء الحق نے نہ صرف یہ کہ بھٹو صاحب کے اقتدار کو ختم کر کے مرحوم کی ذات کو ایک خوفناک مثال بنا دیا بلکہ ضیاء الحق نے بھٹو صاحب کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملانے کے لیے ان تمام راستوں کو بند کر دیا جن سے اس ملک میں آزادی، حرّیت اور جمہوریت کے اصول فروغ پا سکتے تھے یا یہ قوم کبھی ترقی

کر کے سائنس اور ٹیکنالوجی میں خود کفالت حاصل کرنے کے قابل بھی ہو سکتی تھی جن کا خواب جناب بھٹوؔ نے اپنے منصوبوں کے ذریعے دیکھا تھا۔ چنانچہ پاکستانی قوم اور ملک کی بدقسمتی کہ امریکہ اپنے مذموم مقاصد میں توقع سے کہیں زیادہ اور بہت جلد کامیابی سے ہمکنار ہو گیا۔

جنرل ضیاء الحق کا بزورِ طاقت اقتدار پر قبضہ

۴۔۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب، رات کی تاریکی میں جنرل ضیاء الحق نے جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ کی حکومت کا ایک فوجی بغاوت کے ذریعے تختہ الٹ دیا۔ یہاں اس حقیقت سے پردہ اٹھانا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ہر فوجی آمر کی طرح جنرل ضیاء الحق نے بھی اپنے ہی محسن کے اقتدار کا خاتمہ اپنے روایتی انداز یعنی رات کی تاریکی میں ہی کیا۔

جنرل ضیاء الحق نے اقتدار پر قبضہ کر کے سب سے پہلے آئین معطل کیا۔ انہوں نے پورے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے تمام انتظامی اختیارات خود سنبھال لیے اور برسرِ اقتدار جماعت پاکستان پیپلز پارٹی اور حزبِ اختلاف کے تمام سرکردہ قائدین کو حراست میں لے لیا۔ اس کے علاوہ بھٹوؔ صاحب کی حکومت کے کئی اعلیٰ افسران جن میں ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جینس (سول)، وزیرِ اعظم کے سیکریٹری، کیبنٹ سیکریٹری، ڈائریکٹر جنرل ایف۔ آئی۔ اے وغیرہ کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ ایک رات کی کاروائی سے یہ بات از خود عیاں ہو جاتی ہے کہ ضیاء الحق کا مارشل لاء محض الیکشن میں دھاندلی یا کسی دیگر اتفاقی حادثے کی پیداوار نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک طویل اور مکمل منصوبہ بندی کارفرما تھی۔ جس کا بعد میں ضیاء الحق نے اعتراف

اس طرح کیا کہ انہوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ جون کے وسط میں مکمل کیا تھا؛ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اصل مسئلہ مارشل لاء کے نفاذ کا ہی نہیں تھا بلکہ اس کی طوالت کا بھی تھا جسے بعد کے پیش آمدہ واقعات نے بھی ثابت کر دیا کہ ضیاء الحق کا مارشل لاء عمیق منصوبہ بندی کا نتیجہ تھا اور اس کی پشت پر یہودی لابی اور امریکی سی۔ آئی۔ اے کے مقاصد کار فرما تھے۔

(۱) ضیاء الحق کی شاطرانہ چالیں

۵ جولائی کو ضیاء الحق نے پاکستان سپریم کورٹ کے چیف جسٹس جناب محمد یعقوب علی خان سے ملاقات کی اور ان سے مارشل لاء کے نفاذ کے لیے آئینی جواز فراہم کرنے کے لیے مشورہ طلب کیا۔ جناب چیف جسٹس نے ضیاء الحق کو نہایت قابلِ قدر مشورہ یہ دیا کہ :۔

۱۔ آئین کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔

۲۔ کوئی فوجی عدالت ہرگز قائم نہ کی جائے۔

۳۔ صدرِ پاکستان (چوہدری فضل الٰہی) کو اپنے عہدے پر برقرار رہنے دیا جائے۔

۴۔ مارشل لاء کی انتظامیہ قیامِ امن کے علاوہ حکومت کے دیگر کسی بھی معاملے میں مداخلت نہ کرے۔

۵۔ فوج نوّے دن کے اندر اندر انتخابات کرا کے بیرکوں میں واپس چلی جائے۔

مندرجہ بالا باتوں کے علاوہ جناب چیف جسٹس نے ضیاء الحق پر یہ بھی واضح کر دیا کہ اگر انتخابات کی معیاد یعنی نوّے دن کے اندر پاکستان کے کسی شہری نے مارشل لاء کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا تو یہ عدالت اپنے سابقہ فیصلے یعنی

"عاصمہ جیلانی کیس" کی پابندی کرے گی۔ جنرل ضیاء الحق نے چیف جسٹس صاحب کو یقین دلایا کہ مارشل لاء انتظامیہ اس مشورے کی سختی سے پابندی کرے گی۔ چیف جسٹس نے اس تمام گفتگو کا ریکارڈ مرتب کیا اور اس کی نقول تمام جج صاحبان کو بھجوادیں۔ نیز ایک نقل سپریم کورٹ کے ریکارڈ میں بھی محفوظ کر دی گئی۔

اسی دن یعنی ۵ جولائی کی شام ضیاء الحق نے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے اپنے پہلے خطاب میں اعلان کیا کہ:۔

"میں یہ بات واضح طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں کوئی سیاسی عزائم رکھتا ہوں، اور نہ ہی فوج اپنے جنگی پیشے سے الگ ہونا چاہتی ہے۔ میرا کام صرف اور صرف ملک میں الیکشن کروانا ہے جو اکتوبر ۱۹۷۷ء میں ہوں گے الیکشن کے فوراً بعد اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو سونپ دیا جائے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس پروگرام سے انحراف نہیں کروں گا۔ آئندہ تین ماہ، میں صرف الیکشن کی تیاری پر صرف کروں گا اور بطور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کسی کام میں وقت ضائع نہیں کروں گا۔"

یہ پہلا جھوٹ تھا جو ضیاء الحق نے پوری قوم بلکہ ساری دنیا کے سامنے بولا تھا۔ جرمنی کا نازی ڈکٹیٹر اڈولف ہٹلر اور اس کے وزیر بیداری عامہ ڈاکٹر گوئبلز کی بدنامی میں ایک اہم عنصر یہ بھی شامل ہے کہ وہ جھوٹ بہت بولتے تھے۔ ڈاکٹر گوئبلز کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کا مقولہ تھا کہ "جھوٹ بولو، بار بار بولو، اور اس طرح بولو کہ سچ معلوم ہونے لگے"۔ لیکن دونوں کے متعلق ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ انہوں نے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے کبھی "کتابِ مقدس" کی قسم کھائی ہو یا کتابِ مقدس کی تلاوت کے بعد جھوٹ

بولا ہو تا کہ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں مزید کسی تاویل یا ثبوت کی نوبت ہی نہ آئے۔ یہ کارنامۂ عظیم ماشاءاللہ ہمارے صدرِ مملکت کا ہی حصّہ بنا ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے اپنے ہر جھوٹ اور مکر و فریب کو "کتاب اللہ" اور کلمہ طیبہ کے تقدّس میں سمو کر پیش کیا ہے۔ موصوف کا گیارہ سالہ دورِ حکومت سراسر جھوٹ، فریب اور مکاری سے عبارت تھا۔

(۲) ضیاءالحق کے مکر و فریب کے نرالے ہتھکنڈے

ضیاءالحق ہر وقت گلے میں ایک چھوٹے سائز کا پنج سورہ حمائل کئے رہتے تھے۔ جب انہیں کوئی سنجیدہ قسم کا یا بڑا جھوٹ بولنا مقصود ہوتا تو وہ پہلے گلے سے یہ پنج سورہ نکال کر اُسے بوسہ دیتے اور پھر جھوٹ بولتے۔ آپ کی اسی ادائے خاص نے تو جناب بھٹوؒ کو گھائل کیا تھا۔ اس عجیب و غریب مکر و فریب کا دلچسپ واقعہ یہ تھا کہ جن دنوں ضیاءالحق جی۔ او۔ سی ملتان تھے تو آپ کو پہلی دفعہ جناب بھٹوؒ کے حضور باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے اس وقت بھٹوؒ صاحب کے سامنے پنج سورہ نکالا اور اُسے بوسہ دیا۔ پھر جناب بھٹوؒ کی عظمت کے گُن گائے اور رخصت ہو گئے۔

"ضیاءالحق نے اعتراف کیا ہے کہ فوج نے وسط جون میں فوجی بغاوت کا منصوبہ مرتّب کیا تھا لیکن اس کے باوجود ضیاءالحق پنج سورہ کو بوسے دیکر اور قسمیں کھا کر بھٹوؒ صاحب کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا رہا کہ "فوج آپ کے ساتھ ہے اور ہم آپ کے اور آپ کی حکومت کے وفادار ہیں"۔ اس نئے طریقۂ واردات کی وجہ سے ضیاءالحق نے دنیا کے تمام کاذبوں کو پیچھے چھوڑ دیا اور کذب کی دنیا میں ایک نیا ریکارڈ قائم کرکے بڑا نام بھی پیدا کیا ہے۔ انہیں

بلاشبہ "کاذبِ عظیم" کے خطاب سے نوازا جا سکتا ہے۔ جس کے صرف وہی حقیقی مستحق قرار پاتے ہیں۔

(۳) ضیاء الحق کا شخصی تعارف

ضیاء الحق کی شخصیت اور کردار کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی ابتدائی اور عملی زندگی کا مختصر جائزہ لیا جائے۔ ضیاء الحق نے ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا اور بی۔ اے کرنے کے بعد آپ کو ۱۹۴۵ء میں ہندوستانی فوج میں کمیشن ملا۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ کا خاندان پاکستان آگیا۔ اور کراچی میں سکونت اختیار کرلی۔ آپ کو ستمبر ۱۹۶۵ء یا دسمبر ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں کسی بھی میدانِ جنگ پر جانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ اس طرح آپ کی شخصیت میں ایک اچھے فوجی افسر کی خوبیاں سرے سے پیدا ہی نہ ہوسکیں۔

(۴) ضیاء الحق کا عظیم کارنامہ

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد فلسطینی مہاجرین اُردن میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے۔ مہاجرین اسرائیل سے براہِ راست برسرِ پیکار ہونے کی صلاحیت سے محروم تھے اس لیے ان کی جنگی کاروائیاں گوریلا سرگرمیوں تک ہی محدود تھیں۔ یہ صورتحال اسرائیل اور اس کے سرپرست امریکہ کے لیے تکلیف اور پریشانی کا سبب بن گئی۔ اُردن، پاکستان اور کئی عرب ممالک امریکہ کے حلیف تھے۔ لہٰذا ۱۹۶۹ء میں اسرائیل کی تحریک پر امریکہ نے پاکستان اور دیگر حلیف ممالک کو ہدایات دیں کہ اُردن سے فلسطینی مہاجرین کو نکال دیا جائے۔ چنانچہ اس کارِ خیر کی تکمیل کے لیے پاکستان نے اپنے فوجی مشیر کو اُردن بھیجنے کی حامی بھرلی۔ قرعۂ فال جنرل ضیاء الحق کے نام نکلا۔ موصوف کا ستارہ چمکا یعنی قسمت نے یاوری کی اور انھیں بریگیڈیئر کے عہدہ پر ترقی

دے کر اردن بھیج دیا گیا۔ جہاں انھیں اپنے اصلی جوہر دکھانے کا بھرپور موقع ملا۔ اس طرح اردن کے شاہ حسین، امریکی سی۔ آئی۔ اے اور یہودی لابی کی نظروں میں ضیاء الحق ایک وفادار ساتھی کی حیثیت سے ابھرے۔ اسی دوران یہودی لابی اور امریکی سی۔ آئی۔ اے کے ساتھ آپ کے مراسم استوار ہوئے جو مرتے دم تک قائم و دائم رہے، اور آپ کی موت بھی انہی کے جلو میں واقع ہوئی۔ ہوائی سفر میں امریکی سفیر مسٹر آرنلڈ رافیل اور فوجی اتاشی بریگیڈیئر جنرل واسن بھی آپ کے ساتھ تھے جو ہوائی حادثے میں ہلاک ہو گئے۔ ان دونوں حضرات کا بھی تعلق یہودی نسل ہی سے تھا۔

۱۹۷۰ء میں اردن میں فلسطینی مہاجرین کے خلاف فوجی کاروائی کی گئی یہ کاروائی اتنی سنگین اور ظالمانہ تھی کہ اس جیسی کاروائی کبھی ان کے ازلی دشمن اسرائیل نے بھی ان کے خلاف نہیں کی تھی۔ جس میں فلسطینیوں کا پانی بند کر دیا گیا اور تقریباً ۲۵ ہزار فلسطینی جن میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل تھے بیدردی سے قتل کر دیئے گئے۔ باقی ماندہ نہایت کسمپرسی کے عالم میں جان بچا کر لبنان چلے گئے۔ ان اعلیٰ خدمات کے صلے میں اردن کے شاہ حسین نے ضیاء الحق کو ایک تو "کوکب و استقلال" کا اعزاز بخشا اور دوسرے ان کی ترقّی کی سفارش جناب ذوالفقار علی بھٹوّ سے بھی کی۔ شاہ حسین کی اسی سفارش کے پیشِ نظر جناب بھٹوّ نے ضیاء الحق کو میجر جنرل کے عہدہ پر ترقّی بھی دے دی۔ اور اٹک سازش کیس میں ملوّث فوجی افسران کے خلاف مقدمے کی کاروائی کے لیے ضیاء الحق کو فوجی عدالت کا سربراہ بھی بنا دیا۔ جس پر موصوف جنرل نے تمام افسران کو سزائیں دینے میں بھی بڑی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا لیکن جب موصوف فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کر بیٹھے تو اُن تمام افسران کو جنہیں انہوں

نے خود فراخ دلی سے سزائیں دی تھیں، معاف کر کے رہا بھی کر دیا۔ گویا آپ نے محض بھٹو صاحب کو خوش کرنے کے لیے انھیں سزائیں دی تھیں اور جب انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا موقع ملا تو ان سب کو رہا کر دیا۔ بھٹو صاحب نے ضیاء الحق کو ان کی اپنی کاروائیوں اور غیر ملکی سفارشوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کئی جرنیلوں کو نظر انداز کر کے ۱۹۷۶ء میں چیف آف اسٹاف بنا دیا۔

(۵) ضیاء الحق کی ترقی کا راز مندرجہ بالا واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ ضیاء الحق کا نہ کوئی ضمیر تھا اور نہ ہی کوئی کردار۔ نہ ہی اُن کی ذات میں انسانیت کی کوئی اعلیٰ خوبی پائی جاتی تھی۔ اعلیٰ عہدوں پر ان کی ترقی ان کی صلاحیت یا حق کی وجہ سے ہرگز نہیں ہوئی تھی بلکہ آپ کی خوشامد اور سفارشوں کی وجہ سے ہی ایسا ممکن ہو سکا تھا۔ اسی لیے ایسے شخص سے کسی بڑے یا اچھے کام کی توقع رکھنا محض عبث ہے۔

(۶) الیکشن کے اعلانات ضیاء الحق نے ۵ جولائی کو اپنی تقریر میں کہا تھا کہ انتخابات نوّے دن کے اندر ہوں گے اس کے بعد موصوف مسلسل اس جھوٹ اور مکر کا اعادہ کرتے رہے۔ جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے :۔

۱۔ آپ نے ۱۱ جولائی کو راولپنڈی میں پاکستان کے مدیرانِ جرائد و اخبارات سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ فوج کا مقصد صرف پُرامن ماحول میں آزادانہ و منصفانہ انتخابات کرا کے جمہوریت بحال کرنا ہے۔ انتخابات اکتوبر میں منعقد کرائے جائیں گے اور اس مقصد کے لیے فوجی کونسل نے قانون اور طریقۂ کار وضع کرنے کے لیے ایک کمیٹی قائم کر دی ہے۔

۲۔ ۱۳ جولائی کو امریکی جریدے "نیوز ویک" کو ایک خصوصی انٹرویو دیتے

ہوئے ضیاء الحق نے کہا کہ انتخابی سرگرمیوں کے لیے صرف تین ہفتے کا وقت دیا جائے گا اور سیاسی سرگرمیاں وسطِ ستمبر سے شروع ہو جائیں گی۔

۳۔ ۱۴ر جولائی کو ضیاء الحق نے اپنی پہلی کانفرنس میں اپنے الیکشن پروگرام کا اعادہ کرتے ہوئے مزید کہا کہ "میرے سامنے محدود مقصد ہے۔ مجھے صرف نوّے دن تک رہنا ہے جن میں سے ۱۸ دن گزر چکے ہیں۔"

۴۔ ۱۴ر اگست ۱۹۷۷ء کو جہلم چھاؤنی میں فوجی افسروں اور جوانوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ضیاء الحق نے اپنے اسی عزم کا اعلان کیا اور مزید کہا کہ مسلح افواج کسی پارٹی کی طرفدار نہیں ہیں۔ فوج کو محض سیاسی پارٹیوں کی رسہ کشی ختم کرنے کے لیے کاروائی کرنا پڑی۔

۵۔ ۱۴ر اگست کو یومِ آزادی کے موقع پر ضیاء الحق نے نہ صرف انتخابات کرانے کا اعادہ کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ جمہوریت میں رکاوٹ ڈالنے والوں کو ملک دشمن سمجھا جائے گا۔

اگر ضیاء الحق کے مندرجہ بالا بیان کو آئندہ آنے والے واقعات کے تناظر میں دیکھا جائے تو بہ حقیقت از خود ثابت ہو جاتی ہے کہ ضیاء الحق اپنے ملک دشمن ہونے کا اعتراف کر رہا تھا۔ یہ قوم کی ذمّہ داری تھی کہ ایسے ملک دشمن کو فرارِ واقعی سزا دینے کا انتظام کرتی، کیونکہ یہ ضیاء الحق ہی تھا جس نے نہ صرف جمہوریت بحال کرنے سے انکار کیا بلکہ اپنے قومی جرائم پر پردہ ڈالنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے تراشتا رہا۔ کبھی وہ کہتا کہ جمہوریت اسلام میں جائز نہیں تو کبھی کہتا کہ جمہوریت تو جائز ہے مگر سیاسی جماعتیں ناجائز ہیں۔ اور کبھی اس کے نزدیک اسلام میں حزبِ اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ غرض یہ کہ وہ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے مسلسل اور پیہم جھوٹ بولتا رہا۔

۶۔ ۲۳ راگست کو بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اکتوبر کے عام انتخابات کے بعد مارشل لاء ختم نہ کر دیا جائے۔ عام انتخابات کے بعد جمہوریت کامیاب رہے گی۔ اگر سابق وزیرِ اعظم انتخابات جیت گئے تو اقتدار دوبارہ ان کو سونپ دیا جائے گا۔

ضیاء الحق نے متواتر اور مسلسل اعلانات کر کے قوم کو یقین دلا دیا کہ واقعی انتخابات اکتوبر میں ہوں گے۔ جب انہوں نے اپنے اس جھوٹ کو ثابت کر دکھایا تو پھر اس نے اپنے جھوٹ کی قلعی از خود کھولنا شروع کر دی جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

یکم ستمبر کو ضیاء الحق نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:۔

(ا) اکتوبر ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں حصّہ لینے والے تمام امیدواروں کو ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۷ء کے دوران حاصل کردہ اثاثوں کی تفصیل ظاہر کرنا ہوگی۔

(ب) مسلح افواج کو سنگین بحران میں کاروائی کا آئینی حق حاصل ہونا چاہیے اور میں یہ تجاویز قومی اسمبلی میں پیش کروں گا۔

(ج) پاکستان کے لیے صدارتی نظامِ حکومت نہایت مناسب ہے اور یہ نظام اسلام کے قریب تر بھی ہے۔

(د) قومی سالمیت کا تحفّظ سیاستدان نہیں بلکہ مسلح افواج ہی کر سکتی ہیں۔

(ہ) ناجائز دولت کمانے والوں کو نااہل قرار دے دیا جائے گا۔

دراصل اس مندرجہ بالا بیان نے ضیاء الحق کے اصل چہرے کو بے نقاب کر دیا تھا۔ ضیاء الحق نے اس اعلان کے ساتھ ہی اپنی آمریت کو مستحکم کرنے کی کاروائی کا آغاز کر دیا۔ پہلے مرحلے میں ۷ ارستمبر کو جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ

اور پاکستان پیپلز پارٹی کے دیگر قائدین بشمول ڈاکٹر غلام حسین، شیخ محمد رشید، عبدالحفیظ پیرزادہ، محمد حیات خان شیرپاؤ، غوث بخش رئیسانی، اقبال خان جدون، نصر اللہ خٹک، محمد حیات خان ٹمن، ہمایوں سیف اللہ اور خالد ملک کو مارشل لاء کے حکم نمبر ۱۲ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔

اپنی اس منافقانہ چال کا بھرم رکھتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ ملزمان کے خلاف فوجی عدالتوں میں مقدمات چلائے جائیں گے۔ پھر ۱۸ ستمبر کو موصوف نے تہران کے اخبار کیہان انٹرنیشنل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ سابق وزیر اعظم مسٹر بھٹو اصولوں کے معاملے میں دیوالیہ ہیں اور وہ اپنی ترقی کے لیے اپنے دوستوں کی لاشوں کا زینہ بنانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ وہ قاتل اور خائن ہیں۔

بہر حال پروگرام کے مطابق ۱۸ ستمبر سے پورے ملک میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی سیاسی قائدین نے جلسے جلوسوں کی ابتداء کر دی۔ لیکن بقول کسے :۔

ع "اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے"

(۷) انتخابات کا التوا

یکم اکتوبر کو ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے تا حکم ثانی انتخابات ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے اپنے اعلان میں کہا کہ چونکہ احتساب کا عمل ضروری ہے لہٰذا پہلے سابقہ حکومت کے عہدیداران کا احتساب کیا جائے گا۔ اور بعد میں انتخابات کی تاریخ کا اعلان کیا جائے گا۔

یہ تھا ضیاء الحق کا وہ مکر و فریب جس کا پردہ بالآخر خود انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں چاک کر دیا تھا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک جھوٹ

بولنے اور پھر اُسے نبھانے کے لیے بکے بعد دیگرے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ لیکن جھوٹ بہر حال جھوٹ ہوتا ہے اور پھر یہ کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے کے مصداق جھوٹا انسان اس دلدل میں دانستہ طور پر دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ یہی سب کچھ ضیاء الحق نے بھی کیا۔

(۸) ضیاء الحق کا عدلیہ پر پہلا حملہ

بیگم نصرت بھٹو نے اپنے شوہر جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کی مارشل لاء کے حکم نمبر ۱۲ کے تحت نظر بندی کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا اور دیگر نظر بندوں کی طرف سے بھی اسی قسم کی درخواستیں سپریم کورٹ میں دائر کر دی گئیں۔ جن پر سپریم کورٹ نے حکم جاری کیا کہ ان تمام نظر بندوں کو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں لایا جائے تاکہ ضرورت پڑنے پر ان کو عدالت میں طلب کیا جا سکے۔ ۲۲ ستمبر کو جناب بھٹوؒ کے وکیل جناب یحییٰ بختیار چیف جسٹس جناب جسٹس محمدؒ یعقوب علی خان سے ان کے چیمبر میں ملے اور جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کی طرف سے ضمانت کی درخواست پیش کی۔ جناب چیف جسٹس نے انہیں ہدایت کی کہ درخواست باقاعدہ طور پر عدالت کے رجسٹرار کے سامنے پیش کی جائے۔ نیز یہ کہ عدالت درخواست کی باقاعدہ سماعت کر کے قانون کے مطابق فیصلہ دے گی۔ چنانچہ یحییٰ بختیار صاحب نے اسی ہدایت پر عمل کیا۔ تھوڑی دیر بعد مارشل لاء کے وکیل جناب اے۔ کے بروہی چیف جسٹس کے کمرے میں پہنچے اور ایک درخواست پیش کی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ نظر بندوں کو سہالہ ریسٹ ہاؤس لانے کا حکم واپس لے لیا جائے۔ چیف جسٹس نے انھیں بھی یہی کہا کہ درخواست قاعدہ کے مطابق عدالت کے رجسٹرار کے سامنے پیش کی جائے لیکن بروہی صاحب نے ایسا نہ کیا۔ اس لیے کہ وہ مارشل لاء کے وکیل تھے۔ چنانچہ وہ درخواست لے کر واپس ضیاء الحق کے پاس پہنچے ضیاء الحق

پہلے ہی جناب جسٹس محمد یعقوب علی خان سے جلا بھنا بیٹھا تھا کیونکہ موصوف نے ضیاء الحق کو پہلے ہی دن یعنی ۵ جولائی کو کھری کھری سنا دی تھیں۔ عدلیہ پر قابو پانے کے لیے تمام متعلقہ حضرات کی میٹنگ ہوئی اور اس کے نتیجے میں ضیاء الحق کی طرف سے مارشل لاء کا حکم نمبر ۶ جاری کیا گیا۔ جس میں آئینی ترمیم کو کالعدم قرار دے دیا گیا اور اس طرح چیف جسٹس آف پاکستان کا عہدہ خالی ہو گیا۔ چنانچہ جناب جسٹس محمد یعقوب علی خان اپنے عہدے سے ریٹائر ہو گئے اور ان کی جگہ جناب جسٹس انوار الحق کو چیف جسٹس آف پاکستان بنا دیا گیا۔

یہ تھی جناب بروہی کی وکالت۔ وہ بڑے نامور وکیل تھے مگر ان کی بڑائی اس ایک واقعہ سے بخوبی عیاں ہو جاتی ہے۔ ضیاء الحق اور ان کے وکیل جناب اے۔ کے بروہی اس واقعہ کی سنگینی سے قطعی طور پر بے خبر تھے۔ وہ طاقت و اقتدار کے نشے میں مدہوش تھے۔ پاکستان کے عوام پر مارشل لاء کی ننگی تلوار لٹک رہی تھی۔ لیکن بیرونی دنیا اس مسئلے پر خاموش نہ رہ سکی۔ چنانچہ ۲۳ ستمبر کے روزنامہ ملت لندن نے یہ شہ سرخی لگائی:۔

"چیف جسٹس سپریم کورٹ کو اس وقت اپنے عہدے سے برطرف کیا گیا جبکہ وہ مارشل لاء کے خلاف رٹ درخواست کی سماعت کر رہے تھے۔ اور ملک کی عدلیہ کو کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا گیا۔" اسی اخبار نے اپنی ایک اور اشاعت ۲۶ ستمبر میں مزید لکھا کہ:۔

"ضیاء الحق اور فوجی ٹولے کے سامنے نہ جھک کر چیف جسٹس نے عدلیہ کے لیے ایک شاندار روایت قائم کی ہے۔" لندن ٹائمز نے اپنی ۲۳ ستمبر کی اشاعت میں لکھا کہ:۔

"جنرل ضیاء الحق نے چیف جسٹس محمد یعقوب علی خان کو اس لیے معزول

کیا ہے کہ چیف جسٹس صاحب سابق وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ کی نظر بندی کے خلاف مقدمے کی سماعت کرنے لگے تھے۔ چنانچہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ان کو ریٹائرڈ کر دیا۔ ۵ جولائی کو جب فوج نے اقتدار سنبھالا تو اس کا مؤقف یہ تھا کہ اس کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا حکم ملک کے آئین پر فوقیت رکھتا ہے۔ چیف جسٹس کو ریٹائر کرنا اسی مؤقف کی ایک ڈرامائی مگر بھونڈی توثیق ہے۔"

اسی دن اخبار گارجین لندن نے لکھا کہ:۔

"پاکستانی فوج نے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو اس وقت عہدہ سے علیحدہ کیا جب وہ سابق وزیرِ اعظم جناب بھٹوؔ کی نظر بندی کے خلاف رٹ سماعت کرنے والے تھے۔"

غرضیکہ آزاد دنیا کے پریس نے ضیاء الحق کے عدلیہ پر اس حملے کی اعلانیہ اور پُرزور مذمّت کی۔ مگر اتفاق سے ضیاء الحق اور ان کا وکیل اے۔ کے۔ بُروہی دونوں ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے اس لیے دونوں پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

(۱۰) نام نہاد احتساب کا ڈھونگ

جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کے بعد ضیاء الحق نے اپنی آمریت کو مستحکم کرنے کے لیے احتساب کے ڈھونگ کا اعلان کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی یکم اکتوبر ۱۹۷۷ء کی تقریر میں قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"گزشتہ چند ماہ کے دوران مارشل لاء حکام نے بعض محکموں کے معاملات کی چھان بین کی اور جو واقعات سامنے آئے ان کو چھپانا بہت بڑا جرم ہوگا۔ میں

نے مختلف محکموں کی تحقیقات کا حکم دیا۔ اس سے جو غلاظت سامنے آئی ہے اُسے تفصیل سے بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ گزشتہ پانچ برسوں کے دوران قومی اداروں کو کھوکھلا کیا گیا۔ سول انتظامیہ کو سیاست میں رنگ دیا گیا۔ ہراساں کیا گیا اور غیر مؤثر بنا دیا گیا۔ قومی معیشت تباہ کر دی گئی۔ عدلیہ کا وقار مجروح کیا گیا۔ اور اس کا دائرہ اختیار کم کیا گیا۔ عوام کے خون پسینے کی کمائی ذاتی تعیشات اور ذاتی فائدوں کے لیے لٹائی گئی۔ ملک میں خوف و دہشت کی فضا پیدا کی گئی۔ جس سے عام آدمی میں تحفّظ کا احساس ختم ہوا۔ ماضی کی غلط کاریوں کی یہ صرف ایک جھلک ہے۔ میں تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ یہ سب قانون کے دائرے میں آتے ہیں۔ یہ عدالتوں کا فرض ہے کہ وہ ان معاملات کا نوٹس لیں، مجھے یقین ہے کہ جب یہ معاملات عدالتوں میں آئیں گے تو لوگ صحیح حقائق سے واقف ہو جائیں گے۔ جنرل ضیاء نے کہا کہ ان انکشافات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ملک کی سیاست کی اس طرح تطہیر کیوں نہ کر دی جائے کہ اس قسم کے حالات دوبارہ نہ پیدا ہو سکیں۔ اپنے رفقاء اور ساتھیوں سے مشورے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان حقائق کو انتخابات کے انعقاد سے قبل عدالتوں کے ذریعے عوام کے سامنے لایا جائے۔ ان حقائق کو چھپانا قومی اور اخلاقی جرم ہوگا۔ یہ کوئی جانبداری یا غیر جانبداری کی بات نہیں ہے۔ میں احتساب کے مطالبہ سے متفّق تھا، لیکن اُسے قبول کرنے میں مجھے اس لیے تامّل تھا کہ احتساب کے عمل کو ایک دو روز میں مکمل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے قانونی کارروائی کی تکمیل ضروری تھی۔ جس کے لیے ملزمان کو صفائی کا پورا موقع فراہم کیا جانا تھا۔ اس میں وقت صرف ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا کہ بعض مقدمات فوجی عدالتوں میں چلائے جائیں۔ تاکہ جلد فیصلہ ہو سکے۔ لیکن بعض افراد نے اس کی یہ غلط تعبیر کی کہ

مارشل لاء انتظامیہ بعض افراد کو سزا دینا چاہتی ہے۔ یہ بالکل بے بنیاد اور غلط بات ہے۔ میں آپ کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہوں کہ اثاثوں کی چھان بین کی کاروائی ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔ اِن سیکٹروں گوشواروں کی ابتدائی جانچ پڑتال ہو رہی ہے۔ اس چھان بین کے نتیجہ میں ان افراد کے خلاف چارہ جوئی کی جائے گی جنہوں نے ناجائز ذرائع سے یہ اثاثے حاصل کئے ہیں۔ جو لوگ مجرم پائے جائیں گے۔ وہ قانون کے مطابق انتخاب لڑنے کے لیے نااہل قرار پائیں گے۔ کیونکہ ان کو ایک بار پھر ملکی وسائل لوٹنے کی اجازت دینا زیادتی ہو گی۔ لیکن میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ان افراد کو صفائی کا پورا پورا موقع فراہم کیا جائے گا۔ احتساب کی یہ کاروائی ان تمام افراد کے خلاف ہو گی۔ جو جرائم اور بے ضابطگیوں کے مرتکب ہوئے ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی پارٹی سے ہو۔"

اس اعلان کی پیروری کرتے ہوئے ۲۵ جنوری ۱۹۷۸ء کو ضیاء الحق نے مارشل لاء کا حکم نمبر ۳۱ جاری کیا۔ جس کے تحت پورے ملک میں ۱۱ ٹریبونل قائم کئے گئے۔ ۳ فروری کو اعلان کیا گیا کہ ۹۸ سیاستدانوں کے مقدمات نااہل قرار دینے والے ٹریبونل کے سامنے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ ان تمام سیاستدانوں کا تعلق صرف پاکستان پیپلز پارٹی ہی سے تھا اور ان میں بیگم نصرت بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ، ممتاز بھٹو، شیخ رشید، قائم علی شاہ، معراج خالد، صادق حسین قریشی، جام صادق علی، عبداللہ بلوچ اور عبدالوحید کٹپر قابل ذکر ہیں۔ ان تمام صاحبان کو انتخابات میں حصہ لینے کے لیے نا اہل قرار دے دیا گیا۔ اس کے علاوہ ضیاء الحق نے اپنے ہی محسن و مربی جناب ذوالفقار علی بھٹو کو انتقام کا نشانہ بنانے کے لیے کئی اور ایسی ہی ظالمانہ اور منتقمانہ کاروائیاں بھی کیں۔ مثلاً :-

(۱) ضیاء الحق نے ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء کو پیپلز فاؤنڈیشن ٹرسٹ کے تمام اثاثے منجمد کر دیئے اور ٹرسٹ کے معاملات کی تحقیقات کا حکم دے دیا۔

(۲) ۱۷ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو انہوں نے مارشل لائی احکام کے تحت پیپلز فاؤنڈیشن اور ذوالفقار علی بھٹو ٹرسٹ کے ٹرسٹیز اور بورڈ آف گورنرز کو معطل بھی کر دیا۔

(۳) ۲۲ جولائی ۱۹۷۸ء سے لے کر ۲۹ جنوری ۱۹۷۹ء تک ضیاء الحق نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کو بدنام اور رسوا کرنے کے لیے ۵ قرطاسِ ابیض بھی شائع کئے۔ جو ایسی خرافات کے پلندے تھے کہ جن کی کوئی اصلیت ہی نہیں تھی اور جن پر کوئی ذی شعور اور سنجیدہ آدمی یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ مگر یہ بھی اسلام کے نام پر بولے گئے اور بہت سے جھوٹوں میں سے ایک تھا۔

ضیاء الحق کی ان تمام مساعی کا اصل مقصد یہ تھا کہ جناب بھٹو اور عوام کے درمیان مضبوط رشتے کو کاٹ دیا جائے تاکہ وہ بلاخوف وخطر ایک آمرِ مطلق کی طرح ملک کے طول و عرض میں دندناتا پھرے۔ لیکن یہ رشتہ اتنا مستحکم اور دیرینہ تھا کہ اُسے بھٹو صاحب کی زندگی میں توڑنا انتہائی دشوار تھا۔ لہٰذا ضیاء الحق اپنی تمام تر شاطرانہ و عیارانہ چالوں میں ناکامی کے بعد جناب بھٹو کی زندگی کے درپے ہوگیا اور بالآخر انھیں ختم کر کے ہی دم لیا۔ احتساب کے سارے عمل کا دلچسپ اور قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ اس میں مولوی کوثر نیازی صاحب کا کہیں ذکر تک نہ تھا۔ مولوی صاحب ہر طرح سے مامون اور محفوظ رہے۔ حالانکہ آپ کی ذاتِ شریف پیپلز پارٹی میں نہایت اہمیت کی حامل تھی۔ آپ پارٹی کے سیکریٹری اطلاعات تھے اور بھٹو صاحب کے پورے عرصۂ اقتدار میں مرکزی وزیر بھی رہے۔ اور پھر جب قومی اتحاد نے

جناب بھٹوؒ کے خلاف تحریک چلائی تو آپ اس مذاکراتی ٹیم کے رُکن بھی تھے۔
گویا آپکو ہر دور میں بھٹوؒ صاحب کا قرب حاصل رہا اور ماشاءاللہ جناب کوثر نیازی
نے کھانے پینے میں بھی کبھی کسی بخل سے کام نہ لیا۔ بلکہ ایسے ہر موقع سے
بھرپور فائدہ ہی اٹھایا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ضیاءالحق نے جناب
مولوی صاحب کو احتسابی عمل کا نشانہ بنانا پسند نہیں کیا۔ بظاہر اس کی دو
صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مولوی نیازی صاحب نے سر پر سلیمانی ٹوپی پہن لی ہو۔
اور اس طرح وہ ضیاءالحق کو نظر ہی نہ آئے ہوں یا پھر دوسری یہ کہ مولوی
صاحب نے ضیاءالحق کو کوئی "کرامات" دکھائی ہوں اور اس طرح انہوں نے
ضیاءالحق کو اپنا مُرید بنا لیا ہو۔ کیونکہ مولوی حضرات ایسے معاملات میں ہمیشہ
پیش پیش ہی نظر آتے ہیں اور پھر مولوی کوثر نیازی اپنے اس مخصوص طبقے
سے کیونکر علیحدہ رہ سکتے تھے اور اس طبقے کی روایات کو توڑنا یا ان سے
منہ موڑنا بھلا کوثر نیازی جیسے شخص کے بس کی بات کب ہو سکتی تھی۔ بہرحال
مولوی کوثر نیازی صاحب نہ صرف احتساب سے محفوظ رہے بلکہ آپ نے پروگریسیو
پیپلز پارٹی قائم کر کے بڑا نام پیدا کیا اور ضیاءالحق کے دورِ حکومت میں سینیٹر
بن کر اپنے مقصد اور جذبۂ اقتدار کو تسکین بھی دیتے رہے۔ انہوں نے ایسا
کرتے وقت اپنے عظیم قائد جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کی رفاقت، دوستی اور
مہربانیوں کا ذرّہ برابر بھی پاس نہ کیا اور مولوی طبقے کی روایات میں ایک اور
نئے باب کا اضافہ کرنے میں ہی اپنی عظمت اور خیر کا راستہ بنانے میں اپنی
عافیت سمجھی اسلئے کہ مفاد پرستی اور ابن الوقتی ہی مولوی کا ایمان ہوتا ہے۔

(۱۱) جنرل ضیاءالحق صدر بن بیٹھا

ایک سال کے عرصہ میں ضیاءالحق
نے ملک میں ڈنڈے کے زور پر

سیاسی نراجیت پھیلانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اور دوسری طرف صدر پاکستان کی حیثیت سے جناب فضل الٰہی چوہدری کی میعادِ صدارت ختم ہو گئی۔ چنانچہ ضیاء الحق نے دونوں صورتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۶ ستمبر ۱۹۷۸ء کو عہدۂ صدارت پر بھی قبضہ کر لیا۔ حلف برداری کی تقریب کے بعد ضیاء الحق نے قوم کے ساتھ ایک بڑا دلچسپ مذاق بھی کیا۔ آپ نے اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے اپنے انتہائی عیارانہ و مکارانہ انداز میں فرمایا کہ :۔

"جونہی کوئی دوسرا مناسب آدمی مل گیا۔ میں یہ عہدہ چھوڑ دوں گا میں صرف اس وقت تک صدر رہوں گا جب تک ہمیں کوئی اور شخص نہیں مل جاتا۔"

افسوس ہے اس قوم کے "بانجھ پن" پر کہ یہ قوم دس سال میں کوئی ایک بھی مناسب شخص پیدا نہ کر سکی۔ اور پھر منصبِ صدارت کا بوجھ بھی تن تنہا بے چارے ضیاء الحق کو اپنے نازک کاندھوں پر ہی اٹھانا پڑا۔

۱۹۷۹ء انتخابات کا سال

۲۳ اگست ۱۹۷۸ء کو دوسری وفاقی کابینہ کی حلف برداری کے بعد ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ عام انتخابات اکتوبر ۱۹۷۹ء میں کرا دیئے جائیں گے۔ لہٰذا ۱۹۷۹ء کا سال انتخابات کا سال کہا جا سکتا ہے۔ لیکن انتخابات ہونے تھے نہ ہوئے اسطرح ضیاء الحق کے جھوٹ میں بہرحال ایک اضافہ ضرور ہو گیا۔

مارشل لاء میں سختی

۱۶ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے ضیاء الحق نے انتخابات غیر معیّنہ مدّت کے لیے ملتوی کر دیئے اور تمام سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی۔ نیز ان کے دفاتر بھی سربمہر کر دیئے گئے اور حسابات منجمد کر دیئے گئے۔ مزید برآں کئی اخبارات و رسائل کو بھی بند کر دیا گیا۔ تمام اخبارات اور ذرائع ابلاغ پر سنسر شپ عائد

کردی گئی۔ ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ ملک کو مارشل لاء کے طور پر چلایا جائے گا۔ اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے اعلان پر سختی سے عمل کرایا جائے گا۔ تمام جرائم کی سخت ترین سزائیں دی جائیں گی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی بہت سے اکابرین سیاست کو گرفتار کر لیا گیا یا پھر انہیں اپنی اپنی رہائش گاہوں پر نظر بند کر دیا گیا۔ ان قائدین میں بیگم نصرت بھٹو، آنسہ بے نظیر بھٹو، اصغر خان، فاروق لغاری وغیرہ شامل تھے۔ ساتھ ہی ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ انتخابات کے ملتوی ہونے سے حکومت کو جو وقت ملا ہے اس میں وہ حسب ذیل ترجیحات کے مطابق کام کریں گے۔

جنرل ضیاء الحق کی ترجیحات

(۱) نفاذ اسلام کے عمل کو تیز کیا جائیگا۔ (۲) قومی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے قومی پیداوار بڑھائی جائے گی اور برآمدات کو فروغ دیا جائے گا۔

(۳) اشیائے ضرورت کی قیمتیں مناسب سطح پر رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) رشوت ستانی، چوری اور ڈاکہ زنی کا سدِ باب کیا جائے گا۔

(۵) بے گار کیمپوں کی بیخ کنی کی جائے گی اور

(۶) سنگین جرائم کے مرتکب افراد پر مارشل لاء عدالتوں میں مقدمہ چلایا جائے گا۔

بیگم نصرت بھٹو کیس

جیسا کہ پچھلے صفحات میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ بیگم نصرت بھٹو نے اپنے شوہر جناب ذوالفقار علی بھٹو کی مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۱۲ کے تحت نظر بندی کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا تھا۔ بیگم بھٹو کی اس عرضی کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ ضیاء الحق نے چیف جسٹس جناب محمد یعقوب علی خان کو ان کے عہدے سے ریٹائر کر دیا اور جناب جسٹس انوار الحق کو

ایک یادگار تصویر

دورۂ چین کے موقع پر پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بیگم نصرت بھٹو جنہوں نے جنرل ضیاء الحق کی آمریت کی قانونی حیثیت کو عدالت عظمیٰ میں چیلنج کیا۔

چیف جسٹس آف پاکستان بنا دیا۔ اس کے بعد جناب ذوالفقار علی بھٹو اور دیگر نظر بندوں کے مقدمات کی سماعت شروع ہوئی۔ فاضل عدالت نے نظریۂ ضرورت کی بنیاد پر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ سنگین سیاسی انتشار کے پیشِ نظر فوجی مداخلت جائز تھی۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ:۔

(۱) ۱۹۷۳ء کا آئین بدستور ملک کا سب سے برتر قانون ہے۔

(۲) صدرِ مملکت اور ملک کی اعلیٰ عدالتیں بدستور ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

(۳) چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے غیر معمولی اقدام کے ذریعے ملک کے مفاد اور عوام کی بھلائی کے لیے اقتدار سنبھال لیا ہے۔ لہٰذا انھیں حق حاصل ہے کہ وہ ایسی تمام کاروائیاں کریں۔ نیز ایسے قوانین وضع کریں جنہیں عدالتی فیصلوں کے مطابق نظریۂ ضرورت کے دائرہ عمل کے ماتحت قرار دیا گیا ہو یعنی:۔

(ا) ایسی تمام کاروائیاں اور قانونی اقدامات جو ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق ہوں اور جن میں آئین میں ترمیم کرنے کے اختیارات بھی شامل ہیں۔

(ب) ایسے تمام اختیارات جن سے عوام کی بہتری مقصود ہو۔

(ج) ایسے تمام اقدامات جو کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے ضروری ہوں۔

(د) ایسے تمام اقدامات جو مارشل لاء کے مقاصد کو پورا کرتے ہوں، جیسے امنِ عامہ کی بحالی اور جلد از جلد منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کا انعقاد، تاکہ ملک میں آئین کے تحت حکومت قائم ہو سکے۔ یہ تمام اقدامات صدارتی حکم، آرڈیننس یا مارشل لاء ریگولیشن کے ذریعے انجام دیئے جا سکتے ہیں۔

(۵) اعلیٰ عدالتوں کو مارشل لاء کے تحت کی گئی تمام کاروائیوں پر نظرِ ثانی کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ نیز اعلیٰ عدالتیں آئین کے آرٹیکل نمبر ۱۹۹ کے تحت

کاروائی کرنے کی پوری طور پر مجاز ہیں۔ خواہ اس بارے میں کسی بھی صدارتی آرڈیننس یا مارشل لاء ریگولیشن میں اس کے برعکس حکم دیا گیا ہو۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ انتہائی متوازن اور ملک کے معروضی حالات کے عین مطابق تھا۔ اس فیصلے میں ایسے اصول طے کر دیئے گئے تھے جو ملکی سلامتی، استحکام اور آئینی نظام کے تسلسل کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔ مثلاً:

(۱) ۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل نمبر ۶ میں کہا گیا ہے کہ جو بھی شخص آئین کو منسوخ کرے گا یا آئین کی تنسیخ میں اعانت کرے گا، شدید غداری کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ اس آرٹیکل کی رُو سے ضیاء الحق اور اس کے تمام رفقاء یقیناً شدید غداری کے مجرم تھے۔ لیکن سپریم کورٹ نے ملک کے بہترین مفاد میں فیصلہ دیا کہ ملکی آئین زندہ سلامت اور پوری طرح نافذ العمل تھا۔ البتہ فوج نے غیر معمولی اقدام کر کے اس کے بعض حصوں کو جزوی طور پر معطل کر دیا تھا اور ایسا کرنا امنِ عامہ کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ اگر خدانخواستہ سپریم کورٹ کا فیصلہ اس کے برعکس ہوتا تو ملک بدترین خانہ جنگی کا شکار ہو جاتا۔

(۲) سپریم کورٹ نے فوجی جنتا کو موقع دیا کہ وہ پُرامن حالات پیدا کر کے انتخابات کرائے اور اقتدار جمہوری حکومت کے حوالے کرے۔

(۳) اعلیٰ عدالتوں کے آئینی اختیارات کے تسلسل کو تسلیم کر لیا گیا اور اس طرح فوجی عدالتوں کے دائرہ کار کو اعلیٰ عدالتوں کی زیرِ نگرانی قرار دے دیا گیا۔

سپریم کورٹ کے اس فیصلے نے ملک کو سیاسی انتشار اور آئینی بحران سے بچا لیا۔ اگر اس فیصلے میں طے کیے گئے اصولوں پر عملدرآمد کیا جاتا یا کم از کم ان سے رہنمائی حاصل کی جاتی تو ملک میں یقیناً کوئی آئینی بحران پیدا نہ ہوتا اور مارشل لاء کی طوالت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے فکری انتشار، بدامنی،

لاقانونیت، لسانی اور نسلی تعلقات کا کہیں وجود نہ ہونا لیکن آئین اور قانون کی بالادستی آمریت کے مزاج کو کب راس آتی ہے۔ اور پھر فوجی آمریت، جو آمریت کی بدترین شکل ہوتی ہے جو سول اداروں، ملکی قانون حتّیٰ کہ ملکی دستور کو بھی کوئی اہمیّت نہیں دیتی۔ اسی لیے جنرل ضیاء الحق نے سپریم کورٹ کے فیصلے کو یکسر نظر انداز کر کے عام انتخابات کو غیر معیّنہ مدّت کے لیے ملتوی کر دیا۔ جنرل ضیاء کے اس اقدام سے مارشل لاء کا آئینی جواز از خود ختم ہو گیا تھا۔ اور ضیاء الحق اور ان کے رفقاء شدید غدّاری کے مرتکب ہو چکے تھے۔ ہر چند کہ قوم انھیں غدّاری کے جرم میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑا نہ کر سکی۔ لیکن تاریخ انھیں غدّاروں کی صفِ اوّل میں کھڑا ضرور کرے گی۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں ان بیانات کو پیشِ نظر رکھا جو مارشل لاء کے وکیل مسٹر اے۔ کے۔ بروہی اور اٹارنی جنرل پاکستان مسٹر شریف الدین پیرزادہ کی طرف سے سپریم کورٹ میں دیئے گئے تھے۔ ان دونوں صاحبان نے عدالتِ عظمیٰ کو بتایا کہ مارشل لاء انتظامیہ احتساب کا عمل مکمل کرنے کے بعد انتخابات کرانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ احتساب کے عمل کو چھ ماہ کی مدّت میں مکمل کر لیا جائے گا اور اس کے بعد انتخابات کرائے جائیں گے۔ لیکن بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ سب جھوٹ، فریب اور مکّاری تھی۔ بہرحال ضیاء الحق نے عدالت کے فیصلے سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے الٹا اُسے غیر مؤثر بنانے اور مارشل لاء کو ملک کا برتر قانون تسلیم کرانے کے لیے ملک کے پہلے متفقہ آئین کی توڑ پھوڑ کر کے اس کی رُوح کو مجروح کر دیا بلکہ عدلیہ کے پورے نظام اور اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کو اپنا تابع فرمان بنانے کی بھرپور کوششوں سے بھی گریز نہ کیا۔

آئین کا ترمیمی حکم نمبر ۲۱ ۱۶؍اکتوبر ۱۹۷۹ء کو ضیاء الحق نے صدرِ پاکستان کی حیثیت سے آئین میں ترمیم کرنے کے لیے حکم نمبر ۲۱ جاری کیا جس کی رُو سے آئین میں آرٹیکل نمبر ۲۱۲۔ اے کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس قانون سے چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کو اس امر کا اختیار حاصل ہو گیا کہ:-

(۱) چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر ایسی فوجی عدالتیں یا ٹریبونل قائم کر سکتے ہیں جن کو مارشل لاء کے علاوہ دیگر قوانین نافذ الوقت کی خلاف ورزی کے مقدمات کی سماعت کا بھی اختیار حاصل ہو گا۔

(۲) ایسی عدالتوں کے دائرہِ اختیار کی وضاحت علیحدہ مارشل لاء آرڈر کے ذریعے کی جائے گی۔

(۳) جن مقدمات کی سماعت مندرجہ بالا قسم کی عدالتیں کریں گی وہ سول عدالتوں اور ہائی کورٹ کے دائرہِ اختیار سے خارج متصوّر ہوں گے اور کسی بھی عدالت کو ایسے مقدمات میں حکم امتناعی جاری کرنے کا اختیار حاصل نہ ہو گا۔

مارشل لاء حکم نمبر ۷۲ ۲۲؍اکتوبر ۱۹۷۹ء کو جنرل ضیاء نے مندرجہ بالا حکم کے پیراگراف نمبر ۲۔ کی پیروی کرتے ہوئے چیف مارشل لاء ایڈ منسٹریٹر کی حیثیت سے مارشل لاء آرڈر نمبر ۷۲ جاری کیا۔ جس کی رُو سے مارشل لاء حکم نمبر ۴۔ کے تحت قائم کی گئی عدالتوں کے دائرہ اختیار کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس حکم کے مطابق فوجی عدالتوں اور خصوصی عدالتوں کا دائرہ کار تمام تعزیزی قوانین پر محیط کر دیا گیا۔ نیز حکم نمبر ۴۔ میں پیراگراف ۳۔ اے کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس پیراگراف کی رُو سے تمام سول عدالتوں اور اعلیٰ عدالتوں پر پابندی لگا دی گئی کہ وہ کسی ایسے مقدمے میں نہ تو کسی قسم کی

کارروائی کرنے کی جن کی سماعت کا اختیار فوجی عدالتوں یا خصوصی عدالتوں کو حاصل ہو یا جس میں اس قسم کی عدالتیں کوئی کارروائی کر رہی ہوں۔

آئین کا ترمیمی حکم نمبر ۱ ۲۷ر مئی ۱۹۸۰ء کو ضیاء الحق نے صدرِ پاکستان کی حیثیت سے آئین کا ترمیمی حکم نمبر ۱ جاری کیا۔ جس کی رُو سے آئین کے آرٹیکل نمبر ۱۹۹ میں ترمیم کر کے ذیلی دفعات ۳۔اے، ۳۔بی اور ۳۔سی کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس ترمیم سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے جملہ احکامات اور اقدامات نیز فوجی عدالتوں کے فیصلوں کو اعلیٰ عدالتوں کے دائرہ اختیار سے خارج کر دیا گیا۔ نیز ان عدالتوں کو حکمِ امتناعی جاری کرنے کے اختیار سے بھی محروم کر دیا گیا۔

مندرجہ بالا اقدامات سے جنرل ضیاء الحق نے دو مقاصد حاصل کر لیے:

(۱) سِول عدالتوں کے مقابلے میں ایک متوازی عدالتی نظام نافذ کر دیا اور ان عدالتوں کا دائرہ اختیار انتہائی وسیع کر دیا۔ حتّیٰ کہ انھیں اعلیٰ عدالتوں کی نگہداشت سے بھی خارج قرار دے دیا گیا۔

(۲) سِول عدالتوں اور خاص طور پر اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات کو کم کر دیا گیا۔

یہاں اس امر کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء الحق نے مارشل لاء کے نفاذ کے ساتھ ہی ساتھ فوجی عدالتیں بھی قائم کر دی تھیں اور اس مقصد کے لیے مارشل لاء آرڈر نمبر ۴ بھی جاری کیا گیا تھا۔ لیکن ان عدالتوں کا دائرہ اختیار صرف مارشل لاء قوانین تک محدود تھا اور عام ملکی قانون کے تحت ان عدالتوں کو کارروائی کا اختیار نہ تھا۔ لیکن آئینی ترامیم سے ضیاء الحق نے ایسا مکمل اور متبادل نظام قائم کیا جس میں فوجی اور خصوصی عدالتوں کا اختیار

مارشل لاء قوانین کے علاوہ تمام ملکی قوانین تک بڑھا دیا۔ یہ کاروائی بیگم نصرت بھٹو کیس میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے یکسر خلاف تھی۔ اس کے علاوہ وہ تمام کاروائی نہ صرف آئین سے متصادم تھی، بلکہ خلافِ آئین بھی تھی۔ لہٰذا آئین کے ترمیمی احکامات کو اعلیٰ عدالتوں میں چیلنج کر دیا گیا۔ سندھ ہائی کورٹ کی ایک ڈویژن بینچ اور بلوچستان ہائی کورٹ کی فل بینچ نے مندرجہ ترامیم کو خلافِ آئین قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا اور فیصلہ دیا کہ بیگم نصرت بھٹو کیس میں دیئے گئے فیصلے کی رُو سے اعلیٰ عدالتوں کو فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف نظرِ ثانی کا مکمل اختیار حاصل تھا۔

بلوچستان ہائی کورٹ کا فیصلہ

بلوچستان ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ سات آئینی درخواستوں کو یکجا کر کے دیا تھا۔ یہ تمام درخواستیں بلوچستان کی مختلف فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف دائر کی گئی تھیں۔ عدالت کی فل بینچ حسبِ ذیل جج صاحبان پر مشتمل تھی۔

(۱) جناب جسٹس ایم۔ اے۔ رشید

(۲) جناب جسٹس میر خدا بخش مری (چیف جسٹس)

(۳) جناب جسٹس عبدالقدیر چوہدری،

عدالتِ عالیہ نے حسبِ ذیل قانونی نکات پر اپنا یہ متفقہ فیصلہ صادر کیا تھا۔

(۱) کیا آرٹیکل ۲۱۲۔ اے قانون کے مطابق ہے۔؟ اگر اس کا جواب ہاں میں ہے تو پھر اس کے حسبِ ذیل امور پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔

(i) آرٹیکل ۲۱۲۔ اے اور مارشل لاء آرڈر نمبر ۴ جیسا کہ اس میں مارشل لاء

آرڈر نمبر ۲ ۷ کے ذریعے ترمیم کی گئی ہے کا اس عدالت کے اختیارات نظرِ ثانی بمطابق آرٹیکل نمبر ۱۹۹ پر کیا اثر ہو گا۔

(ب) آرٹیکل ۲۱۲۔ اے کا ان مقدمات پر کیا اثر ہو گا جن کا فیصلہ سُنا دیا گیا ہے یا جو ابھی تک فوجی عدالتوں میں زیرِ سماعت ہیں۔

عدالت نے مقدمے کے جملہ پہلوؤں اور آئینی صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ دیا کہ:۔

(۱) آئین میں آرٹیکل ۲۱۲۔ اے کا اضافہ اور آرٹیکل نمبر ۱۹۹ میں ذیلی دفعات ۳۔ اے، ۳۔ بی، ۳۔ سی کی ایزادی واضح طور پر اس عدالت کے اختیارات نظرِ ثانی کو ختم کرتے ہیں۔ جبکہ بیگم نصرت بھٹو کیس میں فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہ اختیارات نئے قانونی نظام کا سلسلہ ہیں۔ جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اس لیے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو اس عدالت کے اختیارات نظرِ ثانی ختم کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔

(۲) آرٹیکل نمبر ۱۹۹ میں ترمیم کا مقصد کسی بھی فیصلے اور خاص طور پر عدالتِ عالیہ کے نظرِ ثانی کے فیصلوں کو مسترد کر دینا تھا۔ لہٰذا یہ ترمیم بیگم نصرت بھٹو کیس کے فیصلے کو مسترد کر دینے کی ایک کوشش ہے جبکہ فیصلے کا لبِ لباب یہ ہے کہ آئین سے انحراف کی اجازت صرف نظریۂ ضرورت کے مطابق ہونی چاہیئے۔

(۳) آئین میں یہ ترامیم نظریۂ ضرورت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں لہٰذا خلافِ قانون ہیں۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو خواہ انہوں نے یہ کاروائی صدرِ مملکت کی حیثیت سے ہی کیوں نہ کی ہو۔ ایسی ترامیم کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔

(۴) اس عدالت کو آئین کے آرٹیکل نمبر ۱۹۹ کے تحت نظر ثانی کا اس طرح حاصل ہے جس طرح مندرجہ بالا ترامیم سے پہلے حاصل تھا۔

ضیاء الحق کا آئین سے ایک اور ظالمانہ مذاق

غرض یہ کہ آئینی ترامیم خلافِ قانون قرار دیدی گئیں اور اس فیصلے نے ضیاء الحق اور اس کے مشیروں اے، کے بروہی اور شریف الدین پیرزادہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ملک میں ۱۹۷۳ء کے آئین کی بالادستی نیز آزاد اور خود مختار عدلیہ فوجی آمریت کے غیر اخلاقی، غیر قانونی اور غیر آئینی اقدامات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دے گی۔ لہٰذا انہوں نے دکھاوے کے طور پر بلوچستان ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی مگر وہ اپیل کی کمزوری سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ اس لیے انہوں نے سپریم کورٹ کے فیصلے کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا اور ۲۴ مارچ ۱۹۸۱ء کو جنرل ضیاء الحق نے عبوری آئین کے حکم نمبر ۱ کے ذریعہ ایک نیا آئین نافذ کر کے عدلیہ کی آزادی اور خود مختاری کو ختم کر دیا۔ اس عبوری آئین کے حکم کا فوری اثر یہ ہوا کہ اس حکم نے بلوچستان ہائیکورٹ کے فیصلے کو منسوخ کر دیا جس کی بناء پر فوجی عدالتوں کے فیصلے از خود بحال ہو گئے اور "سلسلۂ دار و رسن" حرکت میں آگیا۔ اور دو سیاسی کارکنوں کو پھانسی کے پھندے پر ٹانگ دیا گیا۔ ان جیالے کارکنوں میں سے ایک بلوچستان کا ۲۱ سالہ نوجوان طالب علم رہنما حمید بلوچ تھا جسے فوجی عدالت نے قتل کے الزام میں موت کی سزا دی تھی۔

۸ دسمبر ۱۹۸۰ء کو بلوچستان ہائیکورٹ نے سنگین بے قاعدگیوں کی وجہ سے فوجی عدالت کی سزا کو معطل کر دیا تھا اور مقدمے کی باقاعدہ سماعت شروع

جنرل ضیاء الحق کی آمریت کے سیاہ کارناموں اور بربریت کی ایک جھلک

کردی تھی۔ لیکن ضیاء الحق کے آئینی حکم کے پیشِ نظر فوجی عدالت کا فیصلہ بحال ہو گیا اور حمید بلوچ کو ۱۱ جون ۱۹۸۱ء کو پھانسی دیدی گئی۔

دار و رسن اختیار میں ہے تیرے لیکن
شوق شہادت سے سرشار میں بھی ہوں
(اشتیاقؔ)

یہ شعر قوم کے ان بے شمار نوجوان جیالوں کے جذبۂ شوقِ شہادت کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ جو جنرل ضیاء الحق کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے ہوئے تختۂ دار پر لٹک تو گئے لیکن انہوں نے اس ظالم آمر کے آگے سر جھکانا گوارا نہیں کیا۔ یا اس جذبۂ شہادت کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ :-

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستین کا

جنرل ضیاء کی عیّاری و مکّاری کا اہم راز

اُموی دور کے گورنر کوفہ حجّاج بن یوسف کے متعلق مشہور ہے کہ اُسے بچپن میں بھیڑیے کا خون پلایا گیا تھا اس لیے اس کی وحشت اور خون آشامی، اس خون کے اثرات کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ ہم ضیاء الحق کے ماضی سے پوری طرح واقف تو نہیں ہیں لیکن اس کی طبعی اور فطری مکّاری، عیّاری اور دروغ گوئی کیساتھ ساتھ ایذا رسانی اور تشدّد پسندی کی حرکات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے بچپن میں کسی لومڑی کا خون پلایا گیا تھا اور یہ اسی خون کا اثر تھا کہ اس کی ذات میں اس قسم کے غیر انسانی اور غیر اخلاقی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاء الحق کا طریقۂ واردات ہمیشہ ہی پُر فریب اور الجھا ہوا ہوتا تھا اور اپنے اقدامات سے وہ قوم بلکہ پوری

دنیا کو بے وقوف بنانے کی کوششیں کرتا تھا۔ ضیاء الحق کو ہم نے بارہا ٹی وی پر دیکھا ہے، سنا ہے کیونکہ ویسے تو اُسے دیکھنا کارے وارد تھا۔ اور اُسے دیکھ کر کبھی بھی یہ تاثر نہیں ابھرا کہ کوئی باوقار یا شریف النفس انسان خطاب کر رہا ہے بلکہ ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ کوئی مکّار انسان اپنی فریب کاری کی پردہ پوشی میں مصروف ہے۔

عبوری آئینی حکم نمبر ا ۱۹۸۱ء

ا۔ اس حکم کے آرٹیکل نمبر ۹ کے ذریعے اعلیٰ عدالتوں کے آئینی اختیارات کو ختم کر دیا گیا اور اسی طرح ۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل نمبر ۱۹۹ کو غیر مؤثر بنا دیا گیا۔

۲۔ آرٹیکل نمبر ۱ کے تحت صدرِ مملکت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ کسی بھی ہائیکورٹ کے جج کو اسکی رضامندی اور متعلقہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کے مشورے کے بغیر کسی بھی دوسرے ہائیکورٹ میں تبدیل کر سکتا ہے، بشرطیکہ یہ تبدیلی دو سال سے زائد عرصے کے لیے نہ ہو۔

۳۔ آرٹیکل نمبر ۱۵ کے تحت ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد کیے جانے والے تمام اقدامات نیز تمام احکامات اور قوانین جائز اور درست قرار دیئے گئے۔ پی، سی، او کا آرٹیکل نمبر ۱۵ درج ذیل ہے۔

" ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کا اعلان صدر پاکستان کے تمام وہ احکامات جن کے ذریعے آئین میں ترامیم کی گئی ہیں۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے ایسے ہی احکامات مارشل لاء ریگولیشن مارشل لاء آرڈرز اور تمام وہ احکامات اور قوانین جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد جاری ہوئے ہیں ان سب کی توثیق کی جاتی ہے کہ وہ سب کے سب باقاعدہ اختیارات کے تحت جاری ہوئے ہیں اور کوئی عدالت یا کسی عدالت کا کوئی فیصلہ ان احکامات و ترامیم میں خارج

یا مخل نہیں ہو سکتا۔ نیز احکامات و نزامبم جاری و ساری ہیں تا آنکہ ان کو مجاز اتھارٹی تبدیل یا منسوخ نہ کرے۔

(۲) تمام احکامات، کاروائی یا فعل جو کسی اتھارٹی یا کسی فرد نے، ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد صدر پاکستان، یا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے حکم سے یا کسی مارشل لاء آرڈر یا ریگولیشن، قانون، نوٹیفیکیشن، رول، احکام، بائی لاء کے تحت جاری کیا یا سر انجام دیا، یا کوئی احکام یا سزا دی، وہ سب کے سب با اختیار اور مجاز تصور ہوں گے اور ان کی توثیق کی جاتی ہے کہ وہ با اختیار ہیں اور ہمیشہ سے تھے اور کوئی عدالت ان میں مخل ہونے کا اختیار نہیں رکھتی۔

(۳) جہاں کہیں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے مارشل لاء آرڈر کے تحت کوئی فوجی عدالت قائم ہوتی ہے اور کسی معاملے میں سماعت یا کاروائی کرتی ہے، یا کوئی مقدمہ یا معاملہ اس کے سپرد کیا جاتا ہے، تو کوئی سول عدالت، بشمول سپریم کورٹ کے اس مقدمے یا معاملے میں کوئی حکم امتناعی یا کوئی دوسرا حکم جاری نہیں کر سکتی اور نہ کوئی اپیل وغیرہ اس کے خلاف سن سکتی ہے۔ نیز تمام مقدمات و معاملات جو فی الوقت کسی سول عدالت میں زیر سماعت ہیں اور جن پر کسی فوجی عدالت نے غور کرنا شروع کر دیا ہے وہ سب کے سب ان سول عدالتوں سے خارج تصوّر ہوں گے۔

(۴) کوئی سول عدالت اس کی مجاز نہیں کہ وہ کوئی مقدمہ، یا شکایت کسی اتھارٹی یا فرد کے خلاف سننے یا کوئی کاروائی اس کے خلاف کرے، محض اس بناء پر کہ اس اتھارٹی یا فرد نے (کسی مارشل لاء آرڈر یا فوجی عدالت کی کاروائی کے سلسلے میں) کوئی احکام جاری کیے یا کوئی عمل کیا۔

(۵) کوئی سول عدالت بشمول ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ، قطع نظر کسی بھی عدالتی

فیصلے کے جو ان عدالتوں کی اپیل سننے یا نظرِ ثانی کرنے کے اختیارات کے متعلق ہو، مجاز نہیں ہوگی کہ وہ :۔

(ا) کسی مارشل لاء آرڈر یا ریگولیشن جو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یا کسی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے جاری کیا ہو، یا ان کے کسی فعل، عمل پر جو انہوں نے کیا ہو یا کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، کے متعلق کوئی حکم، خصوصاً ان کے با اختیار ہونے کے متعلق جاری کریں۔

(ب) کسی فوجی عدالت کے فیصلے کے متعلق، دی ہوئی سزا کے متعلق یا فیصلے کے اثرات و نتائج کے متعلق، خصوصاً ایسی فوجی عدالت کے اختیارات کے متعلق کوئی حکم جاری کریں۔

(ج) کسی مقدمہ یا کاروائی کے متعلق جس کا اختیار کسی فوجی عدالت یا ٹربیونل کو دیا گیا ہو، کوئی حکمِ امتناعی جاری کریں یا کوئی کاروائی کریں یا شکایت کی سماعت کریں۔

(د) چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر یا کسی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے خلاف یا کسی ایسے فرد کے خلاف جو ان کے ماتحت کام کر رہا ہو کوئی حکم جاری کریں۔

(۶) کوئی ایسا حکم، حکم امتناعی یا عمل جس کا ذکر اُوپر دفعہ (۵) میں کیا گیا، کو حکم عدالت، جو اس نوٹیفکیشن کے بعد یا پہلے جاری ہوا ہو منسوخ سمجھا جائے گا اور قطعی قابلِ عمل نہ ہوگا اور ہر مقدمہ یا کاروائی جو کسی عدالت کے زیرِ سماعت ہو، خارج سمجھی جائے گی۔ نیز یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ کوئی ایسا عمل یا عدالت کا فیصلہ کسی مارشل لاء اتھارٹی یا اس کے ماتحت کام کرنے والے کسی سول ملازم کے خلاف لاگو نہیں ہوگا۔"

(۷) آرٹیکل نمبر ۱ کے تحت ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ کے جج صاحبان

پی، سی، او کے تحت حلف اٹھانے کے پابند قرار دیئے گئے۔ لیکن بعض جج صاحبان نے یہ حلف لینے سے انکار کر دیا اور بعض جج صاحبان کو حلف لینے کی دعوت ہی نہیں دی گئی۔ جس سے مراد یہ تھی کہ ان جج صاحبان کو ان کے عہدوں سے برخواست کر دیا گیا ہے۔

پاکستان کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس انوار الحق اور سپریم کورٹ کے دو اور جج صاحبان نے حلف لینے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح ہائی کورٹ کے کئی جج صاحبان نے یا تو حلف لینے سے انکار کر دیا یا پھر انھیں حلف لینے کی دعوت ہی نہیں دی گئی۔ اس طرح ۱۶ جج صاحبان کو فرائض سے سبکدوش کر دیا گیا۔ بلوچستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس میر خدا بخش مری بھی ان میں شامل تھے ضیاء الحق نے نہایت خاموشی سے ایک طرف تو پورے آئینی نظام کو تبدیل کر دیا اور عدلیہ کے اختیارات و آزادی کو بھی محدود کر دیا گیا۔ دوسری جانب اپنی ذات کی مرکزیت کو یقینی بنا لیا۔ پی سی، او کا آرٹیکل نمبر ۱۶ جو سیاسی جماعتوں کے متعلق تھا درج ذیل ہے:۔

(۱) "جب صدر کی جانب سے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دی جائے گی تو صرف وہی کالعدم پارٹیاں اس میں حصہ لے سکیں گی جنھوں نے گیارہ اکتوبر ۱۹۷۹ء تک الیکشن کمیشن میں رجسٹریشن کروا رکھی ہو یا جن کو الیکشن کمیشن سیاسی عمل کی اجازت دے چکا ہو۔

(۲) اوپر بیان کی ہوئی پارٹیوں کے علاوہ اور تمام سیاسی پارٹیاں کالعدم تصور ہوں گی اور ان کی املاک بحق سرکار ضبط کی جائیں گی۔

(۳) اس حکم کے بعد کوئی نئی سیاسی پارٹی معرضِ وجود میں نہیں آسکے گی الاّ یہ کہ الیکشن کمیشن اس کو اجازت دے۔

(۴) اگر صدر کو باور ہو کہ کوئی سیاسی پارٹی معرضِ وجود میں آئی ہے یا پہلے سے موجود ہے اور اس طرح سے کام کر رہی ہے کہ اسلامی نظریہ کو ٹھیس پہنچے یا پاکستان کی سالمیت یا ریاست کو کوئی گزند ہو تو صدر چیف الیکشن کمشنر کے مشورے سے اس پارٹی کو ختم کر سکتا ہے۔"

پی، سی، او کے نفاذ سے حسبِ ذیل اثرات مرتب ہوئے:۔

(۱) ریاست کے تینوں شعبوں یعنی انتظامیہ، مقننہ اور عدلیہ کے اختیارات ضیاء الحق کی ذاتِ واحدہ میں مرتکز ہو گئے۔

(۲) بیگم نصرت بھٹو کیس میں دیئے گئے سپریم کورٹ کے فیصلے کو مکمل طور پر مسترد کر دیا گیا۔

(۳) اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات کو محدود کر دیا گیا۔ نیز مارشل لاء حکام کے غیر قانونی، غیر آئینی اقدامات اور فوجی عدالتوں کے فیصلوں کو عدلیہ کی نظرِ ثانی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔

(۴) اعلیٰ عدالتوں کے جج صاحبان کی ایک بہت بڑی تعداد کو فرائض سے سبکدوش کر کے عدالتی نظام میں بہت بڑا خلاء پیدا کر دیا گیا۔

ضیاء الحق کا نظریۂ انصاف اور اسکی چیرہ دستیاں

اپنے گیارہ سالہ دورِ حکومت میں ضیاء الحق جن کھوکھلے نعروں سے اس قوم کو بے وقوف بناتا رہا۔ ان میں سے ایک نعرہ سستے انصاف کا بھی تھا۔ یہ سستا انصاف کیا بلا ہوتی ہے۔ اس کا علم غالباً خود ضیاء الحق اور اس کے مشیرانِ قانون کو بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سستے انصاف کی کوئی واضح اور جامع تعریف یا اس کے حصول کا طریقۂ کار کبھی بھی قوم کے سامنے پیش نہ کیا۔ یہ ضرور ہوا کہ ضیاء الحق نے

سمری ملٹری کورٹس اور اسپیشل ملٹری کورٹس کی شکل میں ایک ایسا ظالمانہ نظام نافذ کیا کہ جن کی کاروائیوں سے عدل و انصاف کے ایوان لرزتے رہے۔ اور یہ ظالمانہ نظام ایک طویل عرصے تک جاری رہا۔ ان عدالتوں کی کارکردگی اور انصاف کا معیار صرف یہ تھا کہ انہوں نے اس قوم کے کتنے بدنصیب افراد کو کوڑے مارے کتنے ایسے تھے کہ جن کو لمبی لمبی سزائیں دے کر جیلوں میں قید رکھا اور کتنے ایسے تھے کہ جن کو تختۂ دار پر کھینچ دیا گیا۔ یہ انصاف اتنا سستا اور اتنا فوری ہوتا تھا کہ ہر مجرم چند دنوں میں سزا کے اذیت ناک مراحل طے کر لیتا تھا۔ یہی پہچان ہے اس سستے انصاف کی جو ضیاء الحق کے ذہن میں تھا۔ اللہ تعالیٰ کا اس قوم پر بڑا فضل و کرم ہوا کہ اس نے ضیاء الحق کو ایسا سستا نصاف فراہم کرنے کی توفیق و مہلت ہی نہ دی اور اس سے پیشتر کہ وہ اس سمت میں کوئی قدم اٹھاتا اس کا سر رشتۂ حیات ختم کر دیا۔

ضیاء الحق کا عدلِ گستری

عدلِ گستری انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایک بنیادی اخلاقی قدر کی حیثیت سے بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہر وہ معاشرہ جو عدل سے محروم ہوا، تباہ ہو گیا۔ اسلامی شریعت میں بھی قیام عدل پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے عالمی منشور برائے حقوقِ انسانی نیز پاکستان کے آئین ۱۹۷۳ء میں بھی نفاذِ عدل کی بڑی تاکید کی گئی ہے لیکن ضیاء الحق کے نزدیک عدلِ گستری محض تفریح، دل لگی اور ایذا رسانی کا سامان تھا۔

ضیاء الحق کا سستا اور فوری انصاف

ضیاء الحق نے ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو مارشل لاء کے اعلان کے ساتھ ہی ساتھ مارشل لاء قوانین کی ایک طویل فہرست بھی جاری کر دی

جس کے تحت سیاسی سرگرمیوں اور دیگر بہت سے معاملات کو جرم قرار دیدیا گیا اور ان جرائم کے مقدمات کی سماعت کا اختیار فوجی عدالتوں کو حاصل ہو گیا۔ فوجی عدالتوں کے قیام کے لیے مارشل لاء حکم نمبر ۴ جاری کیا گیا جس کے تحت پورے ملک میں اسپیشل ملٹری کورٹس کا دائرہ اختیار سزائے موت تک وسیع تھا جبکہ سمری ملٹری کورٹس ایک سال قید اور جرمانے کے علاوہ ۱۵ کوڑوں تک کی سزا دینے کی مجاز تھیں۔ ہر جرم کی سزا میں کوڑوں کی سزا ضرور شامل ہوتی تھی۔ فوجی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف کسی بھی عدالت کو اپیل کی سماعت کا اختیار حاصل نہ تھا۔ البتہ یہ تکلف ضرور برتا گیا کہ سزائے موت اور ہاتھ کاٹنے کی سزا کی تصدیق کا اختیار چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو اور دیگر سزاؤں کی تصدیق کا اختیار اس زون کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو دیا گیا تھا۔ کوڑوں کی سزا مارشل لاء کی ایک بنیادی ضرورت ہوتی ہے۔ مارشل لاء کے مقاصد میں یہ تصور بھی شامل ہوتا ہے کہ قوم کو شدید قسم کے خوف وہراس میں مبتلا کر کے عوام کے ذہنوں میں حکومت کی ہیبت بٹھا دی جائے تاکہ کوئی بھی شخص حکومت کے مظالم کے خلاف احتجاج کرنے کی جرأت نہ کر سکے کہ کوڑے بازی اس مقصد کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔

کوڑے بازی اور توہینِ انسانیت

چنانچہ ہر معمولی سے معمولی جرم کی سزا میں کوڑے بازی شامل کر دی گئی۔ اس طرح ملک کے شریف شہریوں کو ننگا کر کے کوڑے مارنا روز کا معمول بن گیا۔ کوڑے بازی ایک ایسی وحشیانہ سزا ہے جس سے ہر انسان ایک شدید قسم کے جسمانی کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی اسکی عزتِ نفس کو سخت دھچکا لگتا ہے وہ اپنے آپ کو انسانیت کے معیار سے پست محسوس کرنے لگتا ہے ایسے افراد میں ردِ عمل کے طور پر بالعموم بغاوت کے جذبات
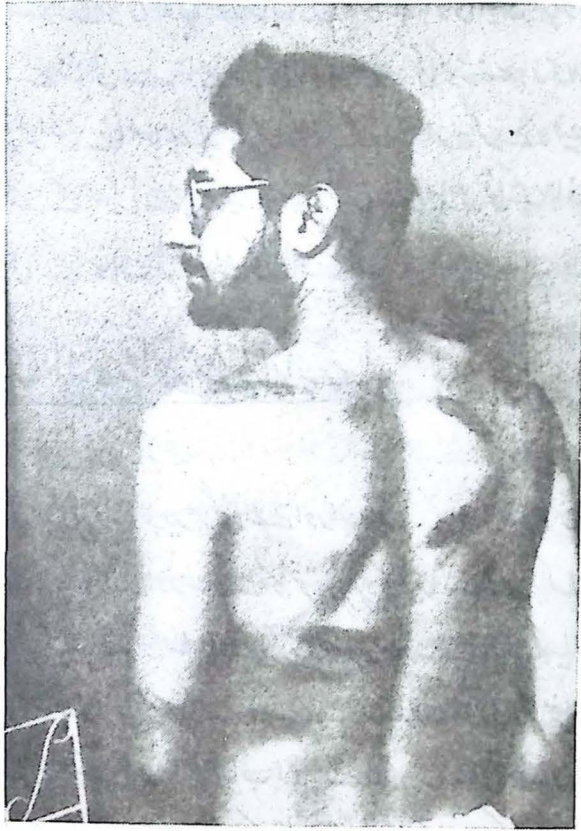
دورِ ضیاء الحق کے سینکڑوں ستم رسیداؤں میں سے، ایک حافظ
محمّد امجد عارف (سرگودھا ربوہ) بھیانک تشدّد کی ایک جھلک

جنم لینا شروع کر دیتے ہیں پھر یہ لوگ معاشرے کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ سندھ کی بگڑی ہوئی صورتحال میں کوڑے بازی ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے شامل ہے۔ تاہم مارشل لاء عدالتوں کی کوڑے بازی سے متاثر ہو کر ضیاء الحق نے اسلام کے مقدس نام پر کوڑے بازی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے جنرل ضیاء الحق نے اسلامی قوانین نافذ کیے جن کی تفصیل اگلے صفحات میں بیان کی جائے گی۔

"پی، سی، او" پر ماہرین کی رائے

۸ جون ۱۹۸۳ء کے روزنامہ جنگ میں ریٹائرڈ جسٹس فخر الدین جی ابراہیم نے ایک بیان میں کہا کہ :۔

" عدلیہ کی روح ناپید ہو گئی ہے اور انصاف کے ایوان خاموش قبریں بن گئی ہیں۔ اسلام آزادی اور مساوات کا حق ہر فرد کو دیتا ہے لیکن پاکستان میں یہ حق چھین لیا گیا ہے۔ جج صاحبان کو فوری طور پر عہدے سے الگ کیا جا سکتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی معاشرے میں قانون کی کوئی جگہ نہیں ہے۔"

سابق سیکریٹری داخلہ جناب ایم، اے، کے چوہدری لکھتے ہیں کہ :۔

" پی، سی، او۔ بذاتِ خود ملک کا قانونِ اوُلی بن گیا اور ملک کی سِول عدالتیں اختیارات سے محروم کر دی گئیں۔ اس اقدام سے ظاہر ہے کہ عوام کے بنیادی حقوق بری طرح سے مجروح ہوئے۔ فوجی عدالتوں کے سربراہ اور ممبر صاحبان چاہے کتنے ہی نااہل ہوں اور قانون سے کتنے ہی نابلد، ان کے فیصلے حرفِ آخر ہو گئے اور ان فیصلوں کے خلاف ملک کی اعلیٰ عدالتوں کے دروازے بند ہو گئے۔ ایسا کڑا اقدام کرنے میں کیا مصلحت تھی یہ تو مارشل لاء کے اربابِ اختیار یا ان کے سیاسی اور قانونی مشیرانِ کرام ہی جانتے ہوں گے لیکن

عام آدمی کو جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام اقتدار اور اختیار مارشل لاء حکام کے ہاتھ میں ہو اور اس اقتدار اور اختیار میں نچلے درجے کے فوجی افسران کو بھی شامل کیا جائے خواہ وہ قابلیت کے اعتبار سے اس کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ فوجی عدالتوں میں بد دیانتی در آئی۔ ایک ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل کے مطابق ان عدالتوں میں جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے رشوت کے نرخ مقرر ہو گئے تھے۔ جہاں تک ان فوجی عدالتوں کے سربراہان اور ممبران کی اہلیت کا تعلق ہے لاہور ہائی کورٹ کے ایک ممتاز فوجداری وکیل نے بیان کیا کہ ایک مقدمہ میں وہ راولپنڈی کی ایک فوجی عدالت میں ایک ملزم کی ضمانت کے سلسلے میں پیش ہوئے۔ جرم قابلِ ضمانت تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ ملزم کی ضمانت اس کا قانونی حق ہوتا ہے۔ وکیل صاحب نے اپنا موقف بیان کیا اور ضابطۂ فوجداری کا حوالہ دیا۔ عدالت کے سربراہ نے ناراض ہو کر پوچھا کہ یہ ضابطۂ فوجداری کیا بَلا ہوتی ہے۔؟ وکیل صاحب نے کتاب پیش کی اور مناسب دفعہ بھی بتائی۔ جج صاحب نے مزید پوچھا کہ یہ کتاب کس نے لکھی ہے۔ عرض کیا کہ یہ ملک کا قانون ہے۔ جج صاحب حیران ہوئے اور فرمایا کہ میں سال بھر سے عدالت کر رہا ہوں اور آج یہ کتاب میرے سامنے پیش کی جا رہی ہے۔ میں اس کو پڑھنا چاہوں گا۔ وکیل صاحب نے کتاب بطورِ تحفہ اپنی طرف سے پیش کی اور اپنے ملزم کو ضمانت پر رہا کرا کر عجلت میں عدالت سے رخصت ہوئے۔"

۱۰ جنوری ۱۹۸۵ء کو رسالہ "میگ" (MAG) میں ریٹائرڈ جسٹس جناب دراب پٹیل کا ایک بیان شائع ہوا۔ جس میں آپ نے کہا:۔

"ہم ایک طویل اور تاریک سُرنگ میں ہیں جس کے آخری کنارے پر

بھی کوئی روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ کسی شخص کو معلوم نہیں کہ کل کیا ہوگا۔[1]"

جنرل ضیاء الحق نے محض اپنے اقتدار کو تسلیم کرانے کے لیے پاکستان کے آئینی، قانونی اور عدالتی نظام کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ضیاء الحق نے عدلیہ کی آزادی کو ختم کرنے کے لیے حسبِ ذیل اقدامات کیے:۔

ضیاء الحق اور عدلیہ کی آزادی

۱۹۷۳ء کا آئین ایک آزاد اور خود مختار عدلیہ کی ضمانت دیتا ہے لیکن جنرل ضیاء الحق نے پی، سی، او کے نفاذ کے علاوہ عدلیہ کی آزادی کو ختم کرنے اور جج صاحبان کو خوفزدہ کرنے کے لیے مزید حسبِ ذیل اقدامات کیے:۔

(ا) صدارتی حکم نمبر ۱۴ مجریہ ۱۹۸۵ء کے ذریعے آئین کے آرٹیکل نمبر ۱۹۶ میں ترمیم کر کے جج صاحبان کی سینیارٹی ختم کر دی گئی اور صدرِ مملکت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ کسی بھی ہائیکورٹ کے چیف جسٹس کا عہدہ خالی ہونے کی صورت میں یا چیف جسٹس کی غیر حاضری میں صدرِ مملکت ہائی کورٹ کے کسی بھی جج یا سپریم کورٹ کے کسی بھی جج سے درخواست کر سکتے ہیں کہ وہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا عہدہ سنبھال لیں۔

(ب) آئین کے آرٹیکل نمبر ۲۰۲ میں ترمیم کر کے صدرِ مملکت نے یہ اختیار حاصل کر لیا کہ وہ کسی بھی ہائی کورٹ کے جج کو اس کی رضامندی کے بغیر اور اس ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سے مشورہ کیے بغیر دو سال تک کے لیے کسی بھی دوسرے ہائی کورٹ میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ یا اس کو جج کے علاوہ کسی بھی دوسرے منصب پر مامور کر سکتے ہیں اور جو جج صاحبان اس تبدیلی کو قبول نہیں کریں گے ان کو اس تاریخ سے ملازمت سے ریٹائر

تصور کیا جائے گا۔

(ج) وفاقی شرعی عدالت کے قیام کے لیے آئین میں باب ۳۔ اے کا اضافہ کیا گیا اور آرٹیکل نمبر ۲۰۳ سی کے ذریعے وفاقی شرعی عدالت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس آرٹیکل کی ذیلی دفعہ ۴۔ بی کے تحت صدرِ مملکت نے جج صاحبان کی شرائط ملازمت طے کرنے کا اختیار حاصل کر لیا۔ جس میں یہ اختیار بھی شامل ہے کہ صدرِ مملکت جج صاحبان کو عدالتی فرائض کے علاوہ دوسرے فرائض پر بھی مامور کر سکتے ہیں اور اگر کوئی جج کوئی دوسری ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کرے تو وہ اسی تاریخ سے ریٹائر تصور کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا اقدامات کے ذریعے انتظامیہ نے مکمل طور پر عدلیہ پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ ہر چند کہ یہ ترامیم مارشل لاء کے دوران کی گئیں لیکن مارشل لاء ختم ہونے کے باوجود نافذ العمل ہیں۔ اور عدلیہ کی آزادی کو متاثر کر رہی ہیں۔

(د) آئین میں آٹھویں ترمیم کے ذریعے مارشل لاء حکام کے تمام اقدامات اور فوجی عدالتوں کے فیصلوں کو اعلیٰ عدالتوں کے دائرہ اختیار سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔ اس طرح آئین کی بحالی کے باوجود مارشل لاء کے اثرات کو قائم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عدلیہ کی آزادی پر انتظامیہ کی گرفت کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس جناب جسٹس آفتاب حسین کو حکومت کی طرف سے مذہبی امور کی وفاقی وزارت میں مشیر کا عہدہ قبول کرنے کی پیشکش کی گئی جو آپ نے قبول نہ کی لہٰذا آپ کو ریٹائر کر دیا گیا۔

مجلسِ شوریٰ کا قیام

ضیاء الحق نے نفاذِ اسلام کو اپنی حکومت کی اولین ترجیح قرار دیتے ہوئے ۱۹۷۹ء میں اسلام کے بعض تعزیری قوانین نافذ کیے تھے۔ اس سمت میں مزید پیشقدمی

کرتے ہوئے انہوں نے ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۱ء کو وفاقی مجلسِ شوریٰ کے قیام کا اعلان کیا۔ جس کے تحت مجلسِ شوریٰ کے ارکان کی تعداد ۳۵۰ سے زائد تھی۔ ریڈیو اور ٹی، وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے جنرل ضیاء الحق نے کہا :۔

" مجلسِ شوریٰ اس لیے قائم کی گئی ہے کہ موجودہ حالات میں عام انتخابات کرانا قوم کے مفاد میں نہیں ہے۔ تاہم یہ عبوری انتظام ہے اور یہ قومی اسمبلی کا بدل نہیں ہے۔ مستقل نمائندہ اداروں کے انتخاب کے بعد مجلسِ شوریٰ خود بخود ہی ختم ہوجائے گی۔ مجلسِ شوریٰ اسلامی جمہوری معاشرے کے قیام کے لیے کام کرے گی۔ مجلسِ شوریٰ کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۳۵۰ سے زیادہ ہوگی۔ ان میں سے ۲۸۷ ممبروں کے ناموں کا اعلان آج کیا جارہا ہے۔ باقی ممبروں کے ناموں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔"

ضیاء الحق نے مجلسِ شوریٰ کا قانونی جواز فراہم کرنے کے لیے آئین میں ترمیم کردی اور ۱۱ر جنوری ۱۹۸۲ء کو مجلسِ شوریٰ کا افتتاح کیا۔ اس افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :۔

" یہ مجلسِ شوریٰ انتقالِ اقتدار کی راہ ہموار کرے گی۔ یہ ادارہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ، اسلامی جمہوریت کے قیام، قومی اور بین الاقوامی معاملات میں حکومت کی مدد کرے گا۔ اسی شوریٰ کے قیام سے خامیوں سے پاک جمہوریت اور عوام کے مزاج سے مطابقت رکھنے والے نظام کا ازسرِ نو آغاز کرنے کی کوشش کی جائے گی۔" خواجہ محمد صفدر کو مجلسِ شوریٰ کا صدر بنا دیا گیا۔ کسی زمانے میں ایک فارسی کے اُستاد نے کہا تھا کہ :۔

؎ بہر رنگِ خواہی جامہ مے پوش
من انداز قدت را مے شناسم

ترجمہ:۔ "تو جس رنگ کا چاہے لباس پہن لے۔ میں تجھے تیرے قد کے انداز سے پہچان لوں گا۔

ضیاء الحق کی مجبوری یہ تھی کہ اسکے ذہن میں مکمل آمریت کا جنون سمایا ہوا تھا۔ اس کے حصول کے تین طریقے تھے۔

اوّل یہ کہ پارلیمانی جمہوریت کی مکمل طور پر نفی کر دی جائے اور انتخابی عمل کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے مسترد کر دیا جائے۔

دوئم یہ کہ کوئی ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو اس کو مکمل اختیارات تفویض کر دے۔

سوئم یہ کہ کوئی ایسا نظریہ تلاش کیا جائے جو اس کو عوامی جوابدہی سے بلند و بالا تسلیم کرے۔

یہ اسی نفسیاتی کشمکش کا نتیجہ تھا کہ ضیاء الحق نے کئی چولے بدلے تاکہ وہ اپنے اصل مقاصد تک رسائی حاصل کر سکے۔ چنانچہ مجلس شوریٰ کے قیام کو درست ثابت کرنے کے لیے ضیاء الحق نے یہ اعلان تو کر دیا کہ عام انتخابات کرانا قوم کے مفاد میں نہیں مگر وہ یہ نہ بتا سکا کہ عام انتخابات کرانے میں نقصان کیا ہے۔ دراصل مجلس شوریٰ کا قیام عام انتخابات سے گریز کا محض ایک بہانہ تھا۔ جنرل ضیاء الحق کے ایک مشیر راجہ ظفر الحق تھے۔ موصوف بھی ضیاء الحق کی طرح اسلام کے بہت بڑے داعی تھے اس لیے وہ ضیاء الحق کو یقین دلاتے رہے کہ ملک کی نجات خلافتِ راشدہ کی طرز پر قائم کی جانے والی حکومت میں ہے اور ضیاء الحق کی ذات میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک خلیفۃ المسلمین میں ہونی چاہئیں۔ مجلسِ شوریٰ کا قیام نظامِ خلافت کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ ضیاء الحق کو یقین تھا کہ خلیفۃ المسلمین صرف اللہ تعالیٰ

کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے اور دنیا کا کوئی بھی انسان خلیفہ کا کسی بھی طرح احتساب نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس عقیدے کی بنیاد پر ضیاء الحق نے بارہا اس بات کا اعلان کیا کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہے۔ لیکن ضیاء الحق اور راجہ ظفر الحق زمان و مکان کے اس بُعد کو سمجھنے سے یکسر قاصر رہے جو خلافتِ راشدہ اور آج کے اندازِ حکمرانی میں پیدا ہو چکا ہے۔ انھیں اس بات کا بھی احساس نہ ہوا کہ یہ کل کا واقعہ ہے کہ ترکی نے خلافت کے ادارے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔

مجلسِ شوریٰ کا خاتمہ اور عام انتخابات کا اعلان

مجلسِ شوریٰ جن مقاصد کے لیے قائم کی گئی تھی ان میں سے کوئی مقصد بھی پورا نہ ہو سکا۔ نہ تو اسلامی نظام ہی آیا اور نہ ہی اسلامی جمہوریت نافذ ہو سکی البتہ یہ ضرور ہوا کہ مجلسِ شوریٰ ضیاء الحق کی مدح سرائی کر کے سرکاری اخراجات کو جائز قرار دیتی رہی۔ آخر کار ضیاء الحق کو یقین ہو گیا کہ نہ تو وہ خلیفہ بن سکتا ہے اور نہ ہی نظامِ خلافت قائم کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مطلق العنان اور بے لگام آئینی صدر کا روپ دھار کر اقتدار پر قابض رہے۔ یہ اسی ہوسِ اقتدار کا تقاضا تھا جس کی بناء پر ضیاء الحق نے ۱۹۷۳ء کے آئین میں پے درپے ترامیم کر کے اس صاف ستھرے آئین کو ایک معمّہ بنا کر رکھ دیا۔ اور اس طرح حکمرانی کے تمام اختیارات اپنی ذات میں جمع کر لیے۔ آخر کار ۱۲ اگست ۱۹۸۳ء کو ضیاء الحق نے مجلسِ شوریٰ کے سامنے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مارچ ۱۹۸۵ء میں عام انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا اور مجلسِ شوریٰ کی افادیت سے اُنہ خود انکار کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی جنرل ضیاء الحق اور اس کے رفقاء نے ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء سے لے کر

۲۴ر اکتوبر تک ملک کے سیاستدانوں سے انتخابات کے مسئلہ پر مذاکرات کئے اور ۲۵ر اکتوبر کو الیکشن کمیشن کو انتخابات کی تیاری کی ہدایات جاری کر دی گئیں۔

جنرل ضیاء الحق کا ریفرینڈم ۱۹۸۴ء

دنیا کے تمام آمروں میں یہ کمزوری قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ ہر آمر اپنی آمریت کے حق میں آئینی جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اور جونہی اسے مناسب موقع میسّر آتا ہے وہ فوراً فائدہ اٹھاتا ہے۔ چنانچہ ضیاء الحق نے بھی مجلسِ شوریٰ کی کارکردگی سے متاثر ہو کر عوام سے ووٹ حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح اپنی آمریت کا آئینی جواز تلاش کرنے کا بہانہ بنا لیا۔ ضیاء الحق نے یکم دسمبر ۱۹۸۴ء کو ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ اپنی پالیسیوں کی تائید حاصل کرنے کے لیے ملک میں ریفرینڈم کرائے گا اور یہ ریفرینڈم... ۱۹ر دسمبر ۱۹۸۴ء کو الیکشن کمیشن کی نگرانی میں منعقد ہوگا۔ چنانچہ پروگرام کے مطابق یہ ریفرینڈم کرایا گیا اور جس سوال پر یہ ریفرینڈم ہوا وہ یہ تھا کہ:۔

"کیا آپ صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق کے اس عمل کی تائید کرتے ہیں جو انہوں نے پاکستان کے قوانین کو قرآن حکیم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطابق اسلامی احکامات سے ہم آہنگ کرنے اور نظریۂ پاکستان کے تحفّظ کے لیے شروع کیا ہے۔ اور کیا آپ اس عمل کو جاری رکھنے، مزید استوار کرنے اور منظم و پُر امن طریقے سے اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔؟"

اس سوال کا جواب "ہاں" یا "ناں" میں دیا جانا تھا۔ اگر جواب "ہاں" میں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ضیاء الحق آئندہ پانچ سال کے لیے صدر بن جائے گا۔

اس سے زیادہ سنگین مذاق کسی پاکستانی کے ساتھ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے یہ پوچھا جائے کہ کیا وہ پاکستان کے قوانین کو قرآنِ حکیم اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطابق بنانے کی حمایت کرتا ہے؟ اور اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ اگر قوم اس سوال کا جواب اثبات میں دیتی ہے تو جنرل ضیاء الحق مزید پانچ سال کے لیے صدر بن جائے گا۔ گویا ضیاء الحق مجسّم اسلام ہے اُسے منظور کرو یا مسترد کردو۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو اور چاہے تیرا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ایم، آر، ڈی کا اعلانِ بائیکاٹ

تحریکِ بحالیٔ جمہوریت جو ایم آر ڈی کے نام سے عوام النّاس میں مقبول تھی اُس نے ریفرینڈم کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ضیاء الحق نے ریفرینڈم کے بائیکاٹ کو قابلِ دست اندازی جُرم قرار دے کر تین سال تک قید اور پانچ لاکھ روپے جرمانے کی سزا کا مستوجب بنا دیا۔ اس سزا کے نفاذ کا مقصد محض ریفرینڈم کی اہمیّت و حیثیت کو بڑھانا تھا لیکن یہ طریقہ انتہائی بھونڈا اور قوم سے ظالمانہ مذاق کے مترادف تھا۔ اس سزا کے اطلاق سے کوئی اچھا اثر نہ پڑا بلکہ جمہوریت پسند عوام النّاس کے مزاج کو مزید چڑچڑا بنا دیا گیا۔

ریفرینڈم کے نتائج اور قومی و بین الاقوامی رائے عامّہ

متذکرہ بالا حالات میں ضیاء الحق نے ۹۷،۷۱ فیصد ووٹ حاصل کر کے ریفرینڈم میں نہایت ہی شاندار اور تاریخی کامیابی حاصل کر لی۔ دراصل ضیاء الحق کا مقصد اپنی آمریت کا اخلاقی جواز فراہم کرنا تھا، جو اس نے کر لیا۔ جہاں تک ریفرینڈم کے

حق میں ووٹ ڈلوانے کا تعلق تھا تو اس کو صرف درجِ ذیل چند مثالوں سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

(۱) جناب ایم، اے، کے چوہدری فرماتے ہیں کہ:۔

"میں نے خود ایک شخص سے جو موقع پر موجود تھا سُنا کہ ڈیرہ غازی خان میں ایک وزیر، جو سابقہ فوجی بھی ہیں۔ عوام کو ایک جلسہ میں ترغیب دے رہے تھے کہ ہر شخص کم از کم پچاس یا ساٹھ ووٹ ڈالے۔"

(۲) بین الاقوامی پریس میں بھی اس ریفرنیڈم کی بڑی مذمت کی گئی۔ ریفرنیڈم کے فوراً بعد "اکانومسٹ لندن" نے لکھا کہ:۔

"دسمبر میں صدر ضیاء الحق نے ایک ریفرنیڈم کرایا۔ جس کے ذریعے اس نے اپنے آپ کو اسلام کے داعی کی حیثیت سے پانچ سال کے لیے صدرِ پاکستان بنا لیا۔ اس کارگزاری میں اتنے بھونڈے طریقے سے دھاندلی کی گئی کہ اشترا کی حکومتیں بھی ایسے اقدام سے شرما جائیں۔"

(۳) "اس سلسلے میں ہفت روزہ "اخبارِ جہاں" نے اپنی حالیہ اشاعت ۱۴ تا ۲۰ نومبر ۱۹۸۸ء میں انتخابی تجزیے اور ملکی سیاسی حالات کے بارے میں ریفرنیڈم ۱۹۸۴ء کے سلسلے میں انکشاف کرتے ہوئے لکھا کہ:۔

"ضیاء الحق نے جو ریفرنڈم کرایا تھا اس میں صرف سات فیصد ووٹ ڈالے گئے تھے لیکن انہوں نے جعلی نتائج مرتب کرانے کے لیے ایک سیل قائم کیا تھا۔ جس نے فرضی نتائج مرتب کیے جن کا اعلان ریڈیو اور ٹی وی سے کیا گیا۔ اور ان نتائج کے تیار کنندگان کو انہوں نے بڑے بڑے انعام و اکرام سے فراخ دلی سے نوازا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ جنرل ضیاء الحق اگر زندہ ہوتے تو ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کے اعلان کردہ انتخابات بھی منعقد نہ کراتے بلکہ ان

کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ عین وقت پر یہ انتخابات ملتوی کر کے دسمبر ۱۹۸۴ء کی طرز پر ایک ریفرینڈم منعقد کرا کر خود کو مزید پانچ سال کے لیے مسندِ صدارت پر فائز کرنے کے لیے ایک سہل راہ نکال لیتے لیکن قدرت نے انھیں اپنے اس منصوبے کی تکمیل کا موقع ہی نہ دیا۔ اور اس طرح قوم کو انتخابات کے ذریعے اپنے نمائندوں کے انتخاب کا موقع حاصل ہو رہا ہے۔"

یہ تھی وہ شہرت۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اسلام کے اس خود ساختہ چیمپین کی جو مذہب کے مقدس نام پر اپنی آمریت کو طول دیتا رہا۔ اس حقیقت کو درج ذیل شعر سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے:۔

ص سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا افسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

۲۱ دسمبر ۱۹۸۴ء کو ضیاء الحق نے ریڈیو اور ٹی وی پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے ریفرینڈم کے نتائج پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے اعلان کیا کہ۔

"پاکستان اپنی تاریخ کے نئے دور میں داخل ہو چکا ہے۔"

ضیاء الحق کے بیان میں اس حد تک صداقت ضرور موجود ہے کہ پاکستان آمریت کے دوسرے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ کیونکہ ریفرینڈم کے مفروضہ نتائج سے ضیاء الحق کی آمریت کو آئینی جواز ضرور میسر آگیا۔

۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات

جنرل ضیاء الحق نے ۱۲ جنوری ۱۹۸۵ء کو قوم سے خطاب کرتے ہوئے الیکشن شیڈول کا اعلان کیا۔ ضیاء الحق نے کہا کہ عام انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر غیر جماعتی اور جداگانہ ہوں گے۔ قومی اسمبلی کے یہ انتخابات ۲۵ فروری کو ہوں گے۔ جبکہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۲۸ فروری

کو منعقد ہوں گے۔ سینیٹ کا انتخاب وسطِ مارچ میں ہوگا اور مجلس شوریٰ یعنی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء کو ہوگا۔

ضیاء الحق نے امیدواروں کی انتخابی اہلیت کے لیے ہاؤس آف پارلیمنٹ اینڈ پراونشل اسمبلیز الیکشن آرڈیننس مجریہ ۱۹۷۷ء اور پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ مجریہ ۱۹۶۲ء میں ترامیم کر کے نئی شرائط مقرر کیں۔ جو حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) سینیٹ، قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے امیدواروں کو باعمل مسلمان ہونا چاہیئے۔

(۲) امیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی احکام سے انحراف کی شہرت نہ رکھتا ہو؛

(۳) اس کے علاوہ امیدواروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کا خاطر خواہ علم رکھتا ہو۔

(۴) فرائض کی پابندی اور گناہِ کبیرہ سے اجتناب کرتا ہو۔

(۵) امیدوار کے لیے ضروری ہے کہ وہ قیام پاکستان کے بعد قومی سالمیت اور نظریۂ پاکستان کا مخالف نہ رہا ہو۔

(۶) جو اشخاص سمگلنگ، ذخیرہ اندوزی، منافع خوری، رشوت یا ملاوٹ کے جرائم میں سزا یافتہ ہوں گے، خواہ ان کی سزا کی مدّت چھ ماہ یا اس سے بھی کم کیوں نہ ہو۔ انتخابات میں حصّہ لینے کے اہل نہ ہوں گے۔"

اہلیت اور نااہلیت کے سلسلے میں پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ میں کچھ ترامیم کی گئیں، جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ اس ایکٹ کی ترمیم شدہ دفعہ نمبر ۸ میں جن افراد کو پہلے ۵ سال کے لیے نااہل قرار دیا گیا تھا اب ان کی نااہلی کی مدّت بڑھا کر بارہ سال کر دی گئی ہے۔

۲۔ اس دفعہ میں ایک اور ترمیم کے ذریعے ان تمام افراد کو سات سال کے

لیے نااہل قرار دیا گیا ہے۔ جو یکم دسمبر ۱۹۷۱ء کے بعد صوبائی یا وفاقی سطح پر کسی وقت بھی ایسی سیاسی پارٹی کے عہدیدار یا اس کی ایگزیکٹیو کمیٹی کے رکن رہے ہوں جس نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۹ء تک الیکشن کمیشن کے پاس رجسٹریشن نہ کرایا ہو، اور وہ افراد بھی جو یکم دسمبر ۱۹۷۱ء اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کے درمیان وفاقی یا صوبائی وزیر، مملکت یا مشیر رہے ہوں۔ سوائے ان لوگوں کے جو وفاقی کونسل یا مجلس شوریٰ کے ارکان ہوں یا رہے ہوں، وہ وفاقی کابینہ کے وزیر ہوں یا رہے ہوں، صوبائی کونسل یا صوبائی کابینہ کے رکن رہے ہوں یا ہوں، اس کے علاوہ صدر مملکت کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ از خود یا متعلقہ شخص کی درخواست پر کسی نااہل شخص کو نااہلیت سے مستثنیٰ کر سکتے ہیں۔"

ایم، آر، ڈی کا انتخابی بائیکاٹ

۸ جنوری ۱۹۸۵ء کو ضیاء الحق نے مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۶۵ جاری کیا جس کے تحت وہ کسی بھی شخص کو نااہلی سے مستثنیٰ قرار دے سکتا تھا۔ چنانچہ اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے ضیاء الحق نے ۴۷ افراد کی نااہلی کو ختم کر دیا۔۔۔
ایم، آر، ڈی نے ۱۹ جنوری کو ایبٹ آباد میں اپنی مرکزی کمیٹی کے اجلاس میں اس الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ تاہم انتخابات پروگرام کے مطابق ہی منعقد کرائے گئے اور یکم مارچ کو مجلس شوریٰ کو توڑ دیا گیا۔

غیر جماعتی مگر سیاسی انتخابات

غیر جماعتی انتخابات کا تصور دنیا کی جمہوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ ضیاء الحق کے الجھے ہوئے ذہن کی اُپج ہی تھی کہ انتخاب تو ہو رہے ہیں لیکن سیاسی جماعتوں کو حصہ لینے کی اجازت نہیں ہے۔ جبکہ جنرل ضیاء الحق کے من پسند سیاستدان، ارکانِ مجلسِ شوریٰ، مرکزی و صوبائی وزراء وغیرہ سب ہی ان انتخابات

میں حصہ لے رہے ہیں۔ اب ضیاء الحق کو یہ بات کون سمجھاتا کہ "اے عقل کے دشمن" یہ انتخابات کس طور پر غیر سیاسی اور غیر جماعتی ہیں جبکہ متعدد امیدواروں کا تعلق ظاہرہ یا خفیہ طور پر کسی نہ کسی سیاسی جماعت سے ضرور ہے۔ جس کا علم بہر حال خود انہیں بھی بخوبی تھا۔ جنرل ضیاء الحق اسلامی نظام کے بہت بڑے داعی تھے۔ لیکن ہمیں پوری اسلامی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ جس میں ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پر غیر جماعتی انتخابات کرائے گئے ہوں۔ ضیاء الحق کا حلقۂ فکر اپنے ذاتی اقتدار کے محور سے آگے جاتا ہی نہ تھا۔ اس نے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے انتخابات کا ڈھونگ نہ صرف اس لیے رچایا تھا کہ وہ دنیا کو یہ بتا سکے کہ ملک میں منتخب جمہوری ادارے سرگرم عمل ہیں اور وہ ایک جمہوری حکومت کا سربراہ ہے۔ حالانکہ سیاسی جماعتوں کے بغیر جمہوریت کا کوئی تصور ممکن ہی نہیں۔ ضیاء الحق کو معلوم تھا کہ اگر سیاسی جماعتوں کو منظم ہونے اور انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دی گئی تو یہ لوگ انتخاب سے پہلے ہی اپنے انتخابی منشوروں میں ضیاء الحق کا کچا چھٹا کھول کر رکھ دیں گے۔ اسی خوف کے پیشِ نظر ریفرینڈم کے ذریعے اپنے آپ کو صدر بنوا لینے کے باوجود ضیاء الحق نے فوج کی سربراہی سے علحیدگی اختیار نہیں کی تھی اور صدارت کے ساتھ ساتھ اس نے چیف آف اسٹاف کا عہدہ بھی اپنے پاس ہی رکھا۔ اس لیے کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کا اصل انتخابی ادارہ فوج ہے اور فوج سے علحیدہ ہو جانے کے بعد اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو گی۔ درحقیقت ضیاء الحق نے انتہائی چالاکی اور کمال ہوشیاری سے کام لے کر فوج کو سیاستدانوں کے مدِمقابل لا کھڑا کیا تھا لیکن سیاستدانوں نے جو محبِ وطن تھے انتخابات میں مزاحمت کرنے کے بجائے بائیکاٹ کرنا مناسب سمجھا۔

اس طرح ان محبِّ وطن سیاستدانوں نے ملک میں خانہ جنگی کے امکانات کو یکسر ختم کر دیا۔ چنانچہ انتخابات پروگرام کے مطابق پرُامن طور پر مکمل کرالیے گئے۔

آئین کی بحالی کا حکم

قومی اسمبلی منتخب ہونے کے باوجود ضیاءالحق نے ۲ مارچ ۱۹۸۵ء کو آئین کی بحالی کا حکم نمبر ۱۴ جاری کر کے آئین میں نہایت اہم اور بنیادی تبدیلیاں کر ڈالیں۔ ان ترامیم سے حکومت کے تمام اختیارات صدر کی ذاتِ واحدہ میں مرتکز کر دیئے گئے۔ نیز یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ صدرِ مملکت جب چاہیں گے ترمیم شدہ آئین نافذ کر دیں گے۔ جن دفعات میں بنیادی ترامیم کی گئیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

نمبر شمار	آرٹیکل نمبر	ترامیم
(۱)	۲ - اے	آرٹیکل نمبر ۲ کا اضافہ کر کے قراردادِ مقاصد کو آئین کا حصہ بنا دیا گیا۔
(۲)	۴۱ - (۱)	دفعہ تین کو تبدیل کر کے صدر کے طریقۂ انتخاب کو تبدیل کر دیا گیا۔ پہلے صدر کا انتخاب پارلیمنٹ کے ذریعے عمل میں آتا تھا جبکہ اب انتخابی ادارے میں صوبائی اسمبلیوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔
	(۲)	دفعہ "د" کا اضافہ کیا گیا۔ جس کے مطابق جنرل محمد ضیاء الحق ریفرینڈم کے نتیجے میں اس دن سے ۵ سال کے لیے صدر بن جائے گا، جس دن مجلسِ شوریٰ کا پہلا اجلاس منعقد ہوگا۔

نمبر شمار	آرٹیکل نمبر	ترامیم
(۳)	۴۶	وزیرِ اعظم کا فرض ہوگا کہ :۔ (ا) وہ صدرِ مملکت کو کابینہ کے ان تمام فیصلوں سے آگاہ کرے جن کا تعلق قانون سازی یا انتظامی معاملات سے ہو۔ (ب) صدرِ مملکت کے طلب کرنے پر انتظامی اور قانون سازی کی اطلاعات صدر کو فراہم کرے گا۔ (ج) اگر صدر چاہے تو کوئی ایسا فیصلہ جو وزیرِ اعظم نے کیا ہو یا کسی وزیر نے کیا ہو، کابینہ کے اجلاس میں پیش کرے۔
(۴)	۴۸	آرٹیکل نمبر ۴۸ کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا گیا اور اس کی جگہ نئی دفعہ کو شامل بھی نہیں کیا گیا۔ (۱) صدرِ مملکت اپنے اختیارات کے استعمال میں صدرِ مملکت، کابینہ، وزیرِ اعظم یا متعلقہ وزیر کے مشورے پر عمل کرے گا۔ بشرطیکہ صدر اس مشورے کو کابینہ کے پاس دوبارہ غور کرنے کے لیے واپس بھیج دے اور کابینہ یا وزیرِ اعظم دوبارہ وہی مشورہ دے۔ (۲) لیکن اس کے باوجود صدر ایسے معاملات میں آئین کے مطابق بھی اپنی صوابدید پر کاروائی

نمبر شمار	آرٹیکل نمبر	ترامیم
		کر سکتا ہے۔
		(۳) اور اگر کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے کہ آیا صدر اس قسم کی کاروائی کرنے کا مجاز تھا یا نہیں تو اس ضمن میں صدر کا فیصلہ آخری ہوگا۔
		(۴) کابینہ وزیرِ اعظم یا کسی بھی وزیر کی طرف سے صدرِ مملکت کو دیئے جانے والے مشورہ کو کسی بھی عدالت یا اتھارٹی کے سامنے زیرِ بحث نہیں لایا جائے گا۔
		(۵) جب صدرِ مملکت قومی اسمبلی کو برطرف کر دے تو:۔
		(ا) دوبارہ انتخابات کرانے کی کوئی تاریخ مقرر کرے جو تاریخ برخاستگی سے سو دن سے زیادہ نہ ہو۔
		(ب) ایک نگران حکومت تشکیل کرے۔
		(٦) اگر کسی وقت صدرِ مملکت اپنی صوابدید پر یا وزیرِ اعظم کے مشورے پر مناسب خیال کرے تو وہ کسی بھی قومی اہمیت کے مسئلے کو قوم کے سامنے ریفرینڈم میں پیش کر سکتا ہے اور اس مسئلے پر قوم صرف "ہاں" یا "ناں" میں جواب دے گی۔

نمبر شمار	آرٹیکل نمبر	ترامیم
		(۷) مجلس شوریٰ ریفرینڈم کا طریقۂ کار طے کرے گی۔
(۵)	۵	اس آرٹیکل کو تبدیل کر دیا گیا اور نئی دفعہ میں کہا گیا ہے کہ مجلس شوریٰ صدرِ مملکت، قومی اسمبلی اور سینیٹ پر مشتمل ہو گی۔
(۶)	۵۶	اس آرٹیکل میں صدرِ مملکت کو مجلس شوریٰ کو پیغام بھیجنے یا خطاب کرنے کا اختیار ہو گا۔
(۷)	۵۸	اس آرٹیکل میں ذیلی دفعہ نمبر ۲ شامل کر دی گئی جس میں کہا گیا ہے کہ صدرِ مملکت کو اختیار حاصل ہو گا کہ وہ جب چاہیں عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے قومی اسمبلی کو برخاست کر دیں۔
(۸)	۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵ اور ۹۶	کو تبدیل کر دیا گیا اور ان کی جگہ حسبِ ذیل دفعات شامل کی گئیں۔
(۹)	۹۰	مملکت کے تمام انتظامی اختیارات صدر کی ذات میں مرتکز ہوں گے۔
(۱۰)	۹۱	(۱) صدر کو مشورہ دینے اور صدر کی اعانت کے لیے وزیرِ اعظم کی سربراہی میں ایک کابینہ تشکیل دی جائے گی۔

تراميم	آرٹیکل نمبر	نمبر شمار
(۲) صدر قومی اسمبلی کے ممبران میں سے کسی بھی شخص کو وزیرِ اعظم مقرر کر سکتے ہیں جس کو ان کے خیال میں اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔ (۳) نامزد وزیرِ اعظم، صدر کے سامنے اپنے عہدے کا حلف اٹھائے گا اور ساٹھ دن کے اندر اکثریت کا اعتماد حاصل کرے گا۔ (۴) کابینہ اور وزرائے مملکت قومی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ (۵) وزیرِ اعظم صدرِ مملکت کی خوشنودی تک اپنے عہدے پر فائز رہے گا لیکن صدر اس کے خلاف اس وقت تک اس دفعہ کے تحت دیئے گئے اختیارات استعمال نہیں کرے گا جب تک اُسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ وزیرِ اعظم کو اکثریت کا اعتماد حاصل نہیں رہا۔ (۶) وزیرِ اعظم اپنے عہدے سے استعفیٰ دے سکتا ہے۔ (۷) کوئی وزیر جو مسلسل چھ ماہ تک قومی اسمبلی کا ممبر نہ رہے۔ وزارت کے عہدے پر برقرار نہیں رہے گا۔ (۸) قومی اسمبلی برخاست ہونے سے کابینہ		

نمبر شمار	آرٹیکل نمبر	ترامیم
		برخاست تصوّر نہیں کی جائے گی۔
(۱۱)	۹۲	(۱) صدر کو مجلسِ شوریٰ کے ممبران میں سے وزراء اور وزرائے مملکت مقرر کرنے کا اختیار ہے۔
		(۲) تمام وزراء صدر کے سامنے اپنے عہدے کا حلف اٹھائیں گے۔
		(۳) تمام وزراء صدر کو اپنے استعفے پیش کر سکتے ہیں۔
(۱۲)	۹۳	صدرِ مملکت، وزیرِ اعظم کے مشورے سے مشیر مقرّر کر سکتا ہے۔
(۱۳)	۹۴	صدر کی درخواست پر وزیرِ اعظم اپنا جانشین مقرّر کرنے تک اپنے عہدے پر برقرار رہے گا۔
(۱۴)	۹۵	(۱) وزیرِ اعظم کے خلاف قومی اسمبلی کے ۲۰ فیصد ارکان کی طرف سے پیش کردہ قراردادِ عدمِ اعتماد منظور کی جا سکتی ہے۔
		(۲) قراردادِ عدمِ اعتماد پیش ہونے کے تین اور سات دن کے درمیان منظور ہو سکتی ہے۔
		(۳) یہ قرارداد مالی مطالبات پر بحث کے دوران منظور نہیں کی جا سکتی۔

نمبر شمار	آرٹیکل نمبر	تراجیم
		(۴) قرارداد منظور ہونے کے بعد وزیرِاعظم اپنے عہدے پر برقرار نہیں رہے گا۔
(۱۵)	۹۹	(۱) مملکت کا تمام کاروبار صدر کے نام پر کیا جائے گا۔ (۲) صدر، صدر والے قوائد مرتّب کرے گا جن کے مطابق تمام دستاویزات صدر کے نام پر مرتّب کی جائیں گی۔ (۳) صدر، مملکت کا نظم و نسق چلانے کے لیے قواعد بنائے گا۔
(۱۶)	۱۰۵	(۱) گورنر آئین کے مطابق کابینہ، وزیرِاعلیٰ، یا وزیر کے مشیروں پر کام کرے گا۔۔ لیکن حسبِ ذیل معاملات میں گورنر، صدر کی پیشگی منظوری سے اپنی صوابدید کے مطابق عمل کرے گا۔ (ا) وزیرِاعلیٰ کا تقرّر (ب) کابینہ کی برطرفی، جب اسے اکثریت کا اعتماد حاصل نہ رہے۔ (ج) صوبائی اسمبلی کی برخاستگی جب عوام کی رائے معلوم کرنا مقصود ہو۔ (۲) کوئی ایسی سفارش جو وزیرِاعلیٰ، کابینہ یا

نمبر شمار	آرٹیکل نمبر	ترامیم
		وزیر کی طرف سے گورنر کو کی گئی ہو، عدالت یا اتھارٹی کے سامنے زیرِ بحث نہیں لائی جائے گی۔
		(۳) جب گورنر، صوبائی اسمبلی برخاست کر دے تو وہ صدر کی منظوری سے نگران حکومت قائم کر سکتا ہے۔
		(۴) صدرِ مملکت یہ اختیارات اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کرے گا۔
(۱۷)	۲۷۰ الف	آئین میں آرٹیکل ۲۷۰ الف کا اضافہ کیا گیا جس میں کہا گیا ہے کہ:-
		(۱) ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کا اعلان، صدر کے تمام احکامات، مارشل لاء ریگولیشن، مارشل لاء آرڈرز اور وہ تمام قوانین جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء اور اس آرٹیکل کے نافذ العمل ہونے کی تاریخ کے درمیان بنائے گئے ہوں، کسی عدالت کے فیصلے کے باوجود اور آئین کی کسی دفعہ کے باوصف جائز تصوّر ہوں گے اور کسی بھی عدالت میں زیرِ بحث نہیں لائے جائیں گے۔
		(۲) وہ تمام احکامات اور ایسی تمام کاروائیاں جو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء اور اس آرٹیکل کے نفاذ

نمبر شمار	آرٹیکل نمبر	ترامیم
		کے دوران کسی بھی شخص نے مارشل لاء احکامات یا اختیارات کے تحت جاری کیے ہوں یا عمل میں لائی ہوں جائز تصوّر ہوں گی اور انھیں کسی بھی عدالت میں زیرِ بحث نہیں لایا جائے گا۔ (۳) صدر کے تمام احکامات اور تمام مارشل لاء ریگولیشنز، آرڈرز، قواعد، جو اس آرٹیکل کے نفاذ کے وقت نافذ العمل تھے اس وقت تک نافذ العمل رہیں گے جب تک کہ بااختیار اتھارٹی ان کو منسوخ نہ کر دے۔ (۴) ذیلی دفعہ میں بیان کی گئی کسی بھی کاروائی کی بنیاد پر کسی عدالت میں کوئی کاروائی نہیں کی جاسکتی۔ (۵) ذیلی دفعات ۱، ۲ اور ۴ میں کی گئی تمام کاروائیاں نیک نیتی پر مبنی تصوّر ہونگی۔ (۶) ذیلی دفعہ ۱ میں بیان کیے گئے صدر کے تمام احکامات میں اسی طرح ترمیم کی جائے گی جیسے آئین میں ترمیم کیجاتی ہے۔
(۱۸)	۲۷۰۔ ب	ہاؤسز آف پارلیمنٹ اینڈ پراونشل اسمبلیز الیکشن آرڈر ۱۹۷۷ء کے تحت کرائے گئے

نمبر شمار	آرٹیکل نمبر	ترامیم
		انتخابات آئین کے مطابق تصوّر ہوں گے۔

مندرجہ بالا آئینی ترامیم سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاء الحق نے نہ صرف مملکت کے تمام اختیارات اپنی ذات میں جمع کر لیے تھے بلکہ آئین میں آرٹیکل نمبر ۲۷۰ الف کا اضافہ کر کے زیادتیوں اور مظالم کو آئینی تحفّظ بھی فراہم کر دیا گیا۔ اس طرح ضیاء الحق نے صدر اور وزیرِ اعظم کے درمیان نام نہاد توازن کا مسئلہ بھی حل کر لیا۔

آئین کا آٹھواں ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۵ء

ضیاء الحق نے محمّد خان جونیجو کو اپنا وزیرِ اعظم نامزد کر دیا۔

اس طرح قومی سطح پر ایک عجیب و غریب تضاد پیدا ہو گیا۔ وہ اس طرح کہ قومی اسمبلی بھی موجود تھی۔ سول حکومت بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ اور مارشل لاء بھی جاری تھا۔ ضیاء الحق نے مارشل لاء کے دوران کی گئی تمام زیادتیوں کو درست اور جائز بنانے کے لیے جونیجو حکومت سے قومی اسمبلی میں آئین کا آٹھواں ترمیمی بل پیش کر دیا جو ۱۸ ستمبر ۱۹۸۵ء کو منظور ہو گیا۔ اوپر بیان کیے گئے آرٹیکل نمبر ۲۷۰ الف کو اس بِل کا حصّہ بنا دیا گیا۔ چونکہ جونیجو حکومت کی کوئی سیاسی اور عوامی بنیاد نہیں تھی اس لیے یہ بالکل واضح اکثریت سے منظور ہو گیا اور ضیاء الحق نے ۱۱ نومبر ۱۹۸۵ء کو اس بِل کی منظوری دے کر پارلیمنٹ سے اپنے تمام سیاہ کارنامے ختم کرا لیے۔ اور انہیں آئینی حیثیت دے کر اپنے جرائم پر پردہ ڈال دیا۔

۲۳ مارچ کو ضیاء الحق نے منتخب صدر اور محمد خان جونیجو نے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے اپنے اپنے عہدوں کا حلف اٹھایا اور اس کے بعد مرکزی اور صوبائی حکومتیں تشکیل دے دی گئیں۔ ۳۰ دسمبر کو صدر ضیاء الحق نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مارشل لاء اٹھانے کا اعلان کیا، اور اس کے

ساتھ ہی سیاسی جماعتیں بھی بحال ہو گئیں۔ بعد ازاں محمد خان جونیجو نے پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم جمہوریت کے سفر کا آغاز کر رہے ہیں اور آئندہ انتخابات قانون کے مطابق منعقد کرائے جاتے رہیں گے۔ دوسرے دن یعنی ۳۱ دسمبر کو وزیرِ اعظم نے اپنا ۵ نکاتی پروگرام قوم کے سامنے پیش کیا اور اعلان کیا کہ یہ پروگرام ۳۱ دسمبر ۱۹۹۰ء تک مکمل ہو گا۔ مگر ضیاء الحق نے جونیجو صاحب کو قبل از وقت ہی وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کر دیا۔ اس طرح وہ خوش فہمی و خود فریبی کی دنیا سے جلد ہی باہر آ گئے۔

ع اے بسے آرزو کہ خاک شدہ

وزیرِ اعظم محمد خان جونیجو کا ۵ نکاتی پروگرام درج ذیل ہے ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں پر ایک مستحکم اسلامی جمہوری سیاسی نظام کا قیام۔

۲۔ منصفانہ بنیادوں پر ایک ایسے اقتصادی نظام کا ارتقا و فروغ جس سے بیروزگاری دور ہو اور عوام کی خوشحالی کو یقینی بنایا جا سکے۔

۳۔ ملک سے ناخواندگی ختم کر کے قوم کو جدید سائنسی دور کے لیے تیار کرنا۔

۴۔ معاشرے سے رشوت، ناانصافی اور دوسری بدعنوانیاں ختم کرنا اور عوام کو احساسِ تحفّظ اور انصاف فراہم کرنا۔

۵۔ مضبوط قومی دفاع، ایک غیر جانبدار اور متوازن خارجہ پالیسی کے ذریعہ ملکی وقار اور سالمیت کا استحکام۔

اس پروگرام کے اعلان کے ساتھ ہی وزیرِ اعظم نے پروگرام پر عملدرآمد کے لیے ایک سو سترہ ارب ۳۵ کروڑ روپے کے فنڈز مختص کرنے کا اعلان کرتے

ہوئے کہا کہ یہ ساری رقم ۱۹۹۰ء سے قبل خرچ کی جائے گی۔

وزیرِ اعظم کے اس پروگرام پر عملدرآمد کے لیے مختلف شعبوں کے ہدف مقرر کیے گئے اور ان اہداف کو حاصل کرنے کے لیے رقوم بھی مختص کی گئیں۔

جونیجو وزارت کا اقتدار

ہر چند کہ اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں جنرل ضیاء الحق، جمہوریت اور انتقالِ اقتدار کی باتیں کرتے رہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے نظریات میں خاطر خواہ تبدیلی کر کے انتقالِ اقتدار کو "اشتراکِ اقتدار" کی اصطلاح میں بدل دیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کو اقتدار میں شریک کر لیا جائے گا۔ لیکن اس شراکت کا دائرہ بھی محض زبانی جمع خرچ تک ہی محدود تھا اور عملی اعتبار سے جونیجو حکومت کی حیثیت ضیاء الحق کے مشیر سے زیادہ کچھ بھی نہ تھی۔ اصل اقتدار اور ریاست کے جملہ اختیارات ضیاء الحق کے پاس ہی تھے۔ محمد خان جونیجو کی تقرری پر سابق وزیر دفاع جناب میر علی احمد تالپور نے نہایت دلچسپ تبصرہ کیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ:

" ہم محمد خان جونیجو کی نئی نوکری پر کیا تبصرہ کریں کیونکہ ان کو ایوان کے باہر لوگوں نے منتخب کیا ہے۔ آپ لوگوں نے چند دن پہلے کا اخبار دیکھا تھا نئے وزیرِ اعظم کا بائیو ڈیٹا شائع ہوا تھا۔ کیا کسی ملک کا وزیر اعظم اتنا گمنام شخص ہوتا ہے کہ اس کے حالاتِ زندگی کو شائع کیا جائے۔ اس قسم کے تماشے ہمارے ملک میں ہی ہوتے ہیں کہ لوگوں کو قبروں سے اٹھا کر وزیر اعظم بنایا جاتا ہے۔ ہمارے صاحب بہادر ضیاء الحق کی یہ سب مہربانی ہے کہ آج محمد خان جونیجو وزیر اعظم ہے۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ جونیجو صاحب کو وزارتِ عظمیٰ مرحوم کی قبر کا مجاور

بنایا گیا تھا کیونکہ وزارتِ عظمٰے ہمیشہ اختیارات سے عبارت ہوتی ہے۔ جو محمد خان جونیجو کے پاس نہیں تھے۔ اس لیے آپ مرحومہ کی قبر کے گرد بیٹھ کر اپنی ذات کا تشخص کراتے رہتے تھے۔ لیکن ضیاء الحق کو یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اس لیے انہوں نے اس قبر کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ ان حالات کو اس شعر میں انتہائی خوبصورتی سے سمویا ہوا نظر آتا ہے:۔

بگولے اسی لیے منڈلا رہے ہیں میرے مدفن پر
کہ یہ دھبہ بھی کیوں باقی رہے صحرا کے دامن پر

بالآخر جنرل ضیاء الحق نے ۲۹ مئی کی شام کو محمد خان جونیجو کی وزارت کے ساتھ ہی ساتھ قومی اسمبلی کو بھی برخاست کر دیا۔ اور اس کے فوراً بعد صوبائی وزارتوں اور صوبائی اسمبلیوں کو بھی برطرف کر کے نگران وزارتیں قائم کر دیں۔ ملک کے چاروں صوبوں میں نگراں وزرائے اعلیٰ تو بیشک مقرر کر دیئے گئے۔ مگر مرکز میں وزارتِ عظمٰے کے منصب کو خالی چھوڑ دیا گیا۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کی شام کو جنرل ضیاء الحق نے ایوانِ صدر میں ایک ہنگامی پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جونیجو وزارت اور قومی اسمبلی کو برخاست کرنے کا اعلان کیا۔ موصوف نے فرمایا کہ:۔

"جن اغراض و مقاصد کے تحت قومی اسمبلی منتخب ہوئی تھی وہ پورے نہیں ہوئے۔ ملک میں امن و امان کی صورتحال اس حد تک گھمبیر ہو گئی ہے کہ جس کے نتیجے میں ان گنت گرانقدر قیمتی جانوں کا المناک اتلاف اور املاک کا نقصان ہوا ہے۔ پاکستان کے شہریوں کی جان و مال، عزت و سلامتی قطعی غیر محفوظ ہو گئی ہے۔ نظریۂ پاکستان اور اس کی یکجہتی کو سنگین خطرہ لاحق ہو گیا ہے اور جہاں عوام کی اخلاقی حالت انتہائی حد تک دگرگوں ہو گئی ہے کہ وفاق

کی حکومت آئین میں دی گئی دفعات کے مطابق کام نہیں کرسکتی اس لیئے صدر جنرل محمد ضیاءالحق صدر پاکستان نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کے آرٹیکل نمبر ۵۸ کی شق ۲ (بی) میں دیئے گئے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے فوری طور پر قومی اسمبلی توڑ دی ہے جس کے ساتھ وفاقی کابینہ بھی توڑ دی گئی ہے۔ قومی اسمبلی چادر اور چار دیواری کا تقدس برقرار رکھنے میں ناکام ہو گئی تھی، ملک میں امن وامان کی صورتحال گھمبیر ہو گئی تھی۔ ضیاءالحق نے اس ضمن میں مزید کہا کہ نفاذِ اسلام کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی حتیٰ کہ مارشل لاء اٹھنے کے بعد جمہوریت کی جانب بھی خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔ عوام کی جان ومال، عزت وآبرو محفوظ نہیں رہی۔ ملک کی سلامتی ویکجہتی خطرے میں پڑ گئی ہے۔ ملک کی صورتحال کو بچانے کے لیے انہوں نے آئین میں دیئے گئے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے قومی اسمبلی اور وفاقی کابینہ کو توڑنے کا اقدام کیا۔ ملک میں امن وامان کی صورتحال اتنی تشویشناک حد تک بگڑ چکی ہے جس کے نتیجے میں کئی قیمتی جانوں کا اتلاف ہوا۔ عام اخلاقی معیار بھی بدترین حد تک بگڑ چکا ہے۔ صورتحال ایسی ہو چکی تھی کہ اس میں وفاقی حکومت کا نظام، دستور کے مطابق نہیں چل سکتا تھا۔ میں خود بھی سویلین صدر ہوں۔ آئین بدستور برقرار ہے یہ اقدامات آئین کے مطابق کیے گئے ہیں اور جمہوری عمل کا حصہ ہیں۔ میں نے ملک میں بگڑتی ہوئی صورتحال کی جانب کئی بار وزیرِاعظم کی توجہ مبذول کرائی لیکن وزیرِاعظم نے کہا کہ چونکہ غیر جماعتی انتخابات کے بعد انہوں نے ایک سیاسی جماعت بنائی ہے اس لیے ان کی کئی مجبوریاں ہیں۔ میں نے کئی بار اس صورتحال پر وزیرِاعظم سے بات کی لیکن وزیرِاعظم نے کہا کہ وہ بعض کام ارکانِ اسمبلی کو خوش کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ اس طرح انتخابات کا اصل مقصد پورا نہ ہو سکا۔ انتخابات کے اغراض ومقاصد

بھی پورے نہ ہو سکے۔ ریفرنڈم نفاذِ اسلام کے عمل کو تیز کرنے کے لیے منعقد کرایا تھا۔ میں ایسا کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس وعدے کو پورا کر سکتا۔ میں چاہتا تھا کہ سویلین حکومت کامیاب ہو لیکن قومی اسمبلی اور کابینہ قوم کی توقعات پر پوری نہیں اتری۔ اب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ نفاذِ اسلام کا عمل تیز کر دیا جائے گا۔ انصاف قائم کر دیا جائے گا چادر اور چار دیواری کے تقدس کو یقینی بنایا جائے گا۔ میں کل قوم سے خطاب کے دوران قومی اسمبلی توڑنے کے فیصلے کے بارے میں تفصیلی روشنی ڈالوں گا۔ اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے مزید اقدامات کا اعلان کروں گا۔"

جونیجو وزارت کی برخاستگی پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے لیکن ہماری نظر میں اس مسئلے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ ایک آمر صدر جنرل ضیاء الحق نے ایک کابینہ کو بھرتی کیا اور پھر جب اس کا دل بھر گیا تو اس نے انھیں کان سے پکڑ کر نکال باہر کیا اور یوں یہ مسئلہ ختم ہو گیا اس سلسلے میں اس سے زیادہ اور کچھ کہنا وقت کا ضیاں ہی ہو گا۔

۱۹۷۷ء کے عام انتخابات کا پس منظر

جناب ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ ۱۹۷۶ء میں امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر نے جناب بھٹو کو دھمکی دی تھی کہ وہ بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیں گے اور ان کی ذات کو ایک خوفناک مثال بنا دیں گے۔ دوسرا یہ کہ بھٹو صاحب متحدہ پاکستان میں منعقد ہونے والے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نتیجے میں برسرِ اقتدار آئے تھے۔ یہ دو ایسے بنیادی محرکات تھے کہ جن کے باعث جناب بھٹو نے قوم سے اعتماد کا ووٹ لینا ضروری خیال کیا۔ لہٰذا آپ نے ۱۹۷۷ء میں عام انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کر دیا۔ یہ انتخابات

۳ جون ۱۹۷۷ء پرائم منسٹر ہاؤس میں حکومت اور قومی اتحاد کے لیڈروں کے درمیان مذاکرات کا ایک منظر۔ قومی اتحاد کی طرف سے پروفیسر عبدالغفور
مفتی محمود، نوابزادہ نصر اللہ خان، حکومت کی طرف سے مولانا کوثر نیازی، ذوالفقار علی بھٹو (وزیراعظم) اور عبدالحفیظ پیرزادہ۔

وقتِ مقرّرہ سے ڈیڑھ سال پہلے ہی کرا دیئے گئے تھے۔ جبکہ جناب بھٹوؔ کو یہ اختیارِ حکمرانی آئین کی رُو سے حاصل تھا کہ وہ مزید ڈیڑھ سال تک حکومت کرتے رہتے۔

جناب بھٹوؔ کا مقابلہ کرنے کے لیے جزبِ اختلاف کی نو جماعتوں نے پاکستان قومی اتحاد کے نام سے ایک متحدّہ محاذ قائم کر لیا۔ اسی قومی اتحادؔ میں تین مذہبی جماعتیں یعنی مولانا مودودی کی جماعت اسلامی، مولانا مفتی محمود کی جمعیّت عُلمائے اسلام اور مولانا شاہ احمد نورانی کی جمعیّت العلمائے پاکستان بھی شامل تھیں۔ ان انتخابات میں قومی اتحاد کو شکست سے بُری طرح دوچار ہونا پڑا۔ چونکہ یہ انتخابی نتائج امریکی وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر کے دعوے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ امریکی پشت پناہی پر قومی اتحاد نے بھٹوؔ حکومت کے خلاف دھاندلی کے الزام میں تحریک چلادی۔ ابتدًا تحریک کا زور انتخابی دھاندلیوں اور نئے انتخابات کے انعقاد پر ہی مرکوز رہا لیکن قومی اتحادؔ نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ تحریک کو محض منفی بنیادوں پر طویل عرصے کے لیے جاری نہیں رکھا جا سکتا لہٰذا اتحادؔ نے بھٹوؔ حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے تحریک میں ایک نیا عنصر نظامِ مصطفٰےؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شامل کر دیا۔ قومی اتحادؔ نے تحریک میں یہ نکتہ شامل کر دیا کہ وہ ملک میں نظامِ مصطفٰےؐ[۱] نافذ کرنا چاہتا ہے۔

گویا انتخابی دھاندلی کا الزام تو تحریک سے الگ کر دیا گیا اور اس کی جگہ نظامِ مصطفٰےؐ کے نفاذ کا مسئلہ کھڑا کر لیا گیا۔ چونکہ نظامِ مصطفٰےؐ کا تعلق قوم کے مذہبی عقائد سے تھا اس لیے قوم نے جذباتی انداز میں قومی اتحاد کا ساتھ دیا اور بھٹوؔ صاحب کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔

---

(۱) نظامِ مصطفٰےؐ کی پُرفریب حقیقت | اسلام کی سیاسی تاریخ

میں نظامِ مصطفےٰؐ کی اصطلاح پہلی دفعہ ۱۹۷۷ء کے وسط میں پاکستان کی سرزمین پر ہی سُنی گئی تھی۔ ۱۱ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ اس تحریک کا مفہوم کیا تھا۔؟ قومی اتحاد میں تین مذہبی جماعتیں شامل تھیں لیکن آج تک ان میں سے کسی ایک جماعت نے بھی قوم کے سامنے نظامِ مصطفےٰؐ کی وضاحت کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی۔ چنانچہ ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ہمارے علماء نے یہ نعرہ محض قوم کے مذہبی جذبات سے کھیل کر اپنے مذموم سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے ہی بلند کیا تھا۔ اس طرح علماء کا یہ اقدام بد دیانتی پر مبنی اور قابلِ نفرت تھا اور یہی وجہ ہے کہ قوم نے ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں مذہبی جماعتوں کو یکسر مسترد کر کے ملّاؤں کے خلاف اپنی شدید نفرت کا اظہار کر دیا ہے۔ شاعرِ مشرق علاّمہ اقبال نے علماء کے خلاف یہ بالکل ہی درست فتویٰ دیا تھا کہ :۔

ص قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا جانیں بے چارے دو رکعت کے امام

سوویت یونین کے قائد جناب نکیتا خروشیف نے وفاقی جرمنی کے چانسلر مسٹر ایڈنائر کے متعلق کچھ اس طرح کہا تھا کہ :۔

"آپ کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی کے قائد ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک مذہبی آدمی ہیں آپ کے لیے بہتر تو یہ تھا کہ آپ کسی گرجا گھر میں بیٹھ کر عبادت کرتے اور اپنی عاقبت سنوارتے۔ مگر اسی عیسائی کے ایک ہاتھ میں بائیبل ہے اور وہ دوسرے ہاتھ میں ایٹم بم دیکھنا چاہتا ہے۔"

یہی حال ہمارے علمائے کرام کا بھی ہے۔ ان کے لیے مناسب یہی تھا کہ یہ حضرات دین کی تبلیغ کے ذریعے قوم کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا فریضہ انجام

دیتے اور اس طرح اپنی عاقبت سنوارتے، لیکن یہ لوگ محراب و منبر کے علاوہ جُبّہ و عمامہ سمیت سیاسی مسندِ اقتدار پر بھی قابض ہونے کے حسین اور سنہرے خواب دیکھنے رہے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ سیاست کی خار دار وادی سے گزرنا ان کے لبس کی بات ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ان حضرات کی بقاء کا انحصار محض مذہبی عصبیت پر ہی ہے۔ جبکہ سیاست رواداری، برداشت اور صبر و تحمل کی متقاضی ہوتی ہے۔ قومی اتحادؔ میں شامل مذہبی جماعتوں کے فکر و عمل کو سمجھنے کے لیے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن سے یہ اندازہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کہ اگر کسی وقت خدانخواستہ سیاسی اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں آگیا تو یہ قوم کا کیا حشر کریں گے۔ اس کا اندازہ درج ذیل ایک واقعہ سے ہی بآسانی لگایا جاسکتا ہے :۔

قومی اتحادؔ کے صدر مولانا مفتی محمود نے حیدر آباد پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

(۲) مفتی محمود کا مودودی کے بارے میں فتویٰ کُفر

"مودودی صاحب کو فتویٰ دینے کا حق حاصل نہیں۔ فتویٰ دینے کا حق مجھے ہے۔ میں اب تک پندرہ ہزار فتوے دے چکا ہوں جو مجلّد کتابوں میں موجود ہیں۔ میں آج اس پریس کانفرنس میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی گمراہ، کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اس سے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔ اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ذلالت ہے۔ وہ امریکہ اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے اب وہ موت کے آخری کنارے پر پہنچ چکا ہے اور اب اُسے کوئی طاقت نہیں بچاسکتی۔ اس کا جنازہ نکل کر رہے گا۔"

روزنامہ مساوات مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۷۷ء کی حسبِ ذیل خبر قابلِ ملاحظہ ہے۔

(۳) فرقہ بندی اور افطاری

اس کے علاوہ ایک اور قابلِ افسوس مثال یہ ہے کہ " ۲۵ اگست ۱۹۷۷ء کی شام متحدہ محاذ (قومی اتحاد) کے بڑے بڑے لیڈر جب افطاری کرنے لگے تو اسلامی اخوت اور نظامِ اسلام کے قیام کے دعویداروں کے درمیان ایک عجیب اور افسوسناک منظر دیکھنے میں آیا کہ یہ لیڈر جب افطاری کر چکے تو نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن لوگ وہاں یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مفتی محمود صاحب اور جناب نوابزادہ نصر اللہ خان دس بارہ آدمیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑے اور ان نمازیوں کی امامت مفتی محمود صاحب نے کی۔ جبکہ مولانا نورانی صاحب اور میاں طفیل محمد دوسری طرف کھڑے ہو گئے۔ یہاں مولانا شاہ احمد نورانی نے جماعت کرائی اور تحریکِ استقلال کے میاں محمود علی قصوری نے بھی نورانی صاحب کے ساتھ نماز پڑھی۔"

(۴) نورانی میاں کی وسعت قلبی

مولانا شاہ احمد نورانی پاکستان کی سیاسی جماعت، جمعیت العلمائے پاکستان کے علاوہ ورلڈ اسلامک مشن کے چیئرمین بھی ہیں اور ہر سال دنیا کے مختلف ممالک کے تبلیغی دورے بھی فرماتے رہتے ہیں آپ کی وسعتِ قلبی کا اندازہ آپ کے حسبِ ذیل بیان سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ جو ہفت روزہ "ایشیا" کی ۱۵ جنوری ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں شامل ہوا تھا۔

" ابھی حال ہی کا ذکر ہے کہ میں (شاہ احمد نورانی) اور مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا غلام علی اوکاڑوی اور مولانا سید حسین الدین شاہ صاحب،

یہ ابھی تین چار روز پہلے ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۷ء جمعرات کا ذکر ہے کہ ہم سب جنرل ضیاءالحق سے ملاقات کے لیے گئے۔ تاکہ دارالعلوم اور ایک مسجد کا سنگِ بنیاد ان سے رکھوایا جائے۔ تو جب ان سے باتیں ہو رہی تھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ:۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ بڑے وسیع القلب ہیں۔

(۵) علمائے کرام اور جنرل ضیاء کی خوش فہمی

آپ میں بڑی رواداری ہے آپ میں بڑی فراخدلی ہے اور پھر فرمانے لگے کہ اسی فراخدلی کا نتیجہ ہے کہ جب آپ سہالہ میں تھے (مارشل لاء لگنے کے فوراً بعد) قید کے ان لمحات میں رواداری اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک صاحب کے پیچھے نماز پڑھی، مجھے یہ رپورٹ ملی ہے، میں سُنتا رہا۔ جب اُن کی بات ختم ہوگئی تو میں نے جواباً عرض کیا۔ جنرل صاحب ! بڑا افسوس ہے کہ آپ کو غلط اطلاعات دی گئی ہیں۔ ہم میں الحمد اللہ بڑی وسعت قلبی ہے لیکن گستاخ رسولؐ کے لیے کوئی وسعت نہیں۔ ہم میں رواداری ہے لیکن حضور پُرنورؐ کی شان میں تنقیص کرنے والے کے لیے کوئی رواداری نہیں۔ اعلیٰ حضرت امام اہلسنت مولانا احمد رضا خان کا لکھا ہوا مجموعہ فتاویٰ حسام الحرمین کے نام سے مشہور ہے جس میں علماء حرمین شریفین کے فتوے موجود ہیں اور مسلک اعلیٰ حضرت کی تصدیق ہے۔ ہم الحمد اللہ اس فتوے پر عمل کرتے ہیں کوئی بھی شخص خواہ ڈیرہ اسماعیل خان کا ہو، ملتان کا ہو، اچھرہ کا ہو۔ کسی شاتم رسولؐ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور میں نے کہا جنابِ والا یہ چار ٹکے کے لوگ ہیں ان کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ کو یہ غلط اطلاع ملی ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ ہمارے میں ایسی رواداری، فراخدلی، اور وسعت قلبی نہیں ہے۔ ہمارے قلبِ میں شاتم رسولؐ کے لیے کوئی وسعت

نہ آج ہے نہ آئندہ ہوگی اور اس کے لیے لوگ بہت سی باتیں کرتے ہونگے۔ قومی اسمبلی میں ہی اذان ہوتی تھی۔ علامہ ازہری موجود ہیں۔ ان لوگوں کا رُخ ایک طرف ہوتا تھا اور ہمارا رُخ ان سے دوسری طرف۔ اس کے دیکھنے والے ایک نہیں، دو نہیں، بے شمار لوگ ہیں۔"

مندرجہ بالا سطور کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمارے علمائے کرام ایک دوسرے کے لیے کس قدر احترام اور رواداری کے جذبات رکھتے ہیں اور انہی عظیم خیالات و جذبات کے باعث وہ دین اور قوم کی خدمت و رہنمائی کا فریضہ کس طرح بہتر طور پر انجام دیتے رہے ہیں یا مستقبل میں ایسا کر سکتے ہیں۔

(۶) بابائے قوم حضرت قائدِ اعظمؒ اور علماء

۱۹۳۸ء میں ایک تبلیغی وفد نے حضرت قائدِ اعظمؒ سے ملاقات کی اور آپ سے دریافت کیا کہ آپ مسلم لیگ کے جلسوں کے لیے اس قدر وسیع و عریض پنڈال کھڑے کرتے ہیں لاکھوں کی تعداد میں لوگ جمع کرتے ہیں اس سے آپ کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے فرمایا کہ:۔

"علاوہ دیگر امور کے اس سے غیر مسلموں کے دل پر ملتِ اسلامیہ کے اتحاد اور ہیئت اجتماعیہ کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔"

اس پر علماء نے قائدِ اعظم سے کہا کہ اس کے لیے ہم آپ کو اس سے زیادہ مؤثر طریقہ بتاتے ہیں کہ آپ نماز کے وقت اس پنڈال میں باجماعت نماز ادا کرنے کا اہتمام کیا کریں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ:۔

"نماز کی اہمیت سے مجھے انکار نہیں لیکن آپ کی تجویز میں مجھے ایک خطرہ

نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ نماز باجماعت میں ایک امام کا ہونا ضروری ہے اگر
میں خود امامت کے لیے کھڑا ہو جاؤں شاید تمام حاضرین میرے پیچھے نماز
پڑھ لیں لیکن میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد یہ سوال
پیدا ہوگا کہ امام کسے بنایا جائے۔ اگر امام دیوبندی کا ہوگا تو بریلوی حضرات
اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے اور یہی صورتحال دیوبندی کے
بجائے دوسرے امام کے پیچھے پڑھنے میں پیدا ہوگی۔ لہٰذا اس صورتحال میں
یہ ہوگا کہ ایک پنڈال میں مختلف جماعتیں کھڑی ہو جائیں گی اور وہ کہیں گے
کہ جو قوم ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتی وہ ایک متفقہ علیہ اسلامی
ریاست کیسے قائم کرے گی۔ اس وقت تو آپ مجھے معاف فرمائیں آئندہ
دیکھا جائے گا"۔ (بحوالہ تعمیر پاکستان اور علماء")

"یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ علمائے کرام کی اسلامی نظام حکومت کے قیام
کی ساری تگ ودو تقسیم ملک کے بعد صرف پاکستان کے حصے میں ہی آئی
ہے ورنہ ۱۹۴۷ء سے قبل اس قسم کی کوئی مثال برصغیر پاک و ہند بلکہ دنیا کے
کسی بھی مسلمان ملک میں نہیں ملتی۔ ہندوستان پر مسلمانوں نے صدیوں تک
حکومت کی لیکن کسی بھی مسلمان بادشاہ نے ہندوستان میں اسلامی شریعت
نافذ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مسلمانوں کے کئی خاندان ہندوستان
پر حکمران رہے اور ہر خاندان کی حکومت نسلی بادشاہت سے قائم ہوئی
تھی۔ جبکہ ہر بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا۔ وہ اپنی مرضی اور اپنے امراء کے
مشورے سے حکومت کرتا تھا۔ اس عرصے میں کسی بھی عالم دین نے اسلامی
شریعت نافذ کرنے کا کبھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ نیز انگریزی عہد حکومت
میں بھی علمائے کرام نے اسلامی حکومت کے قیام کی کبھی کوشش نہیں کی۔

بلکہ اس کے برعکس علمائے کرام نے متحدہ قومیّت ہی کا نعرہ بلند کیا اور قیام پاکستان کی ڈٹ کر مخالفت کی جبکہ قیام پاکستان سے قبل ہندوستان میں مسلمانوں کی حسبِ ذیل مذہبی جماعتیں سرگرمِ عمل تھیں۔

(۱) جمعیت علمائے اسلام۔

(۲) تحریکِ احرار۔

(۳) خاکسار تحریک اور

(۴) جماعت اسلامی جس کے قائد مولانا مودودی تھے۔

جمعیت علمائے اسلام ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی اور فعال مذہبی و سیاسی تنظیم تھی۔ اس جماعت کا مرکز دارالعلوم دیوبند میں تھا۔ اس جماعت کے قیام کا پس منظر یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شکست کھانے کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا معاشرتی شیرازہ بکھر گیا۔ چونکہ انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے چھین لی تھی۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو اپنا سیاسی حریف سمجھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں کو ہر طرح سے ملیامیٹ کرنے کی پوری کوشش کی جبکہ ہندوؤں نے غلام قوم ہونے کی وجہ سے فی الفور انگریز کی غلامی کو صدقِ دل سے قبول کر لیا۔ اسی ابتلا کے دور میں ہندوستان کے مسلمان دو حصّوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک حصّے کی قیادت سر سیّد احمد خان نے سنبھال لی۔ جبکہ دوسرے حصّے کی رہنمائی کی ذمّہ داری مولانا محمد قاسم نانوتوی کے کاندھوں پر ڈالی گئی۔ سر سیّد کا نقطۂ نظر انگریزی حکومت سے بھرپور تعاون کے حق میں تھا۔ جبکہ علماء کا طبقہ انگریزوں سے عدم تعاون کا حامی اور ان کے خلاف بھرپور جنگ کا دعویدار تھا۔ ان دو طبقوں کے درمیان سوچ کا یہ بنیادی فرق آج بھی موجود ہے۔ سر سیّد نے

انگریزی تعلیم کے حوالے سے جدید اور ترقّی پسند معاشرت اختیار کرنے کی وکالت کی اور اپنے نظریات کے عملی اظہار کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی. جبکہ بنیاد پرست گروہ نے قدامت پسندی سے سرِ مُو انحراف کرنا بھی گوارا نہ کیا اور اپنے نظریات اور تعلیمات کی اشاعت کے لیے دیو بند میں اسلامی علوم کا ایک بہت بڑا دار العلوم قائم کیا جو آج تک اسلامی تعلیمات کا مرکز ہے. یہ دونوں مکاتبِ فکر متوازی شکل میں آگے بڑھتے رہے اور یہ سفر ہنوز جاری ہے. لیکن آج تک ان دونوں کے درمیان اشتراک و تعاون کا کوئی عنصر جنم نہ لے سکا۔

ہندوستان میں جب تحریکِ آزادی کا آغاز ہوا تو ان دونوں فرقوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر اپنے اپنے طور پر حصّہ لیا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس طبقے نے مسلم قومیت کا تصوّر پیش کیا تھا اس کی نشو و نما انگریزی ماحول اور انگریزی تعلیمات کے زیرِ اثر ہوئی تھی۔ اسی طبقے نے مسلم قوم کے لیے ایک علیحدہ وطن کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ اس کے بر عکس علماء کا طبقہ ہندوستانی قومیت کا علمبردار تھا اور اس نے تقسیمِ وطن اور قیامِ پاکستان کی سخت مخالفت کی تھی۔ نیز مسلم لیگ کے قائد جناب محمد علی جناح ؒ کے خلاف کفر کے فتوے تک جاری کر دیئے تھے۔ مولانا مظہر علی اظہر کا یہ شعر آج بھی ہماری ادبیات کا حصّہ ہے۔

ع اِک کافرہ عورت کے لیے دین کو چھوڑا
یہ قائدِ اعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم

لیکن انگریزی تعلیم یافتہ طبقے نے اختلافات کا اظہار ہمیشہ شرافت اور شائستگی کے ساتھ کیا اور گالم گلوچ سے کلیتاً پرہیز ہی کیا ہے۔ جب

مولانا حسین احمد مدنی نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں اسی لیے ہندوستان میں رہنے والے تمام ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں تو اس پر علامہ اقبال نے احتجاج کرتے ہوئے نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں فرمایا تھا کہ :۔

ع عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجمی است
سرود برسرِ منبر کہ ملّت است، وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است
بہ مصطفٰےؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

پاکستان میں مذہب کی بنیادوں پر قائم ہونے والی جماعتوں میں سے مولانا مفتی محمود کی جمیعت العلمائے اسلام، ہندوستان کی جمیعت العمائے ہند کی جانشین ہے۔ جبکہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی تحریکِ احرار دیوبندی عقائد کی مبلّغ تھی۔ علاّمہ عنایت اللہ مشرقی خاکسار تحریک کے بانی اور جماعتِ اسلامی کے بانی مولانا مودودی کسی جماعت کے مقلّد نہیں تھے۔ جبکہ مولانا شاہ احمد نورانی کی جمیعت علمائے پاکستان، مولانا احمد رضا خان بریلوی کی پیروکار ہے۔ ان جماعتوں کے سیاسی کردار کا مختصر تعارف درج ذیل پیش کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے :۔

(ا) جمعیت العلمائے ہند ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں اس جماعت نے نہایت اہم اور غیر معمولی کردار ادا کیا ہے یہ جماعت متحدہ ہندوستان کی حامی تھی اور ہندوستان میں

سب سے پہلے مکمل آزادی کی قرارداد اسی جماعت نے پاس کی تھی لیکن اس کے باوجود ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام یا نفاذِ شریعت اس جماعت کے مقاصد میں شامل نہیں تھا۔ یہ جماعت ہندوستان میں مخلوط حکومت قائم کرنے کی دعویدار بھی تھی تاہم اس جماعت نے ریشمی رومال تحریک کے عنوان سے ایک ایسی تحریک چلائی جس کی مثال ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا کی تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ یہ تحریک بیشک ناکام ہوئی اس لیے کہ بغاوت کے منصوبے کا قبل از وقت انکشاف ہو گیا تھا۔ جس کے تحت تمام قائدین کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح داخلی بغاوت اور بیرونی حملے کا منصوبہ ناکام ہو گیا لیکن اس کے باوجود اس تحریک نے جو مقاصد حاصل کیے وہ اسلام کے سیاسی نظام میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ان مقاصد کی تفصیل درج ذیل ہے :۔

(۱) اندرونِ ملک ہندو مسلم اتحاد کرایا گیا اور دونوں قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے آمادۂ بغاوت کیا گیا۔

(۲) قدیم تعلیمیافتہ طبقہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ گریجویٹ کو یکجا کر کے آمادۂ پیکار کیا گیا۔

(۳) بین الاقوامی دنیا کو یعنی جاپان، چین، برما، انڈونیشیا، فرانس اور امریکہ کو اپنا ہمنوا بنا لیا گیا۔

(۴) دشمن پر حملہ کرنے کے لیے نقشۂ جنگ تیار کیا اور انگریزی سی، آئی، ڈی اور فوجوں میں اپنے جوان بھیجے گئے۔

(۵) انقلاب کے بعد کے لیے عبوری حکومت کا خاکہ مرتب کیا گیا، جس میں ہندو مسلم دونوں کو مساوی حقوق دیئے گئے۔

(۱۱) اندرون ملک خفیہ مراکز قائم کیے گئے جہاں بغاوت کے لیے نوجوان طاقت کو تیار کیا گیا۔

(۱۲) بیرونِ ملک یعنی کابل، انقرہ، استنبول، قسطنطنیہ اور برلن میں رضاکاروں کی بھرتی کے مراکز کھولے گئے۔

(۱۳) ترکی حکومت کا معاون جرمنی کو بنایا گیا اور روس کو مددگار بنانے کی کوشش کی گئی۔

(۱۴) حملے کے لیے قلات، کوئٹہ، درّہ خیبر اور اوگی مقرر کیے گئے اور افغان حکومت سے راستے کی اجازت لی گئی۔

(۱۵) حملہ و بغاوت کے لیے ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء کی تاریخ حضرت شیخ الہند انور پاشا و جمال پاشا کے مشورے سے مقرر کی گئی۔

یہ کاروائی فی الواقع بڑی محیّر العقول تھی کوئی شخص یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ ۱۹۰۵ء میں جب کہ انگریزی حکومت کے علاقۂ اقتدار میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا کسی دارالعلوم کے اساتذہ اس حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے اندرونی اور بیرونی سطح پر ایک عالمگیر بغاوت کا منصوبہ تیار کریں گے لیکن یہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے انکار کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ یہ منصوبہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے ذہن رسا کی تخلیق تھا اور اس منصوبے کی کامیابی کے لیے مولانا کو تمام ہندو قائدین جن میں مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لجپت رائے، ڈاکٹر راجندر پرشاد وغیرہ شامل تھے۔ نیز تمام نیشلسٹ مسلم قائدین جن میں ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور علی برادران قابلِ ذکر ہیں کی تائید اور حمایت حاصل تھی۔ بیرونِ ملک ترکی اور افغانستان اسی جماعت کے اتحادی تھے۔ مولانا محمود الحسن اسی انقلابی جماعت کے بانی تھے۔ پہلے اسی

جماعت کا نام ثمرۃ التربیۃ اور مرکز دیوبند رکھا گیا لیکن بعد میں اس جماعت کا نام تبدیل کر کے جمعیت الانصار رکھ دیا گیا اور اس کا مرکز دیوبند سے دہلی تبدیل کر دیا گیا۔ اس جماعت کا نصب العین ہندوستان کو بزورِ قوّت آزاد کرا کر ملک میں ایک مخلوط و جمہوری حکومت کا قیام تھا۔

(ا) عبوری حکومت کی تشکیل

انقلابی جماعت نے ایک اعلیٰ اختیارات کی مرکزی کونسل تشکیل دی۔ جس میں ایک مسلم اور دو ہندو ارکان شامل تھے۔ مسلم رکن حضرت مولانا محمود الحسن تھے جبکہ ایک ہندو رکن مہاتما گاندھی تھے جبکہ دوسرے رکن کا نام ظاہر نہیں ہو سکا۔ اس کونسل کے ماتحت ایک حکومت تھی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاب اور وزیرِ اعظم مولانا برکت اللہ جبکہ وزیرِ خارجہ مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔ بغاوت کا اصل مرکز مولانا عبید اللہ سندھی کی نگرانی میں قائم تھا۔ پروگرام کے مطابق ۱۹ فروری ۱۹۱۵ء کو ترک فوجوں نے افغانستان کے راستے ہندوستان پر حملہ کرنا تھا اور اندرونِ ملک مختلف مراکز سے عوام نے بغاوت کا آغاز کرنا تھا۔ اس سارے منصوبے کی تفصیلات ایک ریشمی رومال پر ظاہر کی گئی تھیں۔ یہ تمام تفصیلات مولانا محمود الحسن نے مدینہ منورہ میں ترکی کے قائدین انور پاشا اور جمال پاشا کے ساتھ مل کر طے کی تھیں۔ مولانا محمود الحسن نے ان تفصیلات کی دستاویز تیار کر کے امیرِ کابل حبیب اللہ خان اور اس کے لڑکوں کے دستخط کرانے کے لیے کابل بھیج دی۔ مولانا سندھی نے دستخط کرانے کے بعد اصل منصوبہ ایک ریشمی رومال پر منتقل کر دیا۔

(اا) ریشمی رومال کی تحریک

اس رومال کا رنگ زرد تھا اور اس کی لمبائی اور چوڑائی ایک گز تھی مولانا سندھی

نے یہ رومال کابل سے اپنے ایک معتمد کارکن شیخ عبدالحق کے ذریعے سندھ کے شیخ عبدالرحیم کے پاس بھجوادیا اور ہدایت کی کہ اصل رومال مولانا ہادی حسن کے ذریعے شیخ الہند کے پاس مدینہ منورہ بھیج دیا جائے۔ لیکن فوج نے شیخ عبدالرحیم کے گھر پر چھاپہ مار کر یہ رومال برآمد کرلیا اور اس طرح تحریک کا راز فاش ہوگیا۔ تمام قائدین گرفتار کرلیے گئے۔ مولانا سندھی اور ان کے ساتھیوں کو امیرِ کابل حبیب اللہ نے انگریزوں کے کہنے پر گرفتار کرلیا۔ ان لوگوں نے اندر ہی اندر تحریک چلا کر امیر حبیب اللہ خان کو قتل کرا دیا اور اس کے لڑکے امان اللہ خان کو افغانستان کا امیر بنا دیا۔ امان اللہ خان نے تمام اسیروں کو رہا کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستان پر حملہ کر کے کوہاٹ تک کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اس وقت جنگِ عظیم ختم ہوچکی تھی۔ لیکن انگریز نے افغانستان کے خلاف جنگ کرنے کے بجائے صلح جوئی کا راستہ اختیار کیا۔ افغانستان کی آزادی اور خود مختاری کو تسلیم کر کے امان اللہ خان کو امیرِ افغانستان سے ترقی دے کر افغانستان کا بادشاہ بنا دیا گیا۔

(۲) جماعت اسلامی قیامِ پاکستان کے بعد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے جماعت اسلامی کے نام سے ایک باقاعدہ سیاسی جماعت قائم کرلی۔ لیکن تقسیمِ ہند سے قبل مولانا ایک سیاسی مدبر اور مذہبی قائد کی حیثیت سے اپنے سیاسی نظریات اور مذہبی عقائد کی باقاعدہ تبلیغ کرتے رہے ہیں۔ جہاں تک آپ کے مذہبی عقائد کا تعلق ہے تو ان کو پاکستانی عوام اور تمام مذہبی جماعتیں یکسر مسترد کرچکی ہیں۔ آپ کے سیاسی نظریات، حالات اور واقعات کی پیداوار ہیں ان کی کوئی ٹھوس یا اصولی بنیاد نہیں ہے۔ اس لیے قابلِ اعتبار نہیں۔ قیامِ پاکستان سے پہلے آپ مجددِ اسلام

کاروپ دھار کر ہندوستان کے مسلمانوں اور مسلم لیگی قیادت کو ہدف تنقید بنا کر قیامِ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے ہیں لیکن پاکستان بن جانے کے بعد آپ ہندوستان میں اپنی ساری تبلیغی سرگرمیاں منسوخ کر کے پاکستان آ گئے اور یہاں آ کر قیامِ پاکستان اور اسلامی حکومت کے سب سے بڑے داعی بن گئے۔ اس ضمن میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" مولانا کی شاہکار تصنیف ہے۔ پہلے یہ کتاب تین جلدوں میں شائع کی گئی تھی مگر پھر اس کا سائز کم کر کے اُسے دو جلدوں میں شائع کیا گیا۔ ہم ان کی پرانی کتاب سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے عقائد اور ایمان پر تنقید کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں کہ:۔

"یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے نو سو ننانوے فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویّہ اسلام کے مقابل تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے، اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انہوں نے حق جان کر اُسے تسلیم کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اُسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ اُمید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔"

پاکستان کے تصوّر اور مسلمانوں کی جمہوری حکومت پر کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے مولانا موصوف فرماتے ہیں کہ:۔

"جمہوری انتخاب کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے دُودھ کو بلو کر مکھّن نکالا جاتا ہے۔ اگر دُودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکھن نکلے گا قدرتی بات ہے

کہ وہ دودھ سے زیادہ ہی زہر یلا ہوگا۔ پس جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی "

نیز ہندوستانی مسلمانوں کیخلاف کفر کا فتویٰ صادر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ :۔

"یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کی رطب و یابس سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافروں میں پائے جاتے ہیں اتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں۔ عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دینے والے جس قدر کافر قومیں فراہم کرتی ہیں غالباً اسی تناسب سے یہ بھی فراہم کرتی ہے۔ رشوت، چوری، زنا، جھوٹ اور دوسرے تمام ذمائم اخلاق میں یہ کفار سے کچھ کم نہیں ہے"

آگے چل کر سیاسی لیڈروں اور علمائے کرام کے متعلق مولانا مزید رقم طراز ہیں کہ :۔

"خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین اور مفتیانِ شرع، دونوں قسم کے رہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ ان میں سے کسی کی بھی نظر مسلمانوں کی نظر نہیں "

مندرجہ بالا اقتباسات جو کہ مولانا کی تصنیف سے نقل کیے گئے ہیں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مولانا مودودی جمہوری انتخابات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے جماعت اسلامی نے پاکستان کی سیاست

میں آمریت کو مستحکم کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ جنرل ضیاء الحق تو خاص طور پر جماعت اسلامی کے انتہائی احسان مند تھے کہ ان کے نام نہاد نفاذِ اسلام کا ڈھکوسلہ جماعت اسلامی کا ہی رچایا ہوا تھا۔ جس کے باعث وہ پوری قوم کو فریب دیتے رہے اور اس ملک اور اس کے عوام پر ۱۱ سال سے زائد عرصے تک بزورِ طاقت حکمرانی کرتے رہے۔

(۳) جماعت اسلامی اور امریکہ

امریکہ جماعت اسلامی پر بہت ہی زیادہ مہربان ہے۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے تمام اردو لٹریچر کی سب سے زیادہ خرید و فروخت امریکہ میں ہی ہوتی ہے۔ گویا امریکہ جماعت اسلامی کی سب سے بڑی تجارتی منڈی ہے۔ بعض دانشوروں کا کہنا ہے کہ امریکہ جماعت اسلامی کا اردو لٹریچر خرید کر سمندر میں پھینک دیتا ہے۔ یعنی امریکہ کو جماعتِ اسلامی کے لٹریچر سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ اس کی دلچسپی کا اصل مرکز جماعتِ اسلامی کو مالی امداد فراہم کرنا ہے۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی اور حیرانگی سے خالی نہیں کہ امریکہ میں ہی جماعت اسلامی کا ایم۔ اے کرایا جاتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ امریکی مقاصد جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں۔ ورنہ دوسری صورت میں اگر امریکہ کو اسلام سے ہمدردی ہوتی تو کیا وہاں اسلام یا اسلامی تعلیمات کا ایم۔ اے کرایا جاتا۔؟ یہی وجہ ہے کہ جماعتِ اسلامی نے بھی ہمیشہ امریکی مفادات کی بھرپور حمایت و نگہداشت کی ہے۔ کیونکہ اسی طرح حقِ نمک ادا کیا جا سکتا تھا جو کہ اس نے کیا۔

افغانستان کی موجودہ جنگ امریکہ نے اپنے ایجنٹ جنرل ضیاء الحق کی معرفت پاکستان پر مسلّط کی تھی اس جنگ کو جماعتِ اسلامی نے مقدّس جہاد کا نام دے کر اتنا مقبول بنا دیا ہے کہ آج عوامی حکومت کو بھی اس جنگ

سے انحراف کرنے کی فوری جرأت نہیں ہوئی۔ یہ تو تھا جماعتِ اسلامی اور اس کے بانی مولانا مودودی کے بارے میں چند حقائق کا خاکہ جو ہم نے آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آیئے اب ایک اور دوسری مذہبی جماعت کا جائزہ لیں۔ اس مذہبی جماعت کا بھی پاکستان کے عوام النّاس میں بڑی حد تک اثر کسی نہ کسی انداز میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس جماعت کا پاکستان کی سیاست میں بھی عمل دخل ہے۔

(۴) جمعیت العلمائے پاکستان بنیادی طور پر یہ ایک مذہبی جماعت ہے۔ اس جماعت کے مذہبی عقائد علمائے دیوبند اور مولانا مودودی کے عقائد سے متصادم ہیں اس لیے یہ جماعت ان کے خلاف ارتداد اور کفر کے فتوے دیتی رہی ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی اس جماعت کے قائد ہیں آپ اس بار بھی منعقدہ انتخابات نومبر ۱۹۸۸ء میں کراچی سے قومی اسمبلی کے ایک حلقے سے امیدوار تھے۔ اس کے علاوہ آپ کے معاونِ خاص پروفیسر شاہ فریدالحق بھی کراچی ہی سے قومی اسمبلی کے امیدوار تھے مگر ہر دو کو مہاجر قومی موومنٹ کے نوزائیدہ امیدواروں نے شکست دیدی۔ دراصل اس جماعت کا سرے سے کوئی سیاسی نصب العین ہی نہیں ہے۔ یہ جماعت محض فیشن کے طور پر سیاست میں داخل ہے۔ تاریخی اعتبار سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے جن حضرات کو کفر کے فتووں سے نوازا تھا ان میں بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمدؐ علی جناحؒ بھی شامل تھے۔ جب کہ مولانا نورانی نے پاکستان کے سادہ لوح عوام کو نظامِ مصطفیٰؐ کے پُرفریب نعرے سے اپنا بنانے کی لاحاصل سعی کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔

(۵) خاکسار تحریک علامہ عنایت اللہ مشرقی اس تحریک کے بانی اور خاتم تھے۔ علامہ صاحب امرتسر کے ایک خوشحال

خاندان کے فرد تھے آپ پیدائشی طور پر نہایت ذہین اور فطین انسان تھے۔ آپ نے ۱۹۰۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ریاضی میں ایم، اے کیا۔ اور اوّل پوزیشن حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں آپ نے کیمبرج یونیورسٹی کے کرائسٹ کالج لندن میں داخلہ لیا اور پہلے ہی سال ایک مقابلے کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے یونیورسٹی کی طرف سے ستر پونڈ ماہانہ وظیفہ حاصل کرنے کا اعزاز بھی پالیا۔ ۱۹۰۹ء میں آپ نے ریاضی کا ٹرائی پاس جس کے لیے تین سال کی معیاد مقرر ہوتی ہے دو سال میں ہی پاس کر لیا۔ اور اس میں بھی اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اس کامیابی پر آپ کو "رینگلر" کا خطاب دیا گیا۔ اس کے بعد آپ نے مشرقی علوم کی طرف توجّہ مبذول کی اور ان میں بھی کئی ڈگریاں حاصل کر کے یونیورسٹی کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے۔ جب علامّہ ۱۹۱۲ء میں وطن واپس آئے تو آپ کو اسلامیہ کالج پشاور کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔

علامّہ مشرقی بلاشبہ علمی دنیا کی ایک غیر معمولی اور نہایت قد آور شخصیت کے مالک تھے لیکن سیاست آپ کے بس کی بات نہ تھی۔ سیاست نے آپ کی علمی عظمت کو بھی ڈبو کر رکھ دیا۔ آپ کی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۲۵ء میں اس وقت ہوا، جب آپ نے اپنی معرکتہ الآرا تصنیف "تذکرہ" کی پہلی جلد مکمل کی۔ اس کے بعد علامّہ اس کتاب کا کوئی حصّہ تحریر نہ کر سکے۔ اسی کتاب کے ذریعے علامّہ مشرقی کا پہلا تصادم مولوی حضرات سے ہوا۔ آپ نے اس طبقے کے خلاف بہت کچھ لکھا جبکہ جواباً مولوی صاحبان آپ کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرتے رہے۔ اس کے بعد جب علامّہ اپنی تحریک چلانے کے لیے عملی طور پر سیاسی اکھاڑے میں اترے تو ان کے ذہن میں صرف عظمتِ اسلام کا تصوّر ہی تھا اور ان کا مطمعٔ نظر صرف مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ

کو واپس لانا تھا۔ لیکن علامہ کے ذہن میں نہ تو اپنے مقصد کا کوئی واضح اور ٹھوس نقشہ موجود تھا اور نہ ہی حصولِ مقصد کے لیے کوئی جامع پروگرام۔ علامہ نے ایک عسکری جماعت قائم کر کے اسے چپ راست کی تربیت تو بے شک دیدی لیکن اسے یہ نہ بتا سکے کہ اس تنظیم کا انتہائی نصب العین کیا ہے۔؟

فروری ۱۹۴۰ء میں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سر سکندر حیات نے تمام عسکری تنظیموں پر پابندی عائد کر دی۔ اس کاروائی کے خلاف آپ نے ۶ مارچ ۱۹۴۰ء کو یہ اعلان جاری کیا کہ :۔

" میں جانبازوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ لاہور پہنچ کر اپنی مدلیش سر سکندر کی چارپائی کے چاروں طرف بچھا دیں۔"

یہ ہے معیار اس علامہ کی سیاست دانی کا۔ جس نے دنیا کے علوم حاصل کیے تھے اور جو اسلام کی سربلندی کا دعویدار بھی تھا۔ متذکرہ بالا حکم ملتے ہی خاکسار لاہور شہر میں جمع ہونے شروع ہوئے اور خود علامہ دہلی چلے گئے۔ ۱۹ مارچ کو دن کے گیارہ بجے ۳۱۳ خاکساروں کا ایک دستہ سر پر کفن باندھے چپ راست کرتا ہوا بھاٹی دروازے کی مسجد سے برآمد ہوا۔ اس دستے کی قیادت منصور ضیغم نامی نوجوان کر رہا تھا یہ دستہ جب تھانہ بٹی کے قریب پہنچا تو پولیس نے اس کا محاصرہ کر کے گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ اس تصادم میں کم از کم پچاس خاکسار ہلاک ہو گئے۔ جب کہ پولیس کا ایک سپاہی اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ہلاک ہوئے۔ ۱۸۴ خاکساروں کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا جن میں سے اُنیس ملزمان کو حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ خاکسار جماعت کو خلافِ قانون قرار دیدیا گیا اور

علامہ مشرقی کو کراچی سے گرفتار کر کے لاہور لایا گیا۔

حکومت کے ساتھ اس پہلے اور آخری تصادم نے خاکسار تحریک کو کچل کر رکھ دیا اور اس کے بعد یہ جماعت کوئی سیاسی کردار ادا نہ کر سکی۔ البتہ اس جماعت نے حصولِ پاکستان کی تحریک کو روکنے کے لیے قائداعظم محمد علی جناح پر قاتلانہ حملہ کرایا لیکن حملہ آور اپنے مذموم مقاصد کے حصول میں ہرگز کامیاب نہ ہو سکا۔ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو اعلانِ آزادی کے بعد علامہ مشرقی نے اعلان کیا کہ:۔

"۳۰ جون ۱۹۴۷ء کو ملک کے تین لاکھ خاکسار جامع مسجد اور لال قلعہ دہلی کے سامنے جمع ہو جائیں اور آخری حکم کا انتظار کریں۔ اگر تین لاکھ خاکسار جمع ہو گئے تو آخری پروگرام دے دیا جائے گا ورنہ اس کھیل کو ختم کر دیا جائے گا۔"

علامہ صاحب کی یہ خواہش تو پوری نہ ہو سکی۔ البتہ "نہ نو من تیل آئے گا نہ رادھا ناچے گی" کے مصداق نہ تین لاکھ خاکسار جمع ہوئے نہ علامہ مشرقی اپنا آخری حکم دے سکے۔ لہٰذا انہوں نے خاکسار تحریک کو منتشر کرنے کا اعلان کر دیا۔

(۶) مجلس احرار دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں نیشلسٹ مسلمانوں کا ایک اجلاس چوہدری افضل الحق کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں مجلس احرار کی بنیاد رکھی گئی اور سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ چونکہ کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس میں مکمل آزادی کی قرارداد منظور کر لی تھی۔ لہٰذا مجلس احرار نے کانگریس کے ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ جماعت اپنے آخری سانس تک پاکستان کے

قیام کی مخالفت میں ہمہ تن مصروف رہی۔ جماعت کے صدر سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے ۱۹۴۴ء میں دہلی میں تقریر کرتے ہوئے حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ :۔

"پاکستان کی تھیوری میرے بار بار سوچنے پر بھی سمجھ میں نہیں آئی. میں جس قدر اس پر سوچتا ہوں اسی قدر کھو جاتا ہوں لیکن اگر آپ کہتے ہیں کہ مسلمان قوم اور خود ہندوستان کی نجات بھی اسی میں ہے تو اس سلسلے میں میرے چند خدشات ہیں اگر آپ مجھے ملاقات کا موقع دیں اور میرے خدشات دور کر دیں تو پھر آپ آرام سے بمبئی بیٹھ جائیں، میں آپ کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے حصولِ پاکستان کے لیے ہندو اور انگریز دونوں سے نپٹ لوں گا۔

دیکھیے مسٹر جناح !! یہ دس کروڑ مسلمان قوم کے مذہب اور اس کے مستقبل کا سوال ہے۔ یہ دس کروڑ عرب سے نہیں آئے بلکہ اسی کفر گڑھ سے خواجہ معین الدین چشتیؒ (اجمیری) حضرت خواجہ مجدد الف ثانی سرہندیؒ، حضرت علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش) حضرت نظام الدین اولیاؒ (دہلی) حضرت پیرانِ کلیرؒ جیسے ولی، قطب، ابدال اور شب زندہ دار لوگوں نے اپنی ریاضت و عبادت سے راجپوتانہ ایسے کفر گڑھ میں بیٹھ کر انھیں مسلمان کیا تھا۔ اگر ہندو اور انگریز کی ملی بھگت سے ان دس کروڑ مسلمانوں کو کسی طرح کا نقصان پہنچا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہو گی۔"

۲۷ مارچ ۱۹۴۶ء کو لاہور میں مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی نے حسب ذیل قرارداد پاس کی :۔

(۷) مجلسِ احرار کی قرارداد

(۱) "آل انڈیا مجلسِ احرارِ اسلام کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس موجودہ اہم سیاسی مسائل

کے متعلق ایک بار پھر اپنی پوزیشن واضح اور غیر مبہم طور پر ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

(ب) جہاں تک مسلم لیگ کے نظریۂ پاکستان کا تعلق ہے۔ مجلس عاملہ کسی صورت میں بھی اس سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ ہم تقسیم ہند کے نظریہ کا تجزیہ محض اقتصادی اور معاشرتی اصولوں پر نہیں کرتے، پاکستان کے قبول کرنے کا مطلب ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو تین مختلف حصّوں میں منتشر کرنا ہوگا۔ پنجاب کا (نامکمل صوبہ) سرحد، سندھ اور بلوچستان ہندوستان کے ایک سرے پر اور بالکل دوسرے سرے پر مشرقی بنگال اور آسام کے کچھ اضلاع کو پاکستان بنایا جا رہا ہے۔

ملّتِ اسلامیہ ان دو حصّوں میں بٹ کر نہیں رہے گی، بلکہ اس سے ایک قابلِ قدر حصّے پر ہندوستان میں دوامی غلامی مسلّط رہے گی۔ ان دو پاکستانی ریاستوں میں مؤثر غیر مسلم اقلیت موجود رہے گی۔ نیز پاکستان کی یہ دونوں ریاستیں جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے کی کسی بیرونی حملے کے وقت امداد نہیں کر سکیں گی، اور ان دو ریاستوں کے درمیان ہندوؤں کو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سونپ دی جائے گی۔ جس میں مسلم اقلیت کی پوزیشن حد درجہ غیر مؤثر رہے گی۔

مزید برآں اب مسٹر جناح نے نواب زادہ لیاقت علی خان کے نظریہ کو اپنا لیا ہے اور سکھوں کی علیحدہ سلطنت بنانے کے حق کو تسلیم کر کے پنجاب میں جمنا سے لے کر راوی بلکہ چناب تک کا علاقہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہونا درست قرار دے دیا ہے۔ اس روش کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بنگال اور آسام کے صوبوں کی بھی اسی طرح قطع و برید ہوگی، جس سے مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان بھی پہلے سے زیادہ بے وقعت اور اقتصادی لحاظ سے

بے حال ہو جائے گا۔

ان ٹھوس حقیقتوں کے بعد کوئی ذی شعور جماعت جو مسلمانوں کے تحفظ و حقوق کا دعوی کرتی ہے اس مہلک نظریہ سے متفق نہیں ہو سکتی۔

مجلس عاملہ اس حقیقت کا اعلان کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ یہ تمام خلافِ آئین و اخلاق سرگرمیاں اور محدود حقِ رائے دہندگی مسلم لیگ کی وقتی کامیابی کی ضامن ہوئیں۔ مسلم لیگ کی قیادت مسلمانوں کو ایک غیر منظم قوم اور بے ہنگام گروہ کی حیثیت دینا چاہتی ہے۔ لہٰذا یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے کہ مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔ اس کا عمل آج تک ملتِ اسلامیہ کے مفاد کے منافی رہا ہے۔ مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں اسلامی قوانین کی مخالفت اس کا مستقل شعار ہے۔ اس لیے مسلمان سیاسی، مذہبی، تمدنی رہنمائی کی توقع مسلم لیگ کی غیر اسلامی قیادت سے نہیں کر سکتے، اور مسلم لیگ کے کسی فیصلے کو اسلامی ہند کا فیصلہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔"

مندرجہ بالا واقعات سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ مسلم لیگ وہ واحد جماعت تھی جس نے قیامِ پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور اپنی بھرپور جمہوری/عوامی اور آئینی جدوجہد کے ذریعے اپنا یہ مطالبہ منظور کرا لیا۔ نیز یہ کہ پاکستان کی دوسری سیاسی اور مذہبی جماعتیں پاکستان کے قیام کی سخت مخالف تھیں لیکن قیامِ پاکستان کے بعد ان شکست خوردہ مذہبی جماعتوں نے مختلف حیلوں اور بہانوں سے جمہوری روایات کے فروغ اور مملکت کی ترقی میں رکاوٹیں پیدا کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔ خاص طور پر جماعت اسلامی نے جنرل ضیاء الحق کی آمریت کو مستحکم کرنے اور ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ بکھیرنے کے لیے قوم کو لسانی، علاقائی، اور مذہبی فرقہ بندی میں تقسیم کرنے کی شرمناک

جسارت کی ہے۔ اس لیے اس جماعت کو کسی حال میں بھی پھلنے پھولنے کا موقع نہیں دیا جانا چاہیئے کہ اس کا وجود ملک اور قوم دونوں ہی کے لیے ایک ناسور کی حیثیت رکھتا ہے اور زہر قاتل سے کسی طرح بھی کم ثابت نہیں ہو گا۔

جنرل ضیاء الحق کی حکمرانی

ہم اسی کتاب کے پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ اُردن میں قیام کے دوران جنرل ضیاء الحق کا رابطہ امریکی سی، آئی ،اے اور یہودی لابی سے قائم ہوا تھا جو مرتے دم تک برقرار رہا۔ ہم یہ بھی عرض کر چکے ہیں کہ امریکہ جماعت اسلامی کے اسلام کو کس قدر اہمیت دیتا ہے، نیز یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ امریکی وزیرِ خارجہ ہنری کسنجر نے جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کو دھمکی دیتے ہوئے کہا تھا کہ امریکہ ان کی حکومت کا تختہ الٹ دے گا اور ان کی ذات کو ہولناک مثال بنا دے گا۔ اس پس منظر میں جناب ذوالفقار علی بھٹوؒ کے زوال اور ضیاء الحق کے عروج کو سمجھنا کچھ ایسا دشوار بھی نہیں۔

سابق سیکرٹیری داخلہ جناب ایم ،اے ،کے چوہدری امریکی گھناؤنے کردار کا پردہ چاک کرتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ :۔

" جس وقت پی۔ این۔ اے ملک میں ہنگامہ آرائی میں مصروف تھی اسی دوران امریکی سفیر مقیم پاکستان کا تبادلہ ہو گیا۔ جنرل ضیاء الحق کمانڈر انچیف پاکستان آرمی نے ایک شاندار الوداعیہ سفیر کے لیے اپنے گھر پر دیا۔ میں اس وقت اسلام آباد میں بطور سیکریٹری داخلہ حکومتِ پاکستان تعینات تھا اور

مجھے بھی اس الوداعیہ میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دعوت کچھ زیادہ ہی پر تکلف اور اہتمام میں بڑی پر رونق تھی۔ کسی سفیر کے تبادلے پر عام طور پر وزارتِ خارجہ میں ایک عام سی دعوت دی جاتی ہے۔ اگر سفیر بہت اہم ملک کا ہو تو دعوت نامے سیکرٹری یا زیادہ سے زیادہ وزیرِ خارجہ کے نام سے جاری ہوتے ہیں۔ فوج کے سربراہ عموماً ایسی دعوتیں نہیں کرتے۔ بلکہ وہ تو سفیروں کی طرف سے دی گئی دعوتوں پر بھی کم ہی جاتے ہیں تاآنکہ کوئی خاص موقع جیسے کسی ملک کا قومی دن منایا جا رہا ہو۔ وہاں بھی فوج کے سربراہ رسماً ہی جایا کرتے ہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ اگلے دن میں نے وزیرِ اعظم سے ضمناً ذکر کیا۔ بھٹو جو نہایت زیرک انسان تھے، میرا مطلب سمجھ گئے اور خاموش ہو گئے۔ جب وہ سپریم کورٹ میں اپنے خلاف قتل کے مقدمے میں بیان دے رہے تھے تو انہوں نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ میرے سیکرٹری وزارتِ داخلہ نے مجھے اس واقعہ سے آگاہ کیا تھا اور ایک طرح سے آنے والے حالات کی طرف اشارہ بھی۔

جب پی، این، اے کی تحریک زوروں پر تھی تو قائم مقام امریکی سفیر کی ٹیلیفون پر ایک اور سفارت کار سے گفتگو پاکستانی انٹیلی جنس کے محکمے نے ٹیپ کرلی اور وزیرِ اعظم کو سنائی۔ گفتگو میں ٹیپ کا مصرعہ تھا "بھٹو ختم ہو گیا اور کھیل بھی ختم ہو گیا۔ انگریزی الفاظ تھے۔ BHUTTO IS FINISHED THE PARTY IS OVER یہ کہنا بعید از قیاس نہیں ہو گا کہ اس وقت تحریک کو چلانے والے یا تو امریکی سفارتخانے میں موجود تھے یا ان کے بہت قریب تھے جو کہ لمحہ بہ لمحہ تحریک کی شدّت یا کامیابی کی اطلاع سفارتخانے کو پہنچ رہی تھی۔ چونکہ ان کی دانست کے مطابق تحریک مکمل طور پر پلان کے مطابق چل رہی

تھی اور کامیابی سے ہمکنار رہتی۔ سفیر صاحب نے کسی احتیاط کی ضرورت نہ سمجھتے ہوئے کھلے الفاظ میں اپنے دل کی بات ٹیلیفون پر کہہ دی۔

اس گفتگو کے اگلے ہی روز بھٹوؔ نے اسمبلی کا اجلاس بلایا ہوا تھا جس میں انہوں نے خود خطاب کرنا تھا۔ اس تقریر میں بھٹوؔ نے امریکی سفیر کی یہ گفتگو بھی دہرائی اور بڑے جوش سے کہا۔ "THE PARTY IS NOT OVER" یعنی کھیل ختم نہیں ہوا۔

لیکن یہ بھٹوؔ مرحوم کی خام خیالی تھی۔ سی، آئی، اے کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں اور یہ کہ ان کا کاٹا پانی نہیں مانگتا انہیں شاید اس کا اندازہ ہی نہیں تھا۔

سی، آئی، اے کے افسران ایسی مہمات کا فخر سے ذکر کرتے اور ان کے متعلق لکھتے رہتے ہیں۔ ایران میں مصدّق مردِ آہن بن کر نمودار ہوا۔ اس نے ایرانی تیل پر انگریزوں کی اجارہ داری ختم کی۔ شاہ کے مقابلے میں عوام کو سرچشمۂ اقتدار ہونے کا تصوّر قائم کرنا چاہا۔ شاہ ایران بوکھلا کر ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ بعد ازاں سی، آئی، اے کے دو ماہرین تہران آئے۔ انہوں نے ڈالروں کے تھیلوں کے منہ کھول دیئے اور دو دن کے اندر ہی مصدّق کے خلاف ایسی تحریک چلائی کہ بے چارے وزیرِ اعظم نے روتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد شاہِ ایران واپس تہران آیا اور دوبارہ صاحبِ اقتدار بنا۔ جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں آئے دن یہی تماشا ہوتا رہتا ہے۔"

امریکہ نے ہمیشہ پاکستان کو کمیونزم کے خلاف ایک فرنٹ لائن کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ امریکی نظریہ ساز اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلامی نظریۂ حیات اتنا توانا، جامع اور مکمل ہے کہ جس کی وساطت سے کمیونزم کی یلغار کو بآسانی روکا جا سکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر اقبالؔ کے :-

جانتا ہے جس پہ روشن باطنِ ایّام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

یہی وجہ ہے کہ امریکہ نے جماعت اسلامی کی سرپرستی قبول کر رکھی ہے۔ ضیاء الحق کے عروج کے ساتھ ہی امریکہ نے پاکستان کو "اسلام کا قلعہ" بنانے کے لیے منصوبہ بندی شروع کر دی۔ امریکہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات نہ صرف کمیونزم بلکہ امریکی سامراج اور سرمایہ داری کا بھی حریف ہے اس لیے امریکہ ایسے اسلام کا نفاذ چاہتا تھا جس سے کمیونزم کو تو روکا جا سکے، مگر جو امریکی سامراج کا معاون بھی ثابت ہو۔ امریکہ کی یہ مشکل مولانا مودودی نے پہلے ہی آسان کر رکھی تھی۔ چنانچہ ضیاء الحق نے جماعتِ اسلامی کے اسلام کو عملاً نافذ کرنا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے جنرل ضیاء الحق نے اپنی حکومت کے حسبِ ذیل مقاصد متعیّن کیے :-

(۱) نظریۂ پاکستان کا تحفّظ۔

(۲) اسلامی قوانین کا نفاذ اور

(۳) اسلامی ریاست کا قیام۔

جماعت اسلامی نے قیامِ پاکستان کی مخالفت میں شکست کھانے کے بعد ملک کے اندر قوم کو مذہبی منافرت اور تفرقہ بازی کا نشانہ بنانے کے لیے اسلام کے مقدّس نام کی آڑ میں مذموم مقاصد کے حصول کے لیے اپنے اقدامات کا آغاز کر دیا۔ جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے سب سے پہلے یہ نعرہ بلند کیا گیا۔

" پاکستان کا مطلب کیا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ "

مقامِ حیرت ہے کہ جن لوگوں کو کل تک مولانا مودودی صاحب مسلمان بھی

تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے آج انہیں اسلام کا ہیرو بنایا جا رہا ہے۔ کل تک جو پاکستان مسلمانوں کی ایک کافرانہ ریاست تھی آج کلمہ طیبہ یعنی لا الٰہ الا اللہ کے ہم معنی ہو گیا ہے۔ مرزا غالب نے کیا خوب فرمایا تھا کہ:۔

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
اِک زمانہ مجھ پہ گویا مہربان ہو جائے گا

پاکستان پر امریکہ کی مہربانیوں اور کرم نوازیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ جماعت اسلامی نے اس خطۂ زمین کو کلمۂ طیبہ میں تبدیل کر کے رکھ دیا۔

ضیاء الحق نے اس نعرے سے دل کھول کر فائدہ اٹھایا۔ چونکہ یہ نعرہ ضیاء الحق کے آمرانہ مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ تھا اس لیے ضیاء الحق اپنے گیارہ سالہ دورِ حکومت میں نظریۂ پاکستان کی مسلسل رٹ لگاتا رہا۔ لیکن حقیقتاً جنرل ضیاء کا اصل مقصد جمہوری طرزِ حکومت اور عوامی احتساب سے فرار تھا اس لیے اس نے نظریۂ پاکستان کی آڑ میں پناہ لے کر اپنی آمریت کو مستحکم بنائے رکھا۔ اُردو ڈائجسٹ میں شائع ہونے والے ایک بیان میں جنرل ضیاء الحق نے کہا کہ:۔

"اسلامی نظام اور پارلیمانی نظام ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ میرا تو یہی تصوّر ہے مغربی جمہوریت کی بات اپنی جگہ درست مگر اسلام سے زیادہ جمہوریت اور کہیں بھی نہیں اور اس کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اسلامی نظام جمہوریت کی اساس ہے۔ احساسِ ذمّہ داری، اعلیٰ کردار اور ملک سے محبت پر قائم ہے مگر فرق یہ ہے کہ قرآن و سُنّت میں جو کچھ ہے اس میں جمہوریت کا کچھ دخل نہیں ہے۔"

لیکن عملاً ضیاء الحق نے جو سیاسی نظام ۱۹۸۵ء میں نافذ کیا وہ مغربی

قسم کی پارلیمانی جمہوریت کے قریب تر تھا اور اس سے مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت میں کوئی تمیز نہیں کی جاسکتی۔ گیارہ سال تک ضیاءالحق اسلامی جمہوریت کے نعرے لگاتا رہا مگر وہ اس عرصے میں اسلامی جمہوریت کی کوئی عام فہم تعریف تک کرنے میں کامیابی حاصل نہ کرسکا۔ یہ محض ایک فریب تھا جو جنرل ضیاءالحق محض اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے قوم کو دے رہا تھا۔

نظریۂ پاکستان

پاکستان کسی آفاقی یا مذہبی نظریئے کی بنیاد پر قائم نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی تخلیق دو قومی نظریئے کی بنیاد پر ہی ہوئی تھی۔ اسی طرح پاکستان کسی مذہبی ریاست کے قیام کے لیے معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا بلکہ یہ ملک مسلمان قوم کے لیے ایک آزاد اور جمہوری ریاست قائم کرنے کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان میں مذہبی قائدین کا کوئی حصّہ نہیں تھا۔ بلکہ یہ لوگ تو پاکستان کی مخالفت میں سرگرمِ عمل رہے۔ دو قومی نظریے کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں۔ یعنی مسلمان اور ہندو۔ مسلمان اپنے عقائد تہذیب و تمدّن، طرزِ معاشرت اور تاریخ و ثقافت کے اعتبار سے ہندوؤں سے علیٰحدہ قوم ہیں۔ اس لیے انہیں اپنی تہذیب و ثقافت کی نشوونما اور نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے علیٰحدہ خطۂ زمین درکار ہے۔ دراصل یہ ہندو، مسلم تہذیبوں کا تضاد تھا جو تقسیم ملک کا باعث بنا۔ مسلمانوں نے ہندوستان پر کئی صدیوں تک حکومت کی لیکن کسی بھی مسلمان بادشاہ نے ملک میں اسلامی شریعت نافذ نہیں کی۔ مسلمانوں کے مختلف خاندان ہندوستان پر حکمران رہے۔ ہر خاندان کی حکومت نسلی بادشاہت پر قائم تھی اور کسی بھی مسلمان بادشاہ نے ہندوستان میں اسلامی ریاست قائم نہیں کی تھی۔ ہندوستان کا المیہ یہ ہے کہ صدیوں کے

میل جول کے باوجود دونوں قومیں ایک دوسرے کے اندر جذب نہ ہو سکیں۔ ہندو اور مسلمان گھرانے صدیوں تک ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے رہے لیکن اس کے باوجود ایک سرسری نگاہ میں دونوں کا معاشرتی فرق صاف طور پر نظر آجاتا ہے۔ دونوں قومیں لباس، خوراک، طرزِ رہائش، طرزِ گفتگو، مجلسی آداب، غرضیکہ ہر بات میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ یہی تہذیبی اختلاف تھا جو دو قوموں کے درمیان تفریق کا باعث بنا اور بالآخر تقسیمِ وطن پر منتج ہوا۔ اسی لیے یہ دعویٰ کرنا کہ پاکستان اسلامی نظام کے قیام یا شریعتِ اسلامی نافذ کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ محض فریب ہے اگر ایسا ہوتا تو علمائے اسلام قیامِ پاکستان کی ہرگز مخالفت نہ کرتے۔

بابائے قوم حضرت قائدِ اعظم نے ۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء کو ایک جلسۂ عام میں تقریر کے دوران فرمایا تھا کہ :۔

" اسلام اور ہندومت دو الگ طریقہ ہائے عبادت ہی نہیں، دو مختلف اور متصادم ضابطہ ہائے حیات ہیں، اس لیے ہندو اور مسلمان معاشروں کا کسی مشترکہ قومیت میں انضمام نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارے کا راستہ یہی ہے کہ دونوں قومیں اپنے اپنے علاقوں میں الگ الگ حکومتیں بنانے پر متفق ہو جائیں "۔

دو قومی نظریے کی تاریخ

یہاں اس امر کا اظہار کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دو قومی نظریہ نہ تو مسٹر جناحؒ کی تخلیق تھا اور نہ ہی کوئی دوسرا مسلم لیڈر اس کا خالق کہلانے کا مستحق ہے۔ مسلمان علمائے کرام دو قومی نظریے کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے وہ صرف ہندوستانی قومیت کے قائل تھے۔ قائدِ اعظمؒ ایک کانگریسی لیڈر

تھے اور "ہندو مسلم اتحاد کے سفیر" کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ مسلم لیگ کا ۱۹۴۰ء تک کوئی سیاسی پروگرام نہیں تھا۔ اسی لیے اس جماعت سے کسی سیاسی نظریے کی توقع رکھنا محض بے سود تھا۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ دو قومی نظریے کے خالق انتہا پسند اور متعصب ہندو لیڈر رہتے۔ آر، این، اگروال اپنی مشہور تصنیف "نیشنل موومنٹ" میں رقم طراز ہے کہ :۔

"۱۹۱۷ء سے وی، ڈی، ساورکر نے "ہندو راشٹر" کے نظریے کا آزادانہ پرچار شروع کر دیا تھا۔ اس نے ہندوؤں کو تلقین کی کہ اقتدار پر قبضہ کر کے سچے ہندو راج کی بنیادیں رکھ دیں۔ وہ کہتا تھا کہ ہندوستان میں ایک متجانس قوم آباد نہیں ہے بلکہ یہاں دو قومیں آباد ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ مسلمانوں کا ہندوستان میں کوئی مستقبل نہیں ہے اگر کچھ ہے تو محض اقلیت کی حیثیت سے۔"

'ہندو مہاسبھا' کے رہنما اور صدر شنکراچاریہ کا اعلان تھا کہ :۔

"ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔ مسلمان یہاں مہمان ہیں۔ اگر ان کو یہاں رہنا ہے تو ان کو چاہیئے کہ مہمانوں کی طرح رہیں۔"

انڈین سول سروس کا ایک ممبر ہردیال اپنی کتاب "میرے وچار میں" لکھتا ہے کہ :۔

"میں اعلان کرتا ہوں کہ ہندوستان اور پنجاب میں ہندو نسل کے مستقبل کا انحصار ان چار اصولوں پر ہے۔ (۱) ہندو شنگھٹن (۲) ہندو راج (۳) مسلمانوں کی شدھی اور (۴) افغانستان اور سرحد کے مسلمانوں کی شدھی اور ان پر تسلط۔ جب تک ہندو قوم ان چاروں اصولوں پر کاربند نہ ہو

گی اس کا بطورِ نسل تحفظ ممکن نہیں "۔

ان اعلانات کا تعلق اس زمانے سے ہے جب ملک کی تقسیم کا نہ تو کہیں تصوّر تھا اور نہ ہی کوئی خواہش، البتہ یہ درست ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے سب سے پہلے علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کے قیام کے لیے دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم کا تصوّر پیش کیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس کے موقع پر جالندھر کے ایک نوجوان طالبعلم چوہدری رحمت علی نے جو کیمبرج یونیورسٹی میں زیرِ تعلیم تھے، مسلمان قائدین کے درمیان ایک پمفلٹ بعنوان "اب یا کبھی نہیں" تقسیم کیا تھا جس میں قیامِ پاکستان کا منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔ ہندوستان میں مسلم ریاست کا نام "پاکستان" بھی چوہدری رحمت علی کا تجویز کردہ ہے۔ تقسیم کے اس منصوبے کو تمام مسلم قائدین نے جن میں حضرت قائدِ اعظمؒ بھی شامل تھے نے مسترد کر دیا تھا۔ مسلم قائدین نے ہندوستان کی تقسیم کو کبھی بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ یہ ہندو قائدین اور پریس کے دباؤ کا نتیجہ تھا کہ آخر کار حضرت قائدِ اعظمؒ نے تقسیم وطن کو اپنی منزلِ مقصود قرار دیدیا تھا۔ حیرت ہے کہ ان حالات میں وہ نظریۂ پاکستان کہاں سے آگیا ہے کہ جس کے مطابق پاکستان میں اسلامی شریعت کو نافذ کیا جانا تھا اور اس کارِ خیر کی تکمیل کے لیے اللہ تعالٰے کی طرف سے جنرل ضیاء الحق کا تقررِ عمل میں لایا جانا تھا۔

(ا) مذہبی حکومت کی مخالفت حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اور مسلم لیگ کے دیگر قائدین نے مغربی انداز کی تعلیم و تربیت حاصل کی تھی اس لیے وہ مغرب کے سیاسی افکار کے دلدادہ تھے۔ مغرب میں سیاسی نظام میں جمہوری طرزِ حکومت انتہائی

پسندیدہ خیال کیا جاتا تھا ۔ حضرت قائدِ اعظمؒ آئینی اور جمہوری نظامِ سیاست کے بہت بڑے مبلغ تھے ۔ قیامِ پاکستان سے قبل اور بعد میں آپ نے ہمیشہ آئینی اور جمہوری اندازِ فکر کو قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے ۔ آپ کی پوری سیاسی زندگی میں مذہبی حکومت کی حمایت کی کوئی مثال نہیں ملتی ۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۱ اگست کو پاکستان کی پہلی آئین ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے بابائے قوم نے فرمایا تھا کہ :۔

" ایک حکومت کی اوّلین ذمّہ داری امن و امان کو برقرار رکھنا ہوتا ہے تاکہ مملکت کی طرف سے اپنے باشندوں کی جان و مال اور مذہبی عقائد کی پوری حفاظت کی جا سکے ۔ اس تقسیم میں ایک یا دوسری ڈومینین میں اقلیتوں کا باقی رہنا ناگزیر تھا ۔ ہمیں اپنی ساری توجّہ لوگوں بالخصوص عوام اور غریبوں کی بہبود پر مرکوز کر دینی چاہیئے ۔ آپ کا تعلق کسی مذہب، ذات یا عقیدہ سے ہو اس کا کاروبارِ مملکت سے کوئی سروکار نہیں ۔ ہم اس بنیادی اصول سے آغازِ کار کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک مملکت کے شہری اور مساوی شہری ہیں ۔ میرے خیال میں اب ہمیں اس بات کو بطورِ نصب العین پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، اور وقت گزرنے پر آپ دیکھیں گے کہ ہندو، ہندو نہیں رہیں گے، اور مسلمان، مسلمان نہیں رہیں گے، مذہبی لحاظ سے نہیں کیونکہ وہ ہر فرد کا ذاتی عقیدہ ہے بلکہ مملکت کے شہریوں کے طور پر سیاسی لحاظ سے ۔"

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان کی پہلی مرکزی کابینہ کے وزیرِ قانون مسٹر جوگندر ناتھ منڈل ایک غیر مسلم شخص تھے ۔ اگر بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ پاکستان میں اسلامی مملکت کے قیام کے حق میں ہوتے تو وہ ہرگز ایک غیر مسلم شخص کو وزیرِ قانون کے منصب پر فائز نہ

ہونے دیتے۔

حضرت قائدِ اعظمؒ نے فروری ۱۹۴۸ء میں امریکی عوام کے نام اپنے نشری پیغام میں واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ پاکستان ایک ایسی مذہبی مملکت نہیں ہوگا جس میں مذہبی پیشوا مامور من اللہ کے طور پر حکومت کریں گے۔ بابائے قوم کے بیان کا متن درجِ ذیل ہے :۔

" پاکستان آئین ساز اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتّب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخر کار شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ جمہوری طرز کا آئین ہوگا۔ جس میں اسلام کے بنیادی اصول متشکّل ہوں گے۔ یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی میں قابلِ عمل ہیں، جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ اسلام اور اس کی مثالیت نے ہمیں جمہوریت کا درس دیا ہے۔ اس نے انسانی مساوات، عدل اور ہر شخص سے منصفانہ برتاؤ سکھایا ہے۔ ہم ان درخشاں روایات کے وارث ہیں اور پاکستان کا آئندہ آئین بنانے والوں کی حیثیت میں ہمیں اپنی ذمّہ داریوں اور فرائض کا پورا احساس ہے۔ بہرحال پاکستان ایک ایسی مذہبی مملکت نہیں ہوگا۔ جس میں مذہبی پیشوا مامور من اللہ کے طور پر حکومت کریں گے۔ ہمارے ہاں بہت سے غیر مسلم ہیں۔ ہندو، عیسائی اور پارسی۔ لیکن وہ سب پاکستانی ہیں۔ وہ بھی تمام دوسرے شہریوں کی طرح یکساں حقوق اور مراعات سے بہرہ ور ہوں گے اور پاکستان کے معاملات میں کماحقہ کردار ادا کریں گے۔"

بابائے قوم حضرت قائدِ اعظمؒ کے دستِ راست قائدِ ملّت خان لیاقت علی خان نے ہمیشہ انسانی حقوق کی بحالی اور جمہوری روایات کی سربلندی کے لیے پُرخلوص جدّوجہد کی ہے۔ مئی ۱۹۵۰ء میں امریکہ کے سرکاری دورے کے

دوران آپ نے نیویارک میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :۔

" ہم جمہوریت یعنی بنیادی انسانی حقوق میں یقین رکھتے ہیں، ان میں شخصی ملکیت کا حق بھی شامل ہے اور لوگوں کا یہ حق بھی کہ کاروبارِ حکومت ان کی آزاد مرضی سے منتخب نمائندوں کے ذریعے چلایا جانا چاہیئے، ہم سب کے لیے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، مساوی شہریت، مساوی مواقع اور قانون کے تحت برابری میں یقین رکھتے ہیں۔ ہم اس بات میں بھی یقین رکھتے ہیں کہ ہر فرد کو، عورت ہو یا مرد، اپنی محنت کا پھل پانے کا حق ہے۔ اور بالآخر ہمارا یہ بھی یقین ہے کہ ہم میں سے جو دولت یا علم یا جسمانی اہلیت کے اعتبار سے خوش بخت ہیں۔ ان پر کم نصیب لوگوں کی طرف سے اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ہم ان اصولوں کو اسلامی نظامِ حیات کہتے ہیں۔ آپ انہیں جو چاہیں نام دے سکتے ہیں"

(۱۱) قراردادِ مقاصد پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی نے ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء سے اپنا کام شروع کیا اور کافی غور و خوص کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں ایک قرارداد منظور کی جو "قراردادِ مقاصد" کے نام سے شہرت پا چکی ہے۔ اس قرارداد کی منظوری کے متعلق پہلے وزیرِ اعظم پاکستان جناب خان لیاقت علی خان نے فرمایا تھا کہ :۔

" ملک کی تاریخ میں حصولِ پاکستان کے کارنامے کے بعد یہ اہم ترین واقعہ ہے"

نامور دانشور ڈاکٹر صفدر محمود قراردادِ مقاصد کے نصب العین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :۔

" قراردادِ مقاصد سے پاکستان کا جو خاکہ ذہن میں ابھرتا ہے اس سے واضح ہے کہ قرارداد کا مقصد پاکستان کو ایک ایسی اسلامی مملکت بنانا تھا

جو جمہوری تقاضے بھی پورے کرتی ہو۔ اس کا مقصد ہرگز خالصتاً مذہبی ریاست کا قیام نہیں تھا اور نہ ہی اس قرارداد کے ذریعے علماء کو کوئی خاص مقام یا اختیارات دیئے گئے تھے۔ قراردادِ مقاصد کے مطابق پاکستان کو ایک وفاقی سلطنت بننا تھا جس میں صوبوں یا یونٹوں کو ایک مقرّرہ حد تک آزادی ملنی تھی۔ لیاقت علی خان نے قرارداد کو دستور ساز اسمبلی کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا کہ "یوں تو مغربی ممالک اور روس بھی جمہوریت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن ہماری اسلامی جمہوریت کا تصوّر ہماری زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ اس کا جتنا تعلق نظامِ حکومت سے ہے اتنا ہی ہمارے معاشرے سے بھی ہے۔"

قراردادِ مقاصد اب ۱۹۷۳ء کے آئین کا حصّہ بن چکی ہے۔ پاکستان کے فکر و فلسفہ میں ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور کو بڑی اہمیّت حاصل ہے۔ ہم اس قرارداد کا متن بھی سطورِ بالا میں درج کر چکے ہیں۔ اس قرارداد میں بھی صرف مسلم اکثریت کے علاقوں کی آزادی اور خود مختاری کا مطالبہ کیا گیا تاکہ مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی اور اقتصادی مفادات کا تحفّظ ہو سکے اس قرارداد میں بھی مسلم اکثریت والے علاقوں میں اسلامی مملکت کے قیام کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ جنرل ضیاء الحق نے اسلامی ریاست کے قیام کے بہانے سے ۱۱ سال سے زائد عرصے تک اپنی مطلق العنانی اور آمریت کو قائم رکھا نہ معلوم وہ اسلامی ریاست کس قسم کی ہوگی جس کا سربراہ آئین اور قانون سے بالاتر ہے اور کسی کے سامنے جوابدہ بھی نہیں۔

قوم سے کیے گئے وعدوں کے مطابق انتخابات کرانے اور اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کرنے کے بجائے اپنے اقتدار کو طول دینے کی غرض سے "نفاذِ اسلام" کے نام سے ایک نئی مگر پُرفریب مہم کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے چند ایک تعزیری اور مالی قوانین نافذ کیے جن کا مختصر تعارف درج ذیل پیش کیا جا رہا ہے۔

نفاذِ اسلام کے چار تعزیری قوانین

جرم زنا (نفاذِ حدود) آرڈیننس نمبر ۷ ۱۹۷۹ء

یعنی جرم زنا آرڈیننس، مال کیخلاف جرائم کا آرڈیننس، قذف آرڈیننس اور امتناع منشیات کا صدارتی فرمان ۔ ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء کو نافذ کیے گئے۔ ان چاروں قوانین میں چونکہ زنا آرڈیننس مختلف وجوہات کی بناء پر زیادہ اہمیت کا حامل ہے اس لیے ہم صرف اس ایک قانون کا تعارف کرانے پر ہی اکتفا کریں گے۔

(۱) حد کی تعریف اس قانون میں حد سے مراد ایسی سزا ہے جو قرآن پاک اور سُنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں مقرر کی گئی ہو۔

(۲) تعزیر تعزیر سے مراد ایسی سزا ہے جو حد کے علاوہ ہو، یعنی جو کسی دوسرے قانون نافذ الوقت کے تحت مقرر کی گئی ہو۔

(۳) دفعہ ۵ زنا مستوجب حد اس قانون کی دفعہ نمبر ۵ کے مطابق حسبِ ذیل صورتوں میں حد کی سزا دی جائے گی۔

(۱) جب زنا کا ارتکاب ایسے مرد نے جو بالغ ہو اور فاتر العقل نہ ہو، ایسی عورت کے ساتھ کیا ہو، جس کے ساتھ نہ تو اس نے نکاح کیا ہو اور نہ اسے نکاح کا شبہ ہو۔

(۲) جب زنا کا ارتکاب ایسی عورت نے جو بالغ ہو اور فاتر العقل نہ ہو، ایسے

مرد کے ساتھ کیا ہو جس کے ساتھ نہ تو اس کا نکاح ہوا ہو اور نہ ہی اسے نکاح ہونے کا شبہ ہو۔

زنا کا جرم ثابت ہونے پر اگر زنا کار مرد یا عورت، شادی شدہ ہوں تو ان کو کھلے مقام پر سنگسار کر دیا جائے گا لیکن اگر وہ شادی شدہ نہ ہوں تو انھیں کھلے مقام پر ایک ایک سو کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔

(۴) **دفعہ ۶ زنا بالجبر** | اگر کوئی مرد یا عورت کسی عورت یا مرد کے ساتھ اس کی مرضی یا رضامندی کیخلاف زنا کرے تو وہ زنا بالجبر کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ اگر ایسے زنا کار مرد یا عورت شادی شدہ ہوں تو انھیں کھلے مقام پر سنگسار کر دیا جائے گا لیکن اگر وہ کنوارے ہوں تو انھیں ایک ایک سو کوڑے کی سزا دی جائے گی۔ یا کوئی دوسری سزا، جس میں سزائے موت بھی شامل ہے دی جاسکتی ہے۔

(۵) **دفعہ ۸ زنا یا زنا بالجبر مستوجب حد کا ثبوت** | زنا یا زنا بالجبر مستوجب حد کا ثبوت حسبِ ذیل میں سے کسی ایک شکل میں ہو گا۔

(الف) ملزم کسی عدالتِ مجاز کے رُو برو اقبالِ جرم کرے۔

(ب) کم از کم چار بالغ مرد مسلمان گواہ جن کے متعلق عدالتِ مجاز تزکیۃُ الشہود کے تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ اطمینان کرلے کہ وہ عادل اشخاص ہیں اور گناہِ کبیرہ سے پرہیز کرتے ہیں۔ عدالت کے سامنے چشمِ دید گواہوں کی طرح زنا کے فعل کی شہادت دیں۔ اگر ملزم غیر مسلم ہو تو گواہ بھی غیر مسلم ہو سکتے ہیں۔

(۶) **دفعہ ۱۰ زنا مستوجب سزائے تعزیر** | اگر کوئی شخص زنا یا زنا بالجبر کا ارتکاب کرے

جو مستوجب حد نہ ہو یا جس کے لیے دفعہ ۸ میں درج شدہ ثبوتِ جرم فراہم نہ ہو سکے اور مدعی کو قذف کی سزا دی گئی ہو یا جس کے لیے حد نافذ نہ کی جا سکتی ہو تو اسے سزائے تعزیر دی جائے گی جو حسبِ ذیل ہے :۔

(ا) جو کوئی شخص زنا مستوجب تعزیر کا ارتکاب کرے گا اسے دس سال تک قیدِ سخت اور ۳۰ کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ نیز وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(ب) جو کوئی شخص زنا بالجبر مستوجب تعزیر کا ارتکاب کرے گا اسے پچیس سال تک کے لیے قید اور ۳۰ کوڑوں کی سزا بھی دی جائے گی۔

(۷) **دفعہ ۱۲ غیر فطری فعل کے لیے اغواء** اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو غیر فطری خواہش نفسانی کا نشانہ بنانے کے لیے اغواء کرے تو اسے سزائے موت یا پچیس سال تک قیدِ سخت کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا اگر ایسے شخص کو سزائے قید دی گئی ہو تو اسے ۳۰ کوڑوں کی سزا بھی دی جائے گی۔

(۸) **دفعہ ۲۰ ضابطۂ فوجداری کا اطلاق** ضابطۂ فوجداری ۱۸۹۸ء کے احکامات اس قانون کے تحت قائم کیے گئے تمام مقدمات پر نافذ العمل ہوں گے۔

یہ اس شاہکارِ اعظم کا ایک حصّہ ہے جو جنرل ضیاء الحق نے گیارہ سالہ آمریت کے دوران تخلیق کیا اور جس کا ڈھنڈورا پیٹنے میں انہوں نے کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ہم اس قانون کے صرف ایسے ہی عملی پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے جو ایک سرسری نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتے ہیں۔

(۹) زنا کے عام اجزائے :۔ آرڈیننس کی دفعات ۵، ۶ اور ۸ کو

پڑھنے کے بعد یہ امر بخوبی عیاں ہوجاتا ہے کہ اسلامی شریعت صرف فٹ پاتھ پر زنا کرنے سے منع کرتی ہے بصورتِ دیگر یعنی گھروں میں بابند کمروں میں زنا کاری پر کوئی پابندی نہیں ہے کیونکہ اسلامی حدود کی رُو سے زنا اسی وقت جرم ہوگا جب چار آدمیوں کے سامنے کیا جائے اور چار آدمی بھی مجھ جیسے گناہگار نہ ہوں بلکہ ایسے نیک بندے ہوں جو گناہ کبیرہ سے پرہیز کرتے ہوں۔ یہ ایسی صورت ہے جو عملاً ممکن ہی نہیں ہے۔ پاکستان میں آج تک کسی شخص کو سنگساری کی سزا نہیں دی گئی۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں زنا نہیں کیا جاتا، نہیں ایسا ہرگز نہیں۔ البتہ دشواری صرف یہ ہے کہ قانون اتنا ناقص اور پیچیدہ ہے کہ اس قانون کے تحت کسی کو سزا دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

جنرل ضیاء الحق نے ۱۹۸۴ء میں نیا "قانونِ شہادت" نافذ کیا تھا اس قانون کی دفعہ ۱۷ کے مطابق اکیلی عورت بعض معاملات میں گواہی دینے کی اہل نہیں البتہ دو عورتیں مل کر گواہی دے سکتی ہیں۔ قصاص اور حدود کے مقدمات میں عورت کی گواہی کسی حال میں قابلِ قبول نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عورت کی گواہی کو نظرانداز کر کے زنا بالجبر کا جرم کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔؟

(۱) سائنسی شہادت جائز نہیں

انگریزی قانون میں زنا کوئی جرم نہیں تھا۔ البتہ زنا بالجبر جرم تھا۔ انگریز کا کمال یہ تھا کہ وہ ایسے قانون نافذ کرتا تھا جو قابلِ عمل بھی ہوتے تھے اور محض ہوا میں معلق نہیں رہتے تھے۔ زنا کا جرم ثابت کرنے کے لیے انگریزی قانون میں ثبوت فراہم کرنے کے کئی طریقے تھے مثلاً :۔

(i) مظلوم عورت کا بیان۔

(ii) واقعاتی شہادت۔

(iii) طبّی شہادت اور
(iv) سائنسی شہادت۔

زنا کے مقدمات میں عورت کے زبانی بیان کے علاوہ جرم کے پس منظر، نیز جائے وقوع سے جرم کا ثبوت فراہم کیا جاتا تھا اس کے بعد فریقین کا طبّی معائنہ کرایا جاتا تھا اور پھر فریقین کے کپڑوں نیز ان کے جسموں سے نکلنے والے مواد کا کیمیکل تجزیہ کرایا جاتا۔ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد زنا کا ثبوت فراہم ہوتا تھا۔ حدود آرڈیننس میں اس قسم کی تمام سائنسی شہادتوں کو رد کر دیا گیا ہے۔ اس سے پہلا تاثر تو یہی ابھرتا ہے کہ اسلامی شریعت سائنسی طریقۂ کار کی اہمیت اور افادیت کو تسلیم نہیں کرتی جس کا عملی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سائنٹفیک طریقۂ کار کو اپنائے بغیر شرعی قانون غیر مؤثر ہے۔

(۲) دفعہ ۱۲ غیر فطری فعل جائز ہے

دفعہ ۱۲ کے مطابق کسی شخص کو غیر فطری فعل کے لیے اغواء کرنا تو بے شک جرم ہے لیکن غیر فطری فعل کرنا جرم نہیں ہے اس سے منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی شریعت میں غیر فطری فعل کوئی جرم نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص غیر فطری فعل کا مرتکب ہوتا ہے تو حدود آرڈیننس کے تحت کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ اس کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے انگریز کی بنائی ہوئی تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۷۷ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

(۳) حدود کے قوانین اپاہج ہیں

حدود کے تحت فوجداری کارروائی انگریز کے بنائے ہوئے ضابطۂ فوجداری ۱۸۹۸ء کے مطابق کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اسلامی قوانین کیساتھ جنرل ضیاء الحق اسلامی ضابطۂ فوجداری مرتّب کرنے میں قطعی طور پر ناکام رہا تھا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی قانون میں حدود قوانین کو نافذ کرنے کا کوئی طریقۂ کار موجود نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ حدود قوانین محض اپاہج ہیں اور انھیں انگریزی قانون کی بیساکھیوں کے بغیر نافذ نہیں کیا جا سکتا لیکن امر واقعہ ایسا نہیں ہے۔ ضیاء الحق نفاذِ شریعت میں ہرگز مخلص نہیں تھا بلکہ اس نے اپنے طرزِ عمل سے اسلام کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے تمام متنازعہ امور کو جان بوجھ کر چھیڑا تھا تاکہ قوم انتشار میں مبتلا رہے اور وہ تاحیات اپنی آمریت قائم رکھے۔

(۴) **سزائے رجم کی تاریخ** رجم یا سنگساری کی سزا کا اوّلین ذکر تورات میں ملتا ہے یہ سزا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں جائز تھی اور اس کے بعد بنی اسرائیل کے انبیاء نے اسے جاری رکھا۔ اس سزا کے بارے میں مندرجہ ذیل واقعات کا تذکرہ یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

(ا) **حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ**: حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دعویٰ تھا کہ آپ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو نافذ کرنے کے لیے مبعوث کئے گئے ہیں۔ ہرچند کہ آپ کے مخاطب بنی اسرائیل تھے لیکن وہ لوگ آپ کی نبوّت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ چند یہودی ایک مرد اور ایک عورت کو پکڑ کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے لے آئے اور آپ کو بتایا کہ ان دونوں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حکم دیا کہ ان دونوں کو چھوڑ دو۔ اس پر وہ یہودی سخت برہم ہوئے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ آپ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو نافذ کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں تو کیا آپ

کو یہ معلوم نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں زانی مرد اور زانیہ عورت کی سزا رجم ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا۔ ہاں مجھے معلوم ہے، آپ درست کہہ رہے ہیں لیکن آپ لوگ موسوی شریعت کا پورا حکم بیان نہیں کر رہے۔ پورا حکم یہ ہے کہ زانی مرد اور زانیہ عورت کو سنگسار کر دیا جائے لیکن سنگسار کرتے وقت پہلا پتھر وہ شخص مارے گا جس نے زندگی بھر کبھی زنا نہ کیا ہو۔ کیا آپ کے درمیان کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے زندگی بھر زنا نہ کیا ہو۔؟ اس پر وہ لوگ شرمندہ ہو کر وہاں سے چلے گئے اور آپ نے اس مرد اور عورت کو چھوڑ دیا۔ لیکن ضیاء الحق کے بنائے ہوئے قانون میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے بلکہ ہر آدمی پتھراؤ کر سکتا ہے۔

(۱۱) صحیح بخاری کی روایات : "حضرت عمرو بن میمون سے روایت ہے (جو ایک صحابی تھے) کہ زمانۂ جاہلیت میں میں نے ایک بندریا کو دیکھا جس نے زنا کا ارتکاب کیا۔ سب بندر اس کے گرد جمع ہو گئے اور اسے سنگسار کیا اور میں نے بھی ان کے ساتھ پتھر مارے۔"

(بحوالہ صحیح بخاری۔ ایام الجاہلیہ)

اور اس کی تفصیل صحیح بخاری کے شارح امام ابنِ حجرؒ عسقلانی نے اس طرح بیان فرمائی ہے: "حضرت عمرو بن میمونؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دفعہ یمن میں اپنے ہاں کی بکریاں چرا رہا تھا اور میں ایک اونچی جگہ پر کھڑا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بندر، بندریا کو ساتھ لیئے ہوئے آیا اور اس کے ہاتھ کو اپنے سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ اس کے بعد (پہلے بندر کے مقابلے میں) نسبتاً کم عمر کا بندر آیا۔ اس نے بندریا کو آنکھ ماری تو اس نے آہستہ سے بندر کے سر کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اس (نوجوان) بندر کے پیچھے چل پڑی۔

اس بندر نے اس کے ساتھ مباشرت کی جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پھر وہ لوٹی اور پہلے بندر کے سر کے نیچے آہستہ سے اپنا ہاتھ دینے لگی۔ لیکن وہ گھبرا کر جاگ اٹھا۔ اس نے محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے، چنانچہ اس نے بندریا کو سونگھا تو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا۔ اس نے دہائی مچانا شروع کردی۔ اس پر بہت سے بندر جمع ہو گئے۔ وہ بندریا کی طرف ہاتھ بڑھا بڑھا کر چیختا رہا۔ چنانچہ وہ بندر ادھر اُدھر دوڑے اور اس (مجرم) بندر کو پکڑ لائے جسے میں پہچانتا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کے لیے گڑھا کھودا اور پھر انہیں سنگسار کردیا۔" (جیسا کہ اصل روایت میں کہا گیا ہے خود حضرت عمرو بن میمون نے بھی انہیں کچھ پتھر مارے تھے۔)

(حوالہ: فتح الباری۔ شرح بخاری۔ جلد ہفتم ص ۱۲۱)

زنا آرڈیننس کے نافذ ہونے کے بعد رجم کی سزا کا معاملہ پاکستان کی وفاقی شرعی عدالت میں پیش ہوا تھا۔ فاضل عدالت نے اس سزا کو اسلامی قانون کے خلاف قرار دیدیا تھا۔ اس فیصلے کا اقتباس پاکستان ٹائمز کی اشاعت مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۸۱ء میں اس طرح شائع ہوا تھا۔

"قرآن کریم نے زنا کی سزا سو کوڑے مقرر کی ہے اور یہی قول فیصل ہے۔ رجم کی سزا خلافِ قرآن ہے اس لیے اس قانون کو منسوخ کر دینا چاہیئے۔ جس کی رُو سے اسُے حَد (سزا) قرار دیا گیا ہے۔" اور اس کے بعد تحریر ہے کہ "اس بحث کا مخلص یہ ہے کہ ایک طرف سورۂ نور کی آیت نمبر ۲ میں قرآن مجید کا صاف، واضح اور غیر مبہم اور دو ٹوک حکم موجود ہے اس کے ساتھ ایسی احادیث بھی موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ کوئی حدیث نہ قرآن میں تبدیلی کر سکتی ہے، نہ منسوخ کر سکتی ہے۔ اس کے برعکس رجم کی سزا کے

حق میں کچھ احادیث ہیں جو مبہم، غیر متعیّن اور باہمدگر متضاد ہیں بلکہ بعض ایسی جن کا حدیث، ہونا بھی مشکوک ہے۔ فقہا کے اقوال بھی غیر یقینی اور متضاد ہیں۔ اندریں حالات نیز ان حقائق کے پیشِ نظر جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں اور اس باب میں قطعاً تامل محسوس نہیں کرتا کہ میں سورۂ نور کی آیت نمبر ۲ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوا قرآنی فیصلہ کی اطاعت کرتا ہوں اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ زانی کی سزا خواہ وہ شادی شدہ ہو اور خواہ غیر شادی شدہ پبلک۔۔ کے سامنے کوڑے مارنا ہے۔"

حکومت نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ ابھی یہ اپیل زیرِ سماعت تھی کہ جنرل ضیاء الحق نے وفاقی شرعی عدالت میں ترمیم کر کے اس عدالت کو اپنے فیصلوں پر نظرِ ثانی کا اختیار دے دیا اور رجم کی سزا کا مسئلہ دوبارہ وفاقی شرعی عدالت کے سامنے پیش کر دیا۔ فاضل عدالت نے سابقہ فیصلے پر نظرِ ثانی کر کے اُسے مسترد کر دیا اور رجم کی سزا کو بحال کر دیا۔ اس طرح یہ سزا اب دوبارہ نافذ العمل ہو چکی ہے۔

(iii) اسلامی فقہ کے اختلافات:۔ اسلامی فقہا کے باہمی اختلافات ہماری نظریاتی تاریخ کا معتدبہ حصّہ ہیں۔ آج پاکستان کے کسی جنرل کا یہ فیصلہ کہ وہ توپ کے سہارے ان تمام علمی مسائل کو ختم کر کے تمام فرقوں کے لیے ایک قابلِ قبول فقہ، اسلامی نافذ کر دے گا ایک ایسی خوش فہمی ہے جسے خود فریبی کے سِوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ضیاء الحق کے نفاذِ اسلام پر ماہرینِ قانون نے کبھی بھی مثبت ردّعمل کا اظہار نہیں کیا۔ جس کی یہاں صرف چند مثالیں ہی پیش کی جا رہی ہیں۔

(ا) مجلسِ شوریٰ کے صدر خواجہ محمّد صفدر نے ایک تقریر کے دوران فرمایا

تھا کہ:۔

"ملک میں مکمل اسلامی نظام کی راہ میں فقہہ کا اختلاف ایک رکاوٹ ہے۔ ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ان اختلافات کو ختم کئے بغیر ملک میں اسلامی نظام کا نفاذ حماقت ہو گی۔۔۔" انہوں نے ایک بار پھر کہا کہ مختلف مکاتبِ فکر کا باہمی اختلاف تاخیر کا باعث بن رہا ہے اور ہمیں زیادہ سوچ و بچار کے بعد ایسا لائحہ عمل تیار کرنا ہے جو انتشار کی راہیں بند کر دے۔"
(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۱۵ مئی ۱۹۸۳ء)

(۲) پاکستان کے سابق چیف جسٹس مسٹر جسٹس انوار الحق نے فقہی اختلافات کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ:۔

"یہ بد قسمتی کی انتہا ہے کہ آج تک اس بات کا فیصلہ نہیں ہو سکا کہ اسلام کی رُو سے سیاسی نظام کا ڈھانچہ کیا ہونا چاہیئے اور آج ہم ڈھانچوں میں مُبتلا ہیں کہ ایک ڈھانچہ بنتا ہے ایک بگڑتا ہے۔ اس طرح سے اسلام کا اقتصادی نظام، سماجی عدل و انصاف کا نظام، اسلامی قوانین، سب پر اس قدر فقہی اختلافات ہیں۔ پھر ایک ہی فقہہ کے لوگوں کے اندر آپس کے اختلافات ہیں۔ کچھ لوگ اس قدر تعصّب اور تنگ نظری سے کام لینا چاہتے ہیں کہ نئی نسل میں اسلام سے نفرت پیدا ہو رہی ہے۔" پھر فرمایا: "پاکستان میں یہ غلطی کی جا رہی ہے کہ اصولوں کا مطالعہ کرنے اور ان کی رُو کو نافذ کرنے کے بجائے کوشش یہ ہو رہی ہے کہ چودہ سو سال پہلے کی چیزوں کو اسی طرح اس دور میں بھی نافذ کیا جائے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور ۲۹ جون ۱۹۸۳ء)

البتہ ضیاء الحق کے نفاذِ اسلام کا یہ اثر ضرور ہوا کہ تمام فرقوں کے علماء

نے اپنے اپنے نظام ہائے فقہہ کے نفاذ کے لیے جدّوجہد شروع کردی ہے اور اس طرح قوم کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرکے قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے ناپاک عمل کا آغاز کردیا۔ اس ضمن میں علماء کی عملی کاوشوں کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔ جو درجِ ذیل پیش کی جا رہی ہیں۔

(۱) روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۷ر اگست ۱۹۸۵ء لکھتا ہے کہ: "سنّی مجلس عمل کے زیرِ اہتمام منعقدہ خلافتِ راشدہ کانفرنس نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ماتمی جلوسوں پر فوری طور پر پابندی عائد کی جائے اور اذان و کلمہ طیبّہ میں کمی بیشی کو فوراً اخلافِ قانون قرار دیا جائے۔ نیز یہ کہ مرتد کی شرعی سزا (قتل) نافذ کی جائے۔"

(۲) "کالعدم جمعیت علمائے پاکستان کے صوبائی کنونشن میں جو جامعہ نعیمیہ لاہور میں پیر سیّد برکات احمد کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ایک قرار داد کے ذریعے حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ملک میں اہلِ سُنّت کی حکومت ہونی چاہیئے۔ نیز اوقاف کا نظام بھی اہلسنّت کے سپُرد کیا جائے۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۹۸۵ء)

مفتی جعفر حسین اہلِ تشیع کے مسلّمہ قائد تھے آپ کا ایک خصوصی انٹرویو روزنامہ جنگ لاہور کی اشاعت مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ آپ نے شیعہ سنّی اختلافات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

"شیعہ سنّی اختلافات طبعی ہیں ان کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ مخصوص چیزوں پر عائد ہوتی ہے جبکہ دوسری فقہہ میں ایسا نہیں۔۔ زکوٰۃ کے طریقِ کار پر بھی ہمیں اختلاف ہے، ہمارے اور اہلسنت والجماعت کے ہاں اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ اموالِ ظاہر پر لی جاتی ہے اموالِ باطنہ پر نہیں۔

روپیہ چونکہ اموالِ باطنہ میں شامل ہے لہٰذا حکومت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس پر زکوٰۃ لے ۔"

اسکول میں اسلامیات کے نصاب کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مفتی جعفر حسین نے فرمایا کہ :۔

" یہ الگ ہونا چاہیئے شیعوں کی شیعہ دینیات اور سُنیوں کے لیے سنّی دینیات ۔ اگر دونوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے تو وہ کبھی دینیات نہیں رہے گی ۔ نہ سنّی رہے گی نہ شیعہ رہے گی کچھ بھی نہیں رہے گی ۔"

جب ان سے کہا گیا کہ آیا اس سے پاکستانی بچوّں کے اندر شروع ہی سے فرقہ وارانہ احساسات پیدا نہیں ہو جائیں گے تو انہوں نے کہا " شیعہ بچہّ شیعہ ہے اور شیعہ ہی رہے گا ۔ سنّی بچہّ سنّی ہے اور وہ سنّی ہی رہے گا ۔" انہیں بتایا گیا کہ ایک تجویز یہ ہے کہ ایک متفقّ علیہ فقہ مرتّب کی جائے جسے فقہہٗ پاکستان کہا جا سکتا ہے ۔ اس پر آپ کی رائے کیا ہے ۔؟ مفتی صاحب نے کہا کوئی نئی فقہہ مرتبّ نہیں کی جا سکتی اور ایسا کرنا نادانی ہو گی ۔ یہ بے معنی تجویز ہے ۔ عالم اجتہاد تو کر سکتے ہیں لیکن بالکل نئی فقہہ مرتّب نہیں کی جا سکتی ۔" انہوں نے مطالبہ کیا کہ " مذہبی اداروں مثلاً اسلامی نظریاتی کونسل ، وفاقی شرعی عدالت ، شریعت فیکلٹی وغیرہ میں جہاں اسلام کا کام ہوتا ہے اور قوانین کے لیے سفارش ہوتی ہے وہاں ہم اپنا حصّہ مانگتے ہیں ۔"

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن لاہور کے صدر اور اہلسنّت والجماعت کے مشہور اسکالر ہیں ۔ آپ نے نفاذِ اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ :۔

" پاکستان میں نفاذِ شریعت کے سلسلے میں پیدا ہونے والے فقہی

اختلافات کا ایک ہی حل ممکن ہے کہ دستوری طور پر پاکستان کو سنّی اسلامی ریاست قرار دیدیا جائے۔ کیونکہ اس ملک کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت اہل سُنت والجماعت پر مشتمل ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگرچہ اسلام کا معیار و مطلوب تو یہی ہے کہ مسلمان ایک متحد اور مربوط اُمّت بن کر رہیں، لیکن عملی اعتبار سے، سنّی اور شیعہ اختلافات کی نوعیّت اتنی حقیقی اور تاریخی ہے کہ ان کو دستوری اور قانونی سطح پر تسلیم کئے بغیر، نفاذِ شریعت کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔" انہوں نے ہمسایہ ملک ایران کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح ایران نے جعفریہ فقہ کو ملکی قانون قرار دے دیا ہے، پاکستان میں حنفی فقہ کو ملکی قانون قرار دیا جائے۔"

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور بابت ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ء)

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب فقہ کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

کسی دوسرے کی طرف سے نہیں بلکہ قرآن اکیڈمی کی طرف سے قرآنی فقہ کے نفاذ کے بجائے تجویز یہ پیش کی جا رہی ہے کہ یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ نوائے وقت میں دیئے گئے اس بیان کے علاوہ روزنامہ جنگ کے جمعہ میگزین مورخہ ۱۴ تا ۲۰ نومبر ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں جنگ فورم کی طرف سے جب یہ سوال کیا گیا کہ:۔

"مسلمانوں میں بہت سے فرقے ہیں۔ آپ سب فرقوں کی فقہ کے لیے مشترکہ فارمولا کیا بنائیں گے۔؟

تو اس پر آپ نے جواب دیا کہ بنیادی طور پر قانون تو سنّی فقہ کا ہوگا کیونکہ یہاں سُنیوں کی اکثریت ہے باقی سب فرقوں کو ان کے پرسنل لاء کے

حوالے سے یہ اجازت ہوگی کہ وہ اس پر عمل کریں۔ لیکن پبلک لاء سنّی فقہہ کے مطابق چلے گا۔ میں تو کہتا ہوں تمام فرقوں کی رجسٹریشن کرنی چاہیئے۔ اور ہر فرقہ کا اپنا بورڈ بن جانا چاہیئے۔"

ڈاکٹر صاحب کے بقول پاکستان میں اکثریت تو واقعی اہلسُنّت والجماعت کی ہی ہے اور یہ اکثریت فقہہ حنفی کی پیروکار ہے۔ گویا سُنّی فقہہ سے مراد فقہہ حنفی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو ڈاکٹر صاحب کے بیان کے حوالے سے دو سوال توجّہ طلب ہیں۔ پہلا یہ کہ آیا اسلام اکثریت کو صداقت کا معیار تسلیم کرتا ہے؟ اور دوسرا یہ کہ فقہہ حنفی کی حقیقت کیا ہے۔؟ ان سوالات کا جواب علمائے اسلام نے اس طرح دیا کہ فقہہ حنفی کی حقیقت کے متعلق ماہنامہ طلوعِ اسلام شمارہ ستمبر ۱۹۸۶ء اپنی اشاعت میں لکھتا ہے کہ:۔

"امام ابوحنیفہؒ نے اپنی فقہہ قرآن مجید کے حوالے سے مرتّب کی تھی اس سے چونکہ مفاد پرستوں کے مفاد پر ضرب پڑتی تھی اس لیے اس طبقے نے ان کی مدوّن کردہ فقہہ کو بعد کے مسلمانوں تک پہنچنے نہ دیا۔ علاّمہ شبلی کی تو یہی تحقیق ہے کہ ان کی کتاب ہم تک نہیں پہنچی۔ اور عقائد کی کتاب 'الفقہہ الاکبر' جو امام صاحب کی طرف منسوب کی جاتی ہے وہ بھی ان کی تصنیف نہیں ہے۔ آج کل جو فقہہ، فقہہ حنفی کے نام سے مشہور ہے وہ امام صاحب کے شاگردوں قاضی ابویوسف صاحبؒ اور امام محمدؒ کی مرتّب کردہ ہے۔ اس فقہہ میں بلاشبہ کہیں کہیں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اقوال موجود ہیں لیکن ان کے جن فتاویٰ سے مفاد پرست طبقے پر زد پڑتی تھی، ان میں سے کئی ایک کا ذکر حنفی فقہہ میں تو موجود نہیں لیکن دوسرے فقہی مذاہب کی کتابوں میں ان کا ذکر مل جاتا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ مودودی مرحوم نے فقہہ حنفی کے متعلق

یہ فرمایا کہ :۔

"دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہب میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو منجمد شاستر بنا رکھا ہے۔"

(بحوالہ ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ)

جہاں تک اکثریت کو معیارِ حق ماننے کا تعلق ہے تو اس کے متعلق مولانا مودودی اور خود امام ابوحنیفہؒ کی آراء قابلِ ذکر ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ :۔

"اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں۔" (بحوالہ "اسلام کا نظریۂ سیاسی" صفحہ نمبر ۴۵-۴۶)

مندرجہ بالا سطور میں مولانا مودودی کی فکر آپ نے ملاحظہ فرمائی اور اب درجِ ذیل سطور میں امام ابوحنیفہؒ کا مسلک بھی بغور ملاحظہ فرمائیے :۔

"یہی چیز اور یہی عوامل خود امام ابوحنیفہؒ کے پیشِ نظر تھے جس کو خطیب بغدادی صاحب نے اپنی تاریخ جلد ۱۴ صفحہ نمبر ۳۵۷ پر تحریر کیا ہے۔ امام نقی فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحب فرماتے ہم اسے لکھ لیا کرتے۔ ایک دن امام صاحب نے امام یوسف سے فرمایا کہ تیرا ستیاناس ہو جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابونعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ کو ابویوسف سے فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو کیونکہ مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطا کار ہوں یا مصیب۔" یہی

وجہ ہے کہ فقہا کے سرخیل جناب امام ابو حنیفہؒ نے فقہ حنفی کے نام پر کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ بزرگ آنے والی نسلوں کو اپنے فہم کا پابند نہیں بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ تدبّر فی القرآن اور مشاورت کی تعلیم کسی خاص دور کے لیے مختص نہیں ہو سکتی۔

غرضیکہ ان فقہی اختلافات کیوجہ سے ملتِ اسلامیہ بہت سے فرقوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے اور یہ ان ہی فقہی اختلافات کا نتیجہ ہے کہ :۔

" ان فقہی اختلافات کی بناء پر آج تک، یہ بھی متعیّن نہیں ہو سکا کہ قانونِ وراثت کی صحیح صورت کیا ہے، چوری کرنے والے کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا چاہیئے، وضو کا صحیح طریقہ کیا ہے۔؟ شراب کی متفقّہ علیہ تعریف کیا ہے۔؟ جَو کا پانی شراب ہے یا انگور کا۔؟ زکواۃ کا مفہوم کیا ہے؟ کیا رجم کی سزا درست ہے یا صرف کوڑوں کی۔؟ ربوٰ کے سلسلے میں صرف محنت کا ماحصل ہی جائز ہے یا روپیہ کا؟ کیا اسلام میں مضاربت کی اجازت ہے یا نہیں؟ کونسی اذان درست ہے اور کونسی نہیں؟ نماز میں ہاتھ چھاتی پر ہونے چاہئیں یا زیرِ ناف؟ آمین اونچی آواز میں کہنی چاہیئے یا آہستہ۔؟ وصیت کتنے مال کی کی جا سکتی ہے اور پھر اس کی صورت کیا ہو گی۔ گیارہویں شریف کا ختم حلال ہے یا حرام؟ کیا دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے یا ایک عورت کی گواہی ایک مرد کے؟ یتیم پوتے کا وراثت میں حصّہ ہوتا ہے یا نہیں؟ وغیرہ وغیرہ "

لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود مسلمانوں کی ملّی وحدت ہمیشہ برقرار رہی اور مسلمانوں کی سماجی زندگی میں یہ اختلافات ہمیشہ غیر مؤثر رہے اگر ان اختلافات کو نجی زندگی یا ذاتی نظریات اور عقائد تک محدود رکھا جاتا تو ہماری اجتماعی زندگی ان اختلافات کے مضر اثرات سے محفوظ رہتی۔ لیکن جنرل ضیاء الحق

نے ان اختلافات کو سیاسی اقتدار میں ملوّث کرنے کی کوشش کی ہے ۔ جو ملّت اسلامیہ کے لیے انتہائی خطرناک اور تباہ کن ہے۔ اگر ایک فرقہ اپنی اکثریت اور اپنے عقائد کی صحت کی بنیاد پر اپنی فقہ نافذ کرانے کی کوشش کرے گا تو دوسرے فرقوں کو کس طرح اپنے عقائد اور فقہ کو نافذ کرنے سے روکا جاسکے گا اور پھر یہ تنازعہ صرف مسلمانوں تک کیوں محدود ہے ؟ کیا پاکستان کے اقلیتی فرقوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ بھی اپنے مذہب اور عقائد کی سچائی ثابت کرنے کے لیے جدّوجہد کریں۔ یہ وہ کمزور بنیادیں ہیں جن پر کسی پائیدار سیاسی نظام کو استوار نہیں کیا جاسکتا اور اگر ہمارے سیاسی معاملات کا دائرہ انہی مسائل کے حل تک سمٹ آیا تو ہم اس تیز رفتار دنیا کے ساتھ کس طرح چل سکیں گے۔

ضیاءالحق نے اس قوم کی گیارہ سالہ قیمتی زندگی کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ضیاءالحق کے دور میں قومی زندگی کے ہر میدان میں ترقی کا فقدان نظر آتا ہے۔ جسے مستقبل میں انتہائی سرعت کے ساتھ دور کرنا ہوگا، کیونکہ ان کی آمریت ہی کی بدولت قوم کو ایک بہت بڑے عذاب سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ اپنا قومی تشخّص کھو بیٹھی اور فرقہ واریت کے زہر کے ساتھ ساتھ نسلی آلودگیوں میں بھی الجھ کر رہ گئی۔ جس کے باعث، چالیس سال سے ایک ساتھ رہنے والے لوگ ایک دوسرے کی جان کے نہ صرف یہ کہ دشمن بن گئے بلکہ ایک دوسرے کے خلاف اتنی نفرت کا شکار کیے گئے کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو کر رہ گئے۔ یہ ایک فطری بات ہے کہ قوم یا افراد میں نفرت کو تو بآسانی پیدا کیا جاسکتا ہے، لیکن نفرت کے اس زہر کو ختم کرنا انتہائی مشکل کام ہو جاتا ہے اوّل الذکر کام تو آمریت نے کر دکھایا جبکہ مؤخر الذکر کام تو منتخب حکومت ہی کو انجام دینا پڑے گا جو کسی قدر مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن ہرگز نہیں۔

زکوٰۃ و عُشر آرڈیننس ۱۹۸۰ء

نفاذِ اسلام کے سلسلے میں جنرل ضیاالحق کا دوسرا کارنامہ زکوٰۃ اور عُشر کا قانون ہے۔ اس قانون کے مطابق ہر سال رمضان المبارک کی کسی بھی مقرّرہ تاریخ پر زکوٰۃ اکٹھی کی جاتی ہے۔ زکوٰۃ کی وصولی کا سب سے بڑا ذریعہ عوام کا وہ سرمایہ ہے جو انہوں نے مختلف بینکوں میں جمع کرایا ہوا ہوتا ہے۔ اس سرمائے سے ڈھائی فیصد کے حساب سے بنک کے افسران از خود مقرّرہ تاریخ پر زکوٰۃ وضع کر لیتے ہیں اور پھر یہ رقم مرکزی فنڈ میں جمع کرا دی جاتی ہے۔ جہاں سے سرکاری حکاّم اور زکوٰۃ کونسلوں کے عہدیداروں کی وساطت سے مستحقین میں تقسیم کی جاتی ہے۔ بینکوں سے زکوٰۃ کی وصولی کے سلسلے میں حسبِ ذیل امُور خاص اہمیّت کے حامل ہیں۔

(ا) زکوٰۃ کی کٹوتی کے نرالے طریقے

(ا) جمع شدہ رقم کے لیے مدّت کی کوئی قید نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص رمضان کی پہلی تاریخ کو بنک میں کوئی رقم جمع کراتا ہے اور رمضان المبارک کی دوسری تاریخ یعنی دوسرے ہی دن زکوٰۃ کی رقم کی کٹوتی کے لیے مقرّر ہے تو اس شخص کی رقم میں سے زکوٰۃ وضع کی جا سکتی ہے۔

(ii) رقم کے جائز و ناجائز یا حلال و حرام کی کوئی قید نہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی جرم کا ارتکاب کر کے رقم حاصل کرتا ہے اور یہ رقم بنک میں جمع کرا دیتا ہے یا قرضہ لے کر رقم بنک میں محفوظ کرا دیتا ہے یا کسی دوسرے شخص کی رقم حفاظت کے لیے بنک میں رکھتا ہے یا یتیموں اور مسکینوں کی رقم بطورِ امانت بنک میں جمع کراتا ہے تو ایسے تمام اشخاص کی رقم پر مقرّرہ تاریخ پر زکوٰۃ وضع کر لی جائے گی۔

(iii) بنک کسی بھی اکاؤنٹ ہولڈر (کھاتے دار) سے زکوٰۃ وضع کرنے کی اجازت لینے کا بھی پابند نہیں ہے نہ ہی وہ اس امر کا پابند ہے کہ اکاؤنٹ ہولڈر

کو زکوٰۃ کی وضعگی سے پہلے یا وضعگی کے بعد زکوٰۃ کی کٹوتی کی تفصیل سے آگاہ کرے۔

(۲) قومی امانت میں سرکاری خیانت

زکوٰۃ کی کٹوتی کا یہ طریقۂ کار انتہائی غیر قانونی، غیر اخلاقی اور قابلِ مذمت ہے۔ دنیا کے کسی بھی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی بھی دوسرے شخص کے مال پر اس کی مرضی یا رضامندی کے بغیر قبضہ کر کے اسے اپنے تصرّف میں لے آئے۔ چہ جائیکہ یہ کاروائی اسلام کے مقدّس نام پر ہی کی جائے۔ ملک کے تمام بینک سرکاری ادارے ہیں۔ گویا قوم نے اپنی رقومات حکومت کے پاس بطورِ امانت جمع کرا رکھی ہیں۔ اس لیے کسی بھی بنک کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے اکاؤنٹ ہولڈر کی رضامندی کے بغیر اس کے حساب میں سے کسی بھی طرح کی کٹوتی کرے اور جو کوئی بنک ایسا کرے گا وہ خیانتِ مجرمانہ کا مرتکب سمجھا جائے گا۔ اور اس جرم کی سزا کا مرتکب بھی ہوگا۔

(۳) قانونِ زکوٰۃ پر ردِ عمل

قانونِ زکوٰۃ پر سب سے زیادہ ردِّ عمل اہلِ تشیع اور اہلِ حدیث کی جانب سے کیا گیا۔ اہلِ تشیع حضرات نے تو باقاعدہ ضیاء الحق کے صدراتی محل کا گھیراؤ کرنے کے لیے اسلام آباد میں بہت بڑا مظاہرہ بھی کیا۔ جس پر ضیاء الحق نے ابتدًا تو ان سے ٹکرانے کی کوشش کی مگر جب دیکھا کہ اس میں کامیابی کے امکانات مشکوک ہیں تو ہتھیار ڈال دیئے اور قانونِ زکوٰۃ میں ترمیم کر ڈالی۔ اس ترمیم کے مطابق ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اس امر کا بیانِ حلفی داخل کرے جس میں یہ اعلان کیا جائے کہ اس کے فقہ کے مطابق وہ جبری زکوٰۃ کی کٹوتی کا پابند نہیں ہے تو اس شخص کی زکوٰۃ وضع نہیں کی جائے گی اور

اگر وضع کی جاچکی ہے تو واپس کردی جائے گی۔

جبکہ اہلحدیث کی طرف سے کسی اسٹریٹ پاور کا مظاہرہ تو بے شک نہیں کیا گیا تھا البتہ انہوں نے اخباری بیانات کے ذریعے قانونِ زکوٰۃ کیخلاف اپنی بھرپور نفرت کا اظہار ضرور کیا تھا۔ اس ضمن میں روزنامہ مساوات میں شائع ہونے والی ایک خبر درجِ ذیل ہے ملاحظہ فرمایئے :۔

" مرکزی جمعیت اہلحدیث نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو تقریباً ایک کروڑ اہلحدیث، اہل تشیع کی طرح بنکوں سے رقم نکلوانے کے سوال پر غور کریں گے۔ تنظیم کے مرکزی امیر مولانا معین الدین لکھوی نے آج پریس کانفرنس سے استفسار کیا کہ آیا صدرِ مملکت اِس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ عُشر اور زکوٰۃ کی شرائط، نصاب اور مصارف کے سلسلے میں جس طرح اہلِ تشیع کو اہلِ سُنّت سے اختلاف ہے اسی طرح زکوٰۃ وعُشر کے بیسیوں مسائل جن میں اہلِ حدیث اور فنّی ماہرین کے ساتھ شیعہ، بریلوی اور دیوبندی علماء کو نمائندگی دی گئی ہے لیکن جماعت اہلحدیث کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا، حنفی علماء چاہے بریلوی ہوں یا دیوبندی، فقہِ حنفی سے ہی رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور شیعہ ارکان فقہِ جعفریہ سے، لیکن اہلحدیث نہ فقہِ حنفیہ کو واجب العمل سمجھتے ہیں نہ فقہِ جعفریہ کو۔ ان کے نزدیک صرف اور صرف قرآن وحدیث ہی واجب العمل ہے۔ ان حالات میں کونسلروں کے طے کردہ قواعد اور ضابطے اہلحدیث کے نزدیک نہ کسی اہمیت کے حامل ہوں گے نہ کسی اعتماد کے قابل "

(۴) **جبری زکوٰۃ کے نتائج** زکوٰۃ کی جبری وصولی کے نتائج انتہائی حوصلہ شکن ہیں۔ ان نتائج کا پیدا ہونا

نظامِ فطرت کے طبعی عمل کے عین مطابق ہے۔ قانونِ زکوٰۃ سے تعلق رکھنے والے تمام افراد اور ادارے اچھی طرح جانتے ہیں کہ بنکوں سے حاصل شدہ رقم چھینا ہوا مال ہے۔ اس لیے وہ اسے مالِ غنیمت سمجھ کر اس سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جن سے مستحق افراد محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ قومی پریس میں شائع ہونے والی چند قابلِ ذکر خبریں پیشِ خدمت ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

روزنامہ نوائے وقت اپنے اداریئے جو کہ ۴ ستمبر ۱۹۸۴ء کو شائع ہوا تھا میں لکھتا ہے کہ:۔

"یہ بات باعثِ حیرت و اضطراب بن رہی ہے کہ نظامِ زکوٰۃ و عُشر کی بدولت گداگری کا جو سلسلہ بتدریج کم اور ختم ہونا چاہیئے تھا وقت گزرنے کے ساتھ اس کا دائرہ وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور بازاروں گلی کوچوں، ریلوے اسٹیشنوں اور بس اڈّوں کے علاوہ مساجد کے اندر اور باہر حتّٰی کہ ریل گاڑیوں کی طرح مسافر بسوں میں بھی ان کی یلغار میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔" اداریہ نوائے وقت کے بعد روزنامہ جنگ نے اپنے ہاں مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۸۵ء کو جو کچھ تحریر کیا وہ مندرجہ بالا حقائق سے بھی کہیں زیادہ تشویشناک ہے کیونکہ زکوٰۃ کے مروّجہ نظام سے صرف یہی نقصان نہیں ہوا کہ اس سے زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم نظروں سے اوجھل ہو گیا بلکہ اس سے یہ بھی ہوا کہ اس سے مصلحین اور علماءِ کرام کو اپنی جیب گرم کرنے کا خوب موقع ملا۔ اور بقولِ مدیر جنگ لاہور کے:۔

زکوٰۃ کی رقم سے کاروں اور کوٹھیوں کی خریداری

زکوٰۃ کی تقسیم کے بارے میں لاہور کے ایک ہفتہ وار نے ایک تشویشناک رپورٹ شائع کی ہے جس کے مطابق

ابھی تک پنجاب میں بیس کروڑ روپے مستحقین تک پہنچنے کی بجائے بنکوں میں پڑے ہیں اور کہا نہیں جا سکتا کہ آئندہ رمضان شریف میں جب دسویں قسط واجب الادا ہو جائے گی نویں قسط کا حساب بے باک ہو جائے گا۔ اس میں متعلقہ محکموں کا قصور نہیں اس رقم کا بیشتر حصّہ دینی مدارس کی امداد کے لیے مختص تھا۔ ہر سال ایک لاکھ سے تین لاکھ روپے کی رقم ملتی تھی مگر حکومت کو پتا چلا کہ بعض دینی مدارس کے مہتمم زکوٰۃ کی رقم کو خرد برد کر جاتے ہیں اور طلبہ کو اس میں سے کوئی حصّہ نہیں ملتا۔ اس پر سینہ زوری کا یہ عالم ہے کہ طلبہ کو جعلی رسیدوں پر دستخط کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ پنجاب زکوٰۃ کونسل انتظامیہ کے ایک ذمہ دار افسر نے بتایا کہ بعض علمائے کرام نے غبن کے ذریعے کاریں اور کوٹھیاں خرید لی ہیں۔ صوبے میں کُل بارہ سو دینی مدارس ہیں۔ مگر ان کی فہرست پر ان کے کردار کی روشنی میں نظرِ ثانی کے بعد ابھی تک کل ساڑھے تین سو مدارس کو رجسٹر کیا جا سکا ہے۔ ان حالات میں زکوٰۃ کی رقم کا بر وقت تقسیم ہو جانے سے رہ جانا ناگزیر تھا۔ یہ امر نہایت افسوس ناک ہے کہ اگر علمائے کرام زکوٰۃ کی رقوم کھا جانے سے پرہیز نہیں کرتے تو عام گناہ گاروں کا کیا ذکر۔"

(بحوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور مورخہ ۹ راپریل ۱۹۸۵ء)

اس سلسلے میں مزید ایک اخباری خبر ملاحظہ فرمائیے:۔

"جس وقت تک ہم زکوٰۃ کے مروّجہ عجمی تصوّر پر عمل کرتے رہیں گے حالات زیادہ سے زیادہ مخدوش اور تشویشناک صورت اختیار کرتے چلے جائیں گے لہٰذا اس کا علاج زکوٰۃ کے قرآنی مفہوم کو اپنانے میں ہے نہ کہ عجمی مفہوم کو اپنانے میں۔ اس موقع پر پاکستان میں مروّجہ زکوٰۃ اور عُشر کے سلسلہ میں کمیٹیوں کے قیام کے متعلق صرف یہ عرض کر دینا کافی ہوگا کہ صرف پنجاب میں ۸۳-۱۹۸۲ء

کے دوران ان کی تعداد ۲۲۳۱۹۴ تھی جبکہ تحصیل کی سطح پر ۸۶ اور ضلعی سطح پر ۲۷ کمیٹیاں قائم ہیں اور ان کے لیے مرکزی زکوٰۃ فنڈ سے صوبائی زکوٰۃ فنڈ کو ایک ارب چالیس کروڑ روپے فراہم کیے گئے اور اس رقم میں سے ۶ کروڑ ۲۵ لاکھ روپے کی رقم ۱۰۴۳ مذہبی مدارس کو ادا کی گئی۔"

(بحوالہ روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۳ء)

(۵) زکوٰۃ کا اسلامی مفہوم

ضیاء الحق کا نافذ کردہ قانونِ زکوٰۃ قرآنِ مجید اور سنّتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکامات کے صریحاً خلاف ہے بلکہ ان سے متصادم بھی ہے۔ اس سلسلے میں قرآن وسنّت کے احکام کی تفصیل بیان کرنے سے بیشتر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ماہرین کی رائے بیان کر دی جائے۔ مارچ ۱۹۵۰ء میں حکومتِ پاکستان نے زکوٰۃ کی حیثیت مقرر کرنے کے لیے تیرہ ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ اس کمیٹی نے ایک سوالنامہ جاری کیا تھا نیز ملک کے دانشوروں، مفکرین، ماہرینِ اقتصادیات اور علمائے کرام کے علاوہ ایران، مصر اور شام کے علماء سے استفادہ کر کے ایک جامع رپورٹ مرتب کی تھی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ میں زکوٰۃ کی حسبِ ذیل تعریف پیش کی گئی تھی :۔

(۶) زکوٰۃ کی تعریف

"زکوٰۃ معیّن حصّہ مال ہے جو شارع کے تعیّن کے موافق اس کے تعیّن کردہ مصارف کے لیے خالصتاً بلا معاوضہ دیا جائے نیز زکوٰۃ کی فرضیت محض ایک مالی عبادت کی حیثیت سے ہوتی ہے جس کا اصل مقصد مسلمانوں کے نفوس و اموال کی تطہیر اور فقرا و مساکین کی حاجت روائی ہے۔ ضروریاتِ مملکت میں اس کے مفید ثمرات ایک ثانوی درجہ رکھتے ہیں۔ جس طرح کلمۂ شہادت، نماز، روزہ اور حج خالص

عبادات ہیں اس طرح زکوٰۃ بھی ایک خالص عبادت ہے۔ اس کا ادا کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ خواہ کوئی مملکت قائم ہو یا نہ ہو اور ان کی ضروریات اس سے پوری ہوں یا نہ ہوں مملکت کی تمام ضروریات پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ جاری کرنے کا تصوّر قرآن اور حدیث کے منشا اور جمہوریت کے مسلّمات کے بالکل خلاف ہے"۔

"یہ ہے زکوٰۃ کا وہ تصوّر جو آج پوری ملّتِ اسلامیہ میں پایا جاتا ہے"۔

(۷) زکوٰۃ کا تاریخی و مذہبی پس منظر

زکوٰۃ ادا کرنے کے احکامات اوّلین آسمانی کتاب توریت میں ملتے ہیں اور اس کے بعد یہ تسلسل آخری آسمانی کتاب یعنی قرآن مجید تک قائم رہا ہے، مقدس انجیل کے عہد نامۂ قدیم میں زکوٰۃ کا ذکر حسبِ ذیل کتب آیات میں اس طرح آیا ہے:۔

(۱) استشنا باب ۱۴ آیات نمبر ۲۸ اور ۲۹

"تین برس کے بعد تو تیسرے برس کے مال کی ساری وہ یکی نکال کر اُسے اپنے پھاٹکوں کے اندر اکٹھا کرنا۔ تب لاوی جس کا تیرے ساتھ کوئی حصّہ یا میراث نہیں اور پردیسی اور یتیم اور بیوہ عورتیں جو تیرے پھاٹکوں کے اندر ہوں، آئیں اور کھا کر سیر ہوں تاکہ خداوند تیرا خدا تیرے سب کاموں میں جن کو تو ہاتھ لگائے تجھ کو برکت بخشے"۔

(۲) امثال باب نمبر ۲۱ آیات نمبر ۱۳ - ۱۴

آیت نمبر ۱۳ "جو مسکین کا نالہ سُن کر اپنے کان بند کر لیتا ہے وہ آپ بھی نالہ کرے گا اور کوئی نہ سُنے گا"۔

آیت نمبر ۱۴ "پوشیدگی میں ہدیہ دینا قہر کو ٹھنڈا کرتا ہے اور انعام بغل میں دے دینا غضبِ شدید کو"۔

(۳) امثال باب نمبر ۲۲ آیت نمبر ۹

"جو نیک نظر ہے۔ برکت پائے گا۔ کیونکہ وہ اپنی روٹی میں سے مسکینوں کو دیتا ہے۔"

(۴) امثال باب نمبر ۲۸ آیت نمبر ۲۷

"جو مسکینوں کو دیتا ہے۔ محتاج نہ ہوگا لیکن جو آنکھ چراتا ہے بہت ملعون ہوگا۔"

(۵) استثنا باب نمبر ۱۵ آیات نمبر ۷ تا ۱۱

آیت نمبر ۷ "جو ملک خداوند تیرا خدا تجھ کو دیتا ہے اگر اس میں کہیں تیرے پھاٹکوں کے اندر تیرے بھائیوں میں سے کوئی مفلس ہو تو اپنے اس مفلس بھائی کی طرف سے نہ اپنا دل سخت کرنا اور نہ ہی اپنی مٹھی بند کر لینا۔

آیت نمبر ۸۔ بلکہ اس کی احتیاج رفع کرنے کو جو چیز اسے درکار ہو اس کے لیے تو ضرور فراخ دستی سے اُسے قرض دینا۔

آیت نمبر ۹۔ خبردار رہنا کر تیرے دل میں یہ بُرا خیال نہ گزرنے پائے کہ ساتواں سال جو چھٹکارے کا سال ہے نزدیک ہے اور تیرے مفلس بھائی کی طرف سے تیری نظرِ بد ہو جائے اور تُو اسے کچھ نہ دے اور وہ تیرے خلاف خداوند سے فریاد کرے اور یہ تیرے لیے گناہ ٹھہرے۔

آیت نمبر ۱۰۔ بلکہ تجھ کو اُسے ضرور دینا ہوگا اور اس کو دیتے وقت تیرے دل کو بُرا بھی نہ لگے اس لیے کہ ایسی بات کے سبب سے خداوند تیرا تیرے سب کاموں میں اور سب معاملوں میں جن کو تو اپنے ہاتھ میں لے گا۔ تجھ کو برکت بخشے گا۔

آیت نمبر ۱۱۔ اور چونکہ ملک میں کنگال سدا پائے جائیں گے اس لیے

میں تجھ کو حکم کرتا ہوں کہ تُو اپنے مُلک میں اپنے بھائی یعنی کنگالوں اور محتاجوں کے لیے اپنی مُٹھی کھلی رکھنا۔

(۸) عہد نامہ جدید

اس کتاب کی حسبِ ذیل آیات میں زکوٰۃ کے احکامات وارد ہوئے ہیں۔

(۱) متی باب ۶ آیات نمبر ۱ تا ۶

آیت نمبر ۱۔ خبردار اپنے راستبازی کے کام آدمیوں کے سامنے دکھانے کے لیے نہ کرو۔ نہیں تو تمھارے باپ کے پاس جو آسمان پر ہے تمہارے لیے اجر نہیں۔

آیت نمبر ۲۔ پس جب تُو خیرات کرے تو اپنے آگے نرسنگا نہ بجوا جیسا ریاکار عبادت خانوں اور کوچوں میں کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کی بڑائی کریں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔

آیت نمبر ۳۔ بلکہ جب تو خیرات کرے تو تیرا داہنا ہاتھ کرتا ہے اسے تیرا بایاں ہاتھ نہ جانے۔

آیت نمبر ۴۔ تاکہ تیری خیرات پوشیدہ رہے۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔

آیت نمبر ۵۔ اور جب تم دعا کرو تو ریاکاروں کی مانند نہ بنو کیونکہ وہ عبادت خانوں میں بازاروں کے موڑوں پر کھڑے ہو کر دعا کرنا پسند کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کو دیکھیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا اجر پا چکے۔

آیت نمبر ۶۔ بلکہ جب تُو دعا کرے تو اپنی کوٹھڑی میں جا اور دروازہ بند کر کے اپنے باپ سے جو پوشیدگی میں ہے دعا کر۔ اس صورت میں تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھے بدلہ دے گا۔

(۲) لُوقا باب ۱۴ - آیات نمبر ۱۲ تا ۱۴

آیت نمبر ۱۲ "پھر اس نے اپنے بلانے والے سے بھی یہ کہا کہ جب تُو دن کا بارات کا کھانا تیار کرے تو اپنے دوستوں یا بھائیوں یا رشتہ داروں یا دولتمند پڑوسیوں کو نہ بلا تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ بھی تجھے بلائیں اور تیرا بدلہ ہو جائے۔"

آیت نمبر ۱۳ "بلکہ جب تُو ضیافت کرے تو غریبوں، لُنجوں، لنگڑوں، اندھوں کو بُلا۔"

آیت نمبر ۱۴ "اور تجھ پر برکت ہو گی کیونکہ ان کے پاس تجھے بدلہ دینے کو کچھ نہیں اور تجھے راست بازوں کی قیامت میں بدلہ ملے گا۔"

آیئے اب زکوٰۃ کے سلسلے میں قرآن حکیم کی چند آیات کا بغور جائزہ لیں۔

درج ذیل آیات میں ارشادِ ربّانی ہے کہ :-

(۱) "نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ تم اپنی عاقبت کے لیے جو بھلائی کما کر آگے بھیجو گے اللہ کے ہاں اُسے موجود پاؤ گے جو کچھ تم کرتے ہو وہ سب اللہ کی نظر میں ہے۔" (سورۂ بقر آیت نمبر ۱۱۰)

(۲) "ہاں جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں ان کا اجر بے شک ان کے رَب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں۔ (سورۂ بقر آیت نمبر ۲۷۷)

(۳) "اللہ کی مسجدوں کے خادم تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر کو مانیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اس کے سوا کسی سے نہ ڈریں انہی سے یہ توقع ہے کہ سیدھے چلیں گے۔" (سورۂ توبہ آیت نمبر ۱۸)

(۴) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام

معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" (سورۂ الحج آیت نمبر ۴۱)

(۵) "یقیناً فلاح پائی ہے ایمان والوں نے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ لغویات سے دور رہتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔" (سورۂ المومنون۔ آیات نمبر ۱ تا ۵)

(۶) "نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو اور رسولؐ کی اطاعت کرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔" (سورۂ النور۔ آیت نمبر ۵۶)

(۷) "جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا اور زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی کو حاصل کرنے کے لیے دیتے ہو اس کے دینے والے دراصل اپنا مال بڑھاتے ہیں۔"

(سورۂ الروم آیت نمبر ۳۹)

(۸) "نماز قائم کرو۔ زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو، جو کچھ بھلائی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے وہی زیادہ بہتر ہے اور اس کا اجر بہت بڑا ہے اللہ سے معفرت مانگتے رہو بے شک اللہ بڑا غفور رحیم ہے۔" (سورۃ المزمل آیت نمبر ۲۰)

(۹) "اور ہم نے ان کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعے نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔" (سورۂ الانبیاء آیت نمبر ۷۳)

(۱۰) "اور اس کتاب میں اسمٰعیلؑ کا ذکر، وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ انسان تھا۔" (سورۂ مریم آیت نمبر ۵۴)

(۱۱) "میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا اور بابرکت

کیا جہاں بھی میں رہوں اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں۔" (سورۂ مریم آیت نمبر ۳۱)

قرآن پاک میں زکوٰۃ کا ذکر تقریباً ۲۸ مقامات پر آیا ہے اور ہر مرتبہ نماز کے ساتھ ہی یہ ذکر آیا ہے مندرجہ بالا قرآنی آیات کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کا تعلق اسلام کے نظامِ عبادت سے ہے۔ زکوٰۃ اسلام کا تیسرا اہم رکن ہے اور اسلام کے مالی نظام سے اس کا کوئی تعلق نہیں، زکوٰۃ کی ادائیگی ہر مسلمان کے عقیدے اور ایمان کا جزو ہے۔ زکوٰۃ ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر فرض ہے۔ خواہ وہ کسی بھی مسلمان ریاست کا باشندہ ہو یا غیر مسلم ریاست کا باشندہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے مسلمان بھی زکوٰۃ کے اسی طرح پابند ہیں جس طرح کہ پاکستان کے مسلمان اس کی ادائیگی کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔

فقہائے اسلام نے زکوٰۃ کو مالی عبادت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے لیکن اُسے اسلام کے مالیات یا معاشیات کے زمرے میں ہرگز داخل نہیں کیا۔ دراصل زکوٰۃ کی ادائیگی ایک عبادت ہے جو صرف صاحبِ نصاب افراد پر فرض ہے۔ اسلام نے ہر عبادت کو ادا کرنے کے لیے کچھ اصول اور طریقے مقرر کر رکھے ہیں جن کی تکمیل کے بغیر کوئی بھی عبادت مکمل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً نماز کے لیے ضروری ہے کہ نمازی کے کپڑے پاک ہوں، نمازی باوضو ہو اور نماز پڑھنے کی نیّت باندھے۔ اسی طرح روزہ رکھنے کے لیے لازم ہے کہ وقت مقرّرہ پر سحری کھائی جائے اور وقتِ متعیّنہ ہی پر افطاری کا اہتمام کیا جائے۔ اسلام کے نظامِ عبادت میں سب سے اہم کام نیّت کا باندھنا یا کرنا ہے۔ آنحضور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ایک حدیثِ مبارکہ ہے جس میں

آپ فرماتے ہیں کہ :۔

" اعمال کا تعلق نیت سے ہے " اس لیے زکوٰۃ کی نیت کے بغیر کسی کو رقم ادا کرنا زکوٰۃ نہیں ہے۔ ضیاءالحق کے قانون میں نیت تو کجا رضامندی کے عنصر تک کا دخل ضروری نظر نہیں آتا۔ تمام آسمانی کتابوں میں یہ اصول قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے کہ زکوٰۃ دینا ایک نیکی اور پارسائی کا عمل ہے اور اس کا اجر اللہ تعالےٰ ہی کی طرف سے ملے گا اور سیاسی اقتدار کے ساتھ اس مسئلے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کتابِ مقدس اور قرآنِ عظیم میں زکوٰۃ دینے کی تحریک کے ساتھ ساتھ اس نیک عمل کی خوبیاں گنوائی گئی ہیں تاکہ انسان خود بخود اس کام کی طرف رجوع کر سکے۔ اسلامی تاریخ میں دو سری دو مثالیں ایسی ہیں کہ جن میں زکوٰۃ جبراً وصول کی گئی۔ پہلی مثال خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ہے۔ آپ نے مسلمانوں کے ایک قبیلے کے خلاف طاقت استعمال کی تھی کیونکہ اس قبیلے نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ جبکہ دوسری مثال خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی ہے۔ جس کے ذریعے آپ نے ایک عیسائی قبیلے سے زکوٰۃ وصول کی تھی۔ آپ کے اس اقدام کی بنیاد یہ تھی کہ آپ نے اس قبیلے پر جزیہ عائد کیا تھا۔ جو انھوں نے دینے سے انکار کر دیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مسلمان صرف غیر عرب اقوام سے جزیہ وصول کرنے کے حقدار تھے اور چونکہ وہ عرب ہیں اس لیے جزیہ نہیں دیں گے۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے زکوٰۃ کی مثال دیتے ہوئے انھیں بتایا کہ اسلامی حکومت عرب مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرتی ہے اس پر انہوں نے زکوٰۃ دینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ زکوٰۃ نصاب کے مطابق صرف مسلمان ہی سے وصول کی جا سکتی ہے تو عیسائیوں نے نصاب سے دو گنا زکوٰۃ ادا کرنے کی پیشکش

کردی جو حضرت عمرؓ نے قبول کرلی۔

پاکستان کی صورتحال اس وقت کے حالات سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں نہ تو زکوٰۃ کے منکرین موجود ہیں اور نہ ہی غیر مسلموں سے زکوٰۃ وصول کرنے کا مسئلہ درپیش ہے۔ اس لیے یہاں پر ہر شخص کو اجازت ہونی چاہیئے کہ وہ زکوٰۃ اپنی مرضی ومنشا سے ادا کرے۔ پھر زکوٰۃ ادا کرنے کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس کی ادائیگی اپنے غریب و نادار اور مستحق رشتہ داروں کو کی جاتی ہے۔ اس لیے یہاں پر جبری وصولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس طریقۂ وصولی سے متذکرہ بالا مستحقین محروم رہ جاتے ہیں اور کوئی بھی شخص دوبارہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا متحمل نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ احکامِ خداوندی کی اس خلاف ورزی ہوگی تو دوسری جانب دولت کا بے جا اسراف گردانا جائے گا۔ جس کی اسلام میں سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔

ناظمینِ صلوٰۃ کا تقرر

جنرل ضیاء الحق کا نفاذِ اسلام کے سلسلے میں تیسرا کارنامہ "نظامِ صلوٰۃ" کا قیام ہے۔ ضیاء الحق نے ۱۴ راگست ۱۹۸۴ء کو ناظمینِ صلوٰۃ کے تقرر کا اعلان کیا۔ یہ ناظمینِ صلوٰۃ کون لوگ تھے ان کے اختیارات اور فرائض کیا تھے۔ اس بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں کی گئیں البتہ یہ ضرور بتایا گیا تھا کہ یہ حضرات اپنی کاروائی کی رپورٹیں براہِ راست جنرل ضیاء الحق کے پاس بھیجا کریں گے۔ نیز یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ ان لوگوں کو اپنے مقاصد کے حصول میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی۔ مزید یہ کہ آیا یہ حضرات ابھی تک اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں یا جنرل ضیاء الحق کی موت کے بعد قوم کو قیامِ صلوٰۃ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بہرحال صورتحالِ جو کچھ بھی ہو۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ نظامِ صلوٰۃ کا

اعلان دراصل اسلام کے تصوّرِ عبادت اور مسلم قوم کی اسلامی بصیرت کیساتھ ایک سنگین مذاق کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ جبکہ ضیاء الحق اور ان کے بے مشر تھرے یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ رکوع و سجود کی خواہش انسانی رُوح کی انتہائی گہرائیوں سے جنم لیتی ہے اور اس کا اظہار روحانی وجدان کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس لیے کسی بھی قسم کا خارجی دباؤ انسان کے دل و دماغ میں رکوع و سجود کے جذبات ہرگز ہرگز پیدا نہیں کرسکتا اور پھر ایسی نمازیں جو صرف توپ کے خوف سے ادا کی جائیں، قبولیت کے شرف سے قطعاً عاری ہوتی ہیں۔ اور خشوع و خضوع سے بھی خالی اور پھر ایسی عبادات سوائے وقت کے ضیاں کے کسی اور حیثیت کی حامل بھی نہیں ہوتیں۔

درحقیقت اسلامی تاریخ میں یہ پہلی مثال تھی کہ مسلمانوں کو ڈرا دھمکا کر نمازیں پڑھنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ علامہ اقبال نے اسی قسم کی بے ثمر نمازوں کے متعلق فرمایا تھا کہ :-

ؔ جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

غرضیکہ جنرل ضیاء الحق کا نظامِ صلوٰۃ چونکہ ایک غیر فطری اور غیر طبعی عمل تھا اس لیے بُری طرح ناکام ثابت ہوا۔ بہرحال ضیاء الحق اس قسم کی مجنونانہ کاروائیوں سے اپنی آمریت کو مسلسل طول دینے میں کامیاب ہوتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس طرح اپنے اصل مذموم مقاصد کے حصول میں کامیاب و کامران رہا۔ اور اپنے جذبۂ حکمرانی کی تسکین تادمِ آخر کرتا رہا۔

قانونِ شہادت ۱۹۸۴ء کا نفاذ اور جنرل ضیاء الحق | آمریت کے دلدادہ

جنرل ضیاء الحق نے ۲۸ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو اپنے صدارتی حکم نمبر ۱۰ کے ذریعے نیا قانونِ شہادت نافذ کر دیا۔ اس قانون اور انگریزی قانونِ شہادت ۱۸۷۲ء میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ سابقہ قانونِ شہادت کی مختلف دفعات کو آگے پیچھے کر کے نیا قانونِ شہادت نافذ کر دیا گیا ہے۔ جبکہ دونوں قوانین میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ سابقہ قانون میں مرد اور عورت کو گواہ کی حیثیت سے مساوی درجہ حاصل تھا اس کے برعکس نئے قانون کی دفعہ ۱۷ میں اس مساوات کو ختم کر کے بعض معاملات میں ایک عورت کو گواہی دینے سے منع کر دیا گیا اور دو عورتوں کو ایک ساتھ گواہی دینے کی اجازت دیدی گئی ہے۔ اس طرح عورت کو مرد سے آدھا تصوّر کیا گیا ہے۔

عورت کا مرد سے نصف ہونے کا تصوّر بدّوی معاشرہ میں ملتا ہے۔ لیکن آج کا انسان تہذیبی ترّقی کے اس مقام پر آ گیا ہے کہ جہاں اس قدیم تصوّر کو منّ وعن قبول نہیں کیا جا سکتا۔ خود پاکستان میں اس تصوّر کو قبول نہیں کیا گیا۔ کیونکہ مادرِ ملّت محترمہ فاطمہ جناح کو ایوّب خان کے مقابلے میں حزبِ اختلاف نے صدارتی انتخابات میں اپنے امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کیا تھا۔ جبکہ محترمہ بیگم رعنا لیاقت علی خان کو نہایت اہم سرکاری ذمّہ داریاں بھی تفویض کی گئیں۔ یہی نہیں بلکہ حالیہ منعقدہ انتخابات نومبر ۱۹۸۸ء میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹّو وزارتِ عظمٰی کے عہدے پر فائز ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے عدالتی نظام میں کئی خواتین کو جج اور مجسٹریٹ صاحبان کے عہدوں پر فائز کیا گیا ہے۔ اور کئی خواتین ایڈیشنل جج کے عہدے پر بھی اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں جو قتل کے مقدمات کی سماعت کرنے اور مجرمان کو پھانسی تک کی سزا دینے کا اختیار رکھتی ہیں۔

ضیاء الحق نے قوم کو عجیب تضاد اور کشمکش میں مبتلا کر دیا کیونکہ ایک طرف تو اکیلی عورت گواہی تک نہیں دے سکتی اور دوسری طرف وہی عورت قاتل کو پھانسی کی سزا تک دے سکتی ہے۔

جنرل ضیاء الحق کو بین الاقوامی سطح پر خواتین کے کارہائے نمایاں نظر نہ آئے اسرائیل کی وزیرِ اعظم گولڈا میئر نے پوری عرب دنیا کو کئی سال تک تختۂ مشق بنائے رکھا جبکہ بھارتی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی نے بھارت کی تعمیر و ترّقی کے لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں کہ جن کا جنرل ضیاء الحق اور ان کے رفقاء تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ پاکستان کو طاقت کے ذریعے توڑ دینا اندرا گاندھی کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو ان کا باپ جواہر لال نہرو بھی سرانجام نہ دے سکا۔ حیرت ہے ان قومی اور بین الاقوامی روشن حقائق اور کارہائے نمایاں کی موجودگی کے باوجود جنرل ضیاء الحق عورت کو مرد کے برابر درجہ دینے کے لیے تیار نہیں !!!

مردِ مومن مردِ حق

جنرل ضیاء الحق اپنے لیے مردِ مومن مردِ حق کے نعرہ ہائے تحسین سُن کر بڑے فاتحانہ غرور و تکبّر کے ساتھ نعرے لگانے والوں سے ہاتھ کے اشاروں سے داد وصول کیا کرتے تھے جس کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ ایک ایسی سچائی ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں۔ قرآن پاک اور احادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ’مردانِ مومن‘ کا ذکر متعدّد بار آیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومنین اللہ تعالےٰ کے محبوب بندے ہیں۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کا تو تقریباً سارا کلام ہی ’مردِ مومن‘ کے اوصاف کی منظوم تفسیر پر مشتمل ہے۔ دلوں کا حال تو اللہ تعالےٰ ہی بہتر جانتا ہے البتہ ایک حکمران کی حیثیت سے جب ہم ضیاء الحق

کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو انتہائی مایوسی ہوتی ہے اور جنرل ضیاء الحق کا مومن ہونا تو درکنار ان کا مسلمان ہونا بھی انتہائی مشکوک ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال نے کافر اور مومن کے فرق کو اس طرح واضح کیا ہے۔

ص کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

ضیاء الحق کی سیرت اور کردار سے ان کی شخصیت کا جو نقشہ ابھرتا ہے اس میں مومنانہ صفات کا شائبہ تک نظر نہیں آتا بلکہ ضیاء الحق انتہائی جاہ پرست دنیاوی مال و دولت کے شیدائی تھے۔ وہ انتہائی ظالم، سفاک اور پرلے درجے کے شر پسند انسان بھی تھے۔ ان کے کردار کی چند جھلکیاں پیش خدمت ہیں:۔

(۱) قومی خزانے کا استحصال

ضیاء الحق اس ملک کو اپنی جاگیر اور قومی خزانے کو ذاتی ملکیت سمجھتے تھے۔ انہوں نے اسلام آباد میں اپنے لیے کئی بنگلے بنوائے۔ ایک بنگلے کے متعلق یہ حقیقت سامنے آئی ہے کہ ان کے لڑکوں نے یہ بنگلہ ان کی موت کے بعد مبلغ ۸۴ لاکھ روپے میں فروخت کیا ہے۔ ضیاء الحق نے اپنی ذات اور خاندان پر قومی خزانے کو جس بے دردی سے خرچ کیا اس کو صرف اس ایک مثال سے ہی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ "فرنٹیئر پوسٹ پشاور کی اشاعت مورخہ ۱۹ر اپریل ۱۹۸۸ء کے مطابق بیگم ضیاء الحق کی آنکھوں کے علاج کے لیے وفاقی وزارتِ خزانہ نے غیر ملکی زرِ مبادلہ کی مد میں اسی لاکھ روپے منظور کئے تھے۔"

(۲) پیر صلاح الدین کیس اور ضیاء الحق کا ایمان

جنرل ضیاء الحق مشیتِ الٰہی کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس حقیقت کا انکشاف پیر صلاح الدین کیس میں
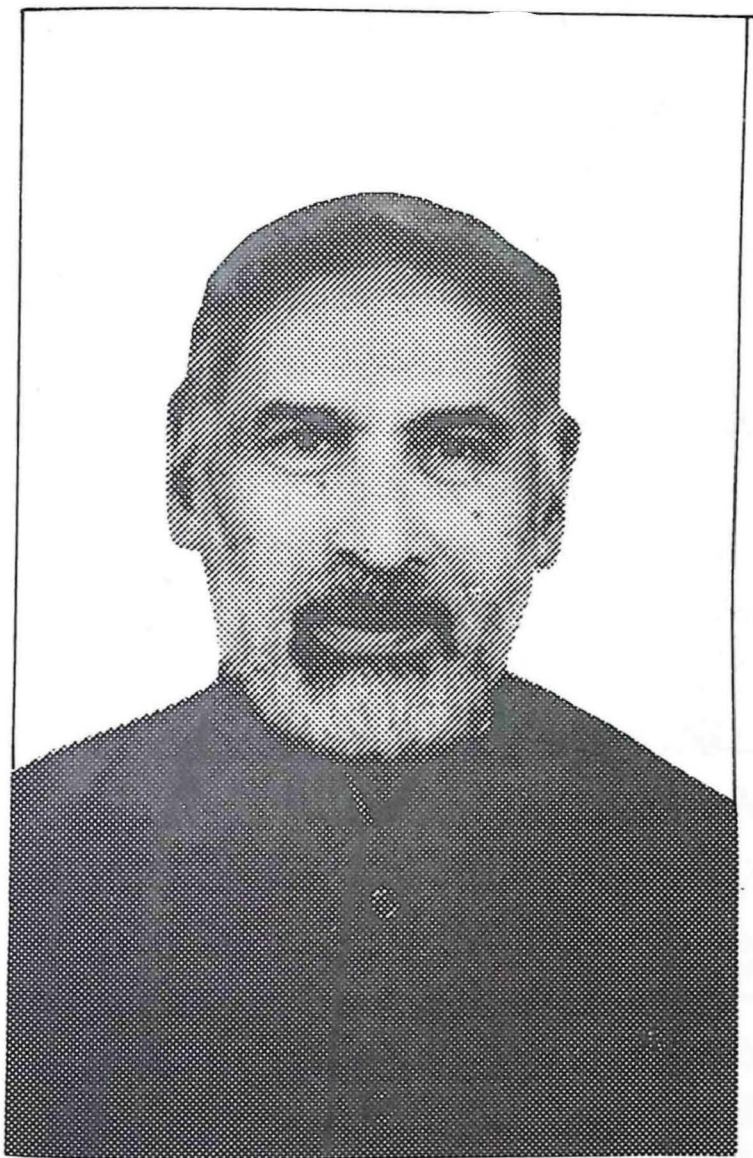
"بلند پایہ علمی شخصیت" جناب پیر صلاح الدّین جو جنرل ضیاء کی تنگ نظر آمریت کا شکار ہوئے۔

ہوا۔ اس واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ پیر صلاح الدین صاحب کا تعلّق مشرقی پنجاب سے ہے اور اب وہ اپنے خاندان سمیت راولپنڈی میں مقیم ہیں آپ ایک بلند پایہ علمی شخصیت کے مالک ہیں آپ نے ۱۹۴۰ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۴۱ء میں آپ کو آنریری مجسٹریٹ درجہ اوّل مقرر کیا گیا۔ بعدازاں آپ کو باقاعدہ صوبائی سول سروس میں شامل کر لیا گیا۔ آپ کے والد جناب نواب ممدوٹ کے دوست اور قانونی مشیر تھے اور ان کے توسّط سے آپ ملک امیر محمّد خان آف کالاباغ (سابق گورنر مغربی پاکستان) کے ساتھ گہرے روابط رکھتے تھے۔ تقسیمِ پاکستان سے قبل پیر صلاح الدین بسلسلۂ ملازمت تبدیل ہو کر مغربی پنجاب آ گئے اور کئی سال تک بحیثیت ڈپٹی کمشنر ضلع میانوالی تعینّات رہے۔ ۱۹۷۰ء میں پیر صاحب کو ملازمت سے ریٹائر کر دیا گیا۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ان کو دوبارہ طلب کر لیا گیا۔ آپ ۱۹۷۳ء میں مستقل طور پر ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔ اسی دوران آپ کے جسم کا بایاں حصّہ اور خاص طور پر بائیں ٹانگ اور بایاں بازو مفلوج ہو کر رہ گئے۔

پیر صلاح الدین صاحب بہت بڑے عالم اور فاضل شخص ہیں۔ آپ نے قرآن پاک کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور قرآن پاک کی سادہ اور سلیس اُردو زبان میں چار جلدوں پر مشتمل تفسیر بھی لکھی ہے وہ ان دنوں اس بوڑھاپے، بیماری اور کمزوری کے باوجود انگریزی زبان میں "ڈکشنری آف اسلام" لکھنے میں مصروف ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد پیر صاحب راولپنڈی فوجی کلب کے ممبر بن گئے۔ وہ لکھنے پڑھنے سے فارغ ہو کر زیادہ تر وقت اسی کلب میں گزارتے تھے۔ اس لیے پیر صاحب کے سابقہ اور موجودہ فوجی افسران کے ساتھ انتہائی گہرے اور دوستانہ مراسم استوار ہو گئے تھے۔ پیر صاحب

کے بڑے صاحبزادے نے راولپنڈی میں پیر ہوٹل کے نام سے ایک ہوٹل کھولا اور ایک شخص عبداللہ کو اس کا مینجر مقرر کر کے خود کینڈا چلے گئے۔ انہوں نے اب کینیڈا کی شہریت اختیار کر لی ہے اور مستقل طور پر وہیں مقیم ہیں۔

(۳) **پیر صلاح الدین کا خواب اور جنرل ضیاء** جون ۱۹۷۹ء میں پیر صلاح الدین نے خواب میں دیکھا کہ جنرل ضیاء الحق کو کسی شخص نے ریوالور سے فائر کر کے دو گولیاں ماردی ہیں۔ گولیاں لگتے ہی ضیاء الحق نے دم توڑ دیا۔ دوسرے دن پیر صاحب نے یہ خواب فوجی کلب میں اپنے دوست احباب کو سُنا دیا۔ پیر صاحب کو معلوم تھا کہ جنرل ضیاء الحق نے فوجی کلب کو خفیہ پولیس کی نگرانی میں دے رکھا ہے اور خفیہ پولیس کلب کے تمام ممبران کی نقل و حرکت اور بات چیت کی سخت نگرانی کرتی تھی۔ مگر بات چونکہ خواب کی تھی اس لیے انہوں نے اس کو کوئی خاص اہمیت دینا ضروری نہ سمجھا۔ چند دنوں کے بعد پیر صاحب کے قریبی دوست ریٹائرڈ بریگیڈئر اسفندر یار نے پیر صاحب کے خواب، کی تصدیق کرتے ہوئے انہیں بتایا کہ ضیاء الحق جیتے جی اقتدار نہیں چھوڑے گا۔ خواب کا قصہ تو چند دنوں بعد ختم ہوگیا البتہ ضیاء الحق کو اس خواب کی رپورٹ دے دی گئی۔

(۴) **پیر صلاح الدین کی گرفتاری** چنانچہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو پیر صلاح الدین کو مارشل لاء ریگولیشن نمبر ۲ کے تحت گرفتار کر کے تین ماہ کے لیے نظر بند کر دیا گیا۔ جب کہ پیر صاحب کیخلاف الزام یہ تھا کہ آپ کی سرگرمیاں ملکی سالمیت کیخلاف ہیں۔ ۲۲ اکتوبر کو پیر صاحب اور ان کے دوسرے صاحبزادے کو سمری ملٹری کورٹ میں پیش

کیا گیا اور آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ آپ نے پیر ہوٹل میں وسیع پیمانے پر بدکاری کا اڈہ قائم کر رکھا ہے۔ مقدمے کی سماعت کے دوران پولیس نے صرف ایک عورت کو بطورِ گواہ پیش کیا۔ اس عورت نے اپنے بیان میں بتایا کہ وہ اپنے شوہر اور کم عمر بچے کے ساتھ پیر ہوٹل میں قیام پذیر تھی۔ اسی قیام کے دوران اس کا شوہر بچے کی دوا لینے کے لیے بازار گیا تو کسی اجنبی شخص نے اس کے ساتھ زنا بالجبر کیا۔ اس عورت نے اپنے بیان میں تسلیم کیا کہ اس نے پیر صاحب اور ان کے فرزند کو گواہی دینے سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے نہ تو اسے ہوٹل میں ٹھہرایا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی برا کام کیا لیکن اس کے باوجود پیر صاحب اور ان کے صاحبزادے پر جرم ثابت کر کے انھیں قید کی سزا دے دی گئی۔ اسی دوران چند اخباری فوٹو گرافروں نے پیر صاحب کا فوٹو لینے کی کوشش کی۔ اس پر پیر صاحب نے اعتراض کیا۔ فوجی عدالت نے فوٹو گرافروں کی رپورٹ پر ایک دوسرا مقدمہ قائم کیا اور اس میں پیر صاحب کو صرف چالیس لاکھ روپے جرمانے کی سزا سنا دی گئی تھی۔

(۵) پیر صلاح الدین کی سرِ عام رسوائی اور ضیاء کی انا کی تسکین

۲۴ اکتوبر ۱۹۷۹ء کو پیر صاحب اور ان کے صاحبزادے کو ایک گراؤنڈ میں ہتھکڑی پہنا کر لایا گیا۔ یہاں پر ایک اسٹیج تیار کیا گیا تھا جس پر لاؤڈ اسپیکر بھی نصب تھا۔ یہاں شہر کے شرفاء اور عام پبلک کو تماشا دیکھنے کی دعوت دی گئی۔ پیر صاحب کے چہرے پر سیاہی مل کر انھیں لوگوں کے سامنے ذلیل اور رسوا کیا گیا۔ چونکہ ان کی عمر ۶۵ سال سے زیادہ تھی اس لیے ان کو کوڑوں کی سزا نہیں دی گئی۔ جبکہ آپ کے فرزند کو ننگا کر کے اس کی پشت پر پندرہ کوڑے

مارے گئے اور دونوں مجرموں کو جیل بھیجدیا گیا اور پیر ہوٹل کو ضبط کر لیا گیا۔

(۶) پیر صاحب پر معافی مانگنے کیلئے دباؤ اور انکا انکار

جیل جانے کے چند دنوں بعد پیر صاحب کے پاس ان کی بیوی اور داماد کو بھیجا گیا۔ آپ کے داماد ایک اعلیٰ فوجی افسر ہیں۔ ان دونوں نے پیر صاحب پر زور دیا کہ اگر وہ تحریری طور پر اپنے جرم کا اقبال کر کے معافی مانگ لیں تو ان کی سزا معاف کی جاسکتی ہے۔

(۷) پیر صاحب کے روشن ایمان کی دلیل

پیر صاحب نے اس تجویز کو سختی سے مسترد کر دیا اور جواب دیا کہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا اس لیے نہ تو وہ تحریری طور پر جرم کا اقبال کریں گے اور نہ ہی معافی مانگیں گے۔ آپ نے جواباً یہ بھی کہا کہ وہ اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر چکے ہیں اور خدا خود انصاف کر دے گا۔ بعد ازاں ان کی بیوی اور داماد نے جیل جا کر ان سے ملاقات کی اور انھیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ ہوٹل کی واپسی کے لیے ہی ایک تحریری درخواست دے دیں تو ہوٹل واپس مل جائے گا مگر پیر صاحب نے اس قسم کی کوئی درخواست دینے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ تاہم ان کے اصرار پر پیر صاحب نے حسبِ ذیل تحریر لکھ کر ان کے حوالے کر دی۔

"جو جائیداد اللہ تعالےٰ کے حکم سے مجھ سے چھین لی گئی ہے میں اس کی واپسی کے لیے شیطان کو درخواست نہیں دوں گا۔"

(۸) پیر صاحب کی سزا کیخلاف اپیلیں اور انکا اختیاراتِ قانون کو چیلنج

تاہم پیر صاحب نے پنجاب کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کے

نام اپنی سزایابی کیخلاف اپیلیں داخل کی تھیں۔ ان اپیلوں میں مقدمے کے واقعات کے علاوہ اہم نکتہ یہ اٹھایا گیا تھا کہ کس قانون کے تحت ان کا منہ کالا کر کے مجمعٔ عام میں ذلیل و رسوا کرنے کی سزا دی گئی تھی۔ پیر صاحب کا یہ دعویٰ بالکل جائز اور درست تھا اس لیے کہ یہ سزا ملک میں کسی بھی رائج الوقت قانون یعنی:۔

(i) تعزیراتِ پاکستان

(ii) مارشل لاء قوانین اور

(iii) اسلامی قوانین کی رُو سے جائز نہیں تھی۔ لہٰذا یہ سزا محض ذاتی انتقام کی تسکین ہی کے لیے اور پیر صاحب کو جان بوجھ کر رسوا کرنے کے لیے دی گئی تھی۔ مارشل لاء حکام اور جنرل ضیاء الحق کے پاس اس الزام کا سرے سے کوئی جواب ہی نہیں تھا اس لیے ضیاء الحق نے ان کی اپیل پر مرتے دم تک کوئی فیصلہ نہیں کیا البتہ پیر صاحب اور ان کے صاحبزادے کو رہا کر دیا گیا اور ضبط شدہ ہوٹل بھی واپس دے دیا گیا۔

(۹) جنرل ضیاء الحق اور پیر صلاح الدین کی قوّتِ ایمانی کا فرق مندرجہ بالا واقعہ سے

اس نام نہاد مردِ مومن مردِ حق اور ایک مجرم کی قوّتِ ایمانی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامّل تھا کہ زندگی اور موت صرف اللہ تبارک تعالےٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس کی زندگی ہے تو کسی کے خواب دیکھنے سے وہ مر نہیں سکتا اور اگر اس کی موت کا وقت آپہنچا ہے تو دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی اُسے بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کے برعکس اس بوڑھے مجرم کی

قوتِ ایمانی کا عالم یہ ہے کہ اس نے جرم کا اقبال کرتے اور اپنی سزا معاف کرانے یا ہوٹل کی واپسی کے لیے ضیاء الحق کی طرف رجوع کرنے سے صریحًا انکار کر دیا اور اپنے انصاف کا معاملہ اللہ تعالٰے کے سپرد کر دیا۔ پیر صاحب کا ایمان تھا کہ اللہ تعالٰے ضرور انصاف کرے گا اور اللہ تعالٰے نے انصاف کر ہی دیا۔ اس واقعہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ "اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں"

(۱۱) کینیڈا کی حکومت کا پیر صاحب کو شہریت دینے سے انکار

اس مقدمے کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ پیر صاحب کے صاحبزادے نے اپنے والد کو کینیڈا کی شہریت دلانے کے لیے کینیڈا کے سفارتخانے میں درخواست دی۔ اور کینیڈا کے حکام نے یہ درخواست اسی بناء پر مسترد کر دی کہ پیر صاحب سابقہ سزا یافتہ مجرم ہیں اور کینیڈا کا قانون سزا یافتہ اشخاص کو حقوقِ شہریت نہیں دیتا۔ پیر صاحب کو انکار مبارک سے بہت دکھ ہوا۔ آپ بذاتِ خود متعلقہ حکام کے پاس گئے اور ایک تحریری درخواست دی کہ ان کی سزا یابی کے متعلق حکومتِ پاکستان سے تصدیق کرائی جائے اگر حکومت پاکستان لکھ کر بھیج دے کہ پیر صاحب واقعی سزا یافتہ ہیں تو وہ اپنی درخواست واپس لے لیں گے بصورتِ دیگر انھیں کینیڈا کی شہریت دے دی جائے۔ چنانچہ سفارتخانے کے حکام نے پیر صاحب کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے حکومتِ پاکستان سے رجوع کیا لیکن حکومتِ پاکستان نے سزا یابی کی تصدیق سے گریز کیا اور اس طرح پیر صاحب کو کینیڈا کی شہریت مل گئی۔ جس کے باعث اب پیر صاحب کینیڈا کے شہری ہیں۔

نواب نبی بخش بھٹو موہنجوڈرو کے ایئرپورٹ پر بے نظیر بھٹو کو تسلی دے رہے ہیں۔

تدفین کے بعد شاہنواز بھٹو کی قبر پر قرآن خوانی کی جارہی ہے۔

(۱) بھٹو خاندان پر عتاب

جناب ذوالفقار علی بھٹو کو اقتدار سے محروم کرنے کے بعد ضیاء الحق نے جناب بھٹو اور ان کے خاندان کو تختۂ مشق بنانا شروع کر دیا۔ آپ کی بیوہ بیگم نصرت بھٹو اور صاحبزادی محترمہ بینظیر بھٹو کو بغیر مقدمہ چلائے طویل عرصے تک نظر بند رکھا گیا۔ یہ نظر بندی قیدِ تنہائی اور جیلوں کی اذیت پر مبنی تھی۔ اور بالآخر ان دونوں خواتین کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دونوں صاحبزادوں شاہنواز بھٹو اور مرتضےٰ بھٹو کو بھی وطنِ عزیز کی فضاؤں میں سانس لینے سے روک کر وطن چھوڑنے پر بالجبر مجبور کیا گیا۔ وہ دیارِ غیر میں اپنی جان بچانے کے لیے مختلف ممالک میں پناہ لیتے رہے لیکن اس کے باوجود جناب بھٹو کے چھوٹے صاحبزادے شاہنواز بھٹو کو فرانس میں قتل کرا دیا گیا۔ بقولِ مرزا غالبؔ :۔

ع مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھ لی میرے خدا نے میری بے کسی کی شرم

خدائے بزرگ و برتر نے اس نوجوان کی بے کسی کی شرم رکھ لی ورنہ یہ عین ممکن تھا کہ اگر وہ پاکستان میں ہوتا تو کسی تنگ و تاریک قید خانے میں ہی سسک سسک کر دم توڑ دیتا۔ جب کہ آپ کے بڑے صاحبزادے مرتضےٰ بھٹو بدستور دَر دَر کی خاک چھانتے پھر رہے ہیں کیونکہ انھیں اتنے فوجداری مقدمات میں ماخوذ کر رکھا ہے کہ ان کا بحفاظت وطنِ عزیز آجانا ممکن ہی نہیں رہا۔ یہ تو تھا مختصر حال ان واقعات و حالات کا جن سے جناب ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے خاندان کو جنرل ضیاء الحق اور نام نہاد مردِ مومن مردِ حق نے دوچار کیے رکھا اور اپنے جذبۂ انتقام کے ساتھ ساتھ انانیت و اقتدار پسندی

شاہنواز بھٹوؔ۔ تفکرات کے دھویں اڑاتا چلا گیا۔
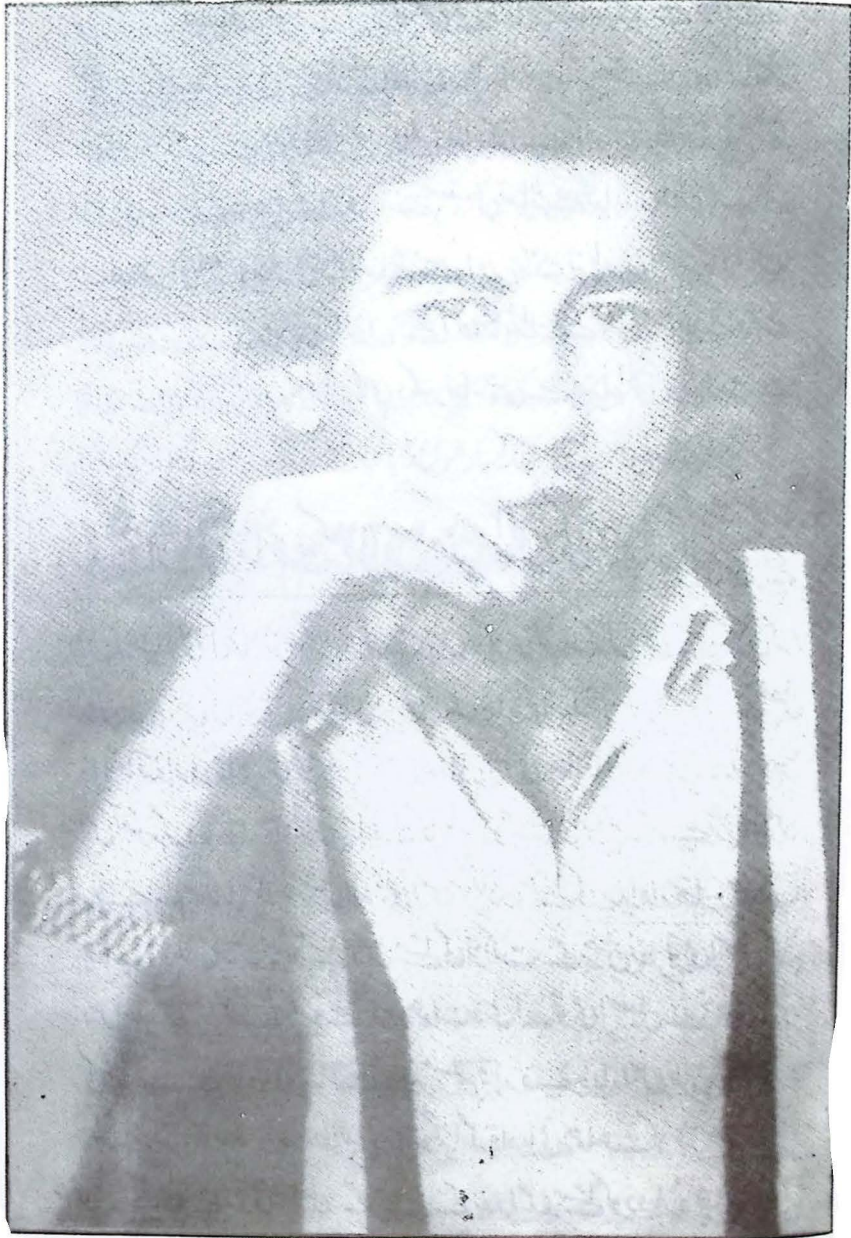
کی تسکین کی خاطر ہر لمحے نت نئی چالوں سے وہ کام لیتے رہے۔ لیکن شاید وہ اللہ کے انصاف اور بے آواز لاٹھی کو قطعاً بھول بیٹھے تھے کہ اقتدار کبھی ہمیشہ کسی کے پاس نہیں رہنا اور نہ ہی انسان ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہ کر اپنی طاقت و اقتدار سے مخلوقِ خدا پر مظالم ڈھا سکتا ہے۔ آفرین ہے جناب بھٹو اور ان کے افرادِ خانہ پر کہ انہوں نے مسلسل ساڑھے گیارہ سال تک یہ مظالم انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ سہے اور ہمت نہ ہاری، صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اور پھر اپنی آنکھوں سے اس خاندان کے باقی بچ جانے والے افراد نے ان کا عبرتناک انجام بھی دیکھ لیا۔ جس سے ضیاء الحق کو قدرت نے دوچار کیا تھا۔

(۱۲) قادیانی جماعت کیخلاف ضیاء الحق کی مہم

ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں کہ ضیاء الحق کی تمام تر سرگرمیاں صرف اس مرکزی محور کے گرد ہی رہتی تھیں کہ کس طرح اس کی آمریت کو محفوظ اور طویل بنایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے محض ذاتی اقتدار کی خاطر ہی قوم کو مختلف لسانی، نسلی، علاقائی اور فرقہ وارانہ گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ قادیانی جماعت کا مسئلہ پاکستانی عوام کے لیے بڑا حساس رہا ہے۔ لاہور کا پہلا مارشل لاء بھی اسی سنگین مسئلے کی پیداوار تھا۔ جبکہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اس مسئلے کی نزاکت کے پیشِ نظر قومی اسمبلی کو اس معاملے پر بحث و مباحثے کی دعوت دی اور قومی اسمبلی نے خصوصی کمیٹی کی حیثیت سے قادیانی جماعت کو غیر مسلم قرار دے دیا۔ اس طرح قوم اور علمائے کرام کا یہ دیرینہ مطالبہ پورا ہو گیا کہ قادیانی جماعت کو غیر مسلم قرار دے دیا جائے۔ قومی اسمبلی کے فیصلے کے بعد اس مسئلے کو دوبارہ چھیڑنے کی

قطعاً کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن جنرل ضیاء الحق کی یہ سیاسی ضرورت تھی کہ وہ اپنے مردِ مومن مردِ حق ہونے کا ثبوت فراہم کرے۔ چنانچہ اب ان کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ پہلا یہ کہ وہ اچھے اور نیک کام کرکے نیکی پھیلاتے جبکہ دوسرا یہ کہ وہ آمرانہ اور ظالمانہ اقدامات سے بزعم خویش برائی کے راستے روکتے۔ ضیاء الحق کی بدنصیبی یہ تھی کہ دنیا کا کوئی نیک عمل ان کے مقدّر میں تھا ہی نہیں جس کا تعلق خصوصاً مخلوقِ خدا اور انسان دوستی سے ہو۔

ضیاء الحق نے محض قادیانی جماعت کو ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے لیے کئی قوانین میں ترامیم کر دیں۔ جن کا واضح مقصد اس کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا کہ مذہبی منافرت پھیلا کر اپنے اقتدار کو طول دیا جائے۔

(ا) مسلمان کی تعریف اور آئین میں ترامیم

ضیاء الحق نے آئین کے آرٹیکل نمبر ۲۶ میں ترمیم کرکے مُسلم اور غیر مسلم کی تعریف اس طرح کی:۔

(۱) مُسلم :۔ جو شخص اللہ کی وحدانیت اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت پر ایمان رکھتا ہو۔ آپؐ کو آخری نبیؐ مانتا ہو اور آپؐ کے علاوہ کسی بھی شخص کو نبی یا مصلح تسلیم نہ کرتا ہو، وہ مسلم ہے۔

(ب) غیر مُسلم :۔ جو شخص مسلم نہ ہو یا جس کا تعلّق عیسائی یا ہندو، سکھ، بدھ یا پارسی فرقوں سے ہو، وہ غیر مسلم ہے۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ قادیانی جماعت کو غیر مسلم بنانا خاصا مشکل کام تھا اس لیے کہ مسلمان کی تعریف تو صرف یہ تھی کہ جو شخص توحید و رسالت پر ایمان لے آئے وہ مسلمان ہے۔ یعنی جو شخص بھی کلمۂ طیبّہ پڑھ لے اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ اپنی زبان سے ادا کر دے وہ مسلمان

ہو جاتا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے جن باتوں پر ایمان لانا ضروری تھا ان میں توحید، رسالت، فرشتوں، آسمانی کتابوں، خیر و شر کا اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہونا اور حیات بعد الموت شامل ہیں۔ قادیانی جماعت ان جملہ باتوں پر ایمان رکھتی ہے البتہ وہ ختم نبوّت کی قائل نہیں، اس لیے ضیاء الحق نے قادیانی جماعت کو اسلام سے خارج کرنے کے لیے لفظِ مسلم اور غیر مُسلم کے مندرجہ بالا معنی متعیّن کئے۔ مگر اس مسئلے پر دلچسپ صورتحال اس وقت سامنے آئی جب ۱۹۵۳ء میں فسادات پنجاب کے سلسلے میں تحقیقاتی عدالت نے پاکستان کے نو جیّد علماء کرام جن میں مولانا ابوالحسنات محمّد احمد قادری صدر جمعیۃ العلمائے پاکستان، مولانا احمد علی صدر جمعیت العلمائے اسلام مغربی پاکستان، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب امیرِ جماعت اسلامی پاکستان، غازی سراج الدین منیر صاحب، مفتی محمّد ادریس صاحب جامعہ اشرفیہ نیلا گنبد، حافظ کفایت حسین صاحب ادارہ تحفّظ حقوق شیعہ، مولانا عبدالحامد بدایونی صدر جمعیت العلمائے پاکستان، مولانا محمّد علی کاندھلوی دارالشہابیہ سیالکوٹ، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے پوچھا کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے۔؟

(ا) مسلمان کی تعریف پر جیّد علماء اور عدالتِ عالیہ کا نقطۂ نظر

چنانچہ ان تمام حضرات کی طرف سے جوابات سننے پر عدالتِ عالیہ نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ "ان متعدّد تعریفوں کو جو علماء نے پیش کی ہیں، پیشِ نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی کوئی ضرورت ہے۔ بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنی طرف سے "مسلمان" کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالم دین کی ہے اور وہ تعریف ان تعریفوں سے مختلف ہو جو

دوسروں نے پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا جائے گا اور اگر ہم علماء میں سے کسی کی تعریف کو اختیار کر لیں تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علماء کی تعریف کی رُو سے کافر ہو جائیں گے۔"

(بحوالہ رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء)

"مسلمان کی تعریف" کے ہی سلسلہ میں جناب ارشاد احمد حقانی صاحب ایک خط کا ذکر کرتے ہوئے اپنے کالم روزنامہ جنگ لاہور مورخہ ۷ فروری ۱۹۸۴ء میں تحریر کرتے ہیں کہ :۔

مجھے یاد ہے کہ لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس ایم۔ آر۔ کیانی نے علماء سے مسلمان کی تعریف دریافت کی تو علماء نے آپس میں مشورہ کے بعد کہا تھا کہ "ہمیں اس کے لیے کچھ مہلت دیجیئے" تو جسٹس موصوف نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ: "آپ کو ڈیڑھ ہزار سال کی مہلت مل چکی ہے اس سے زیادہ کی مہلت دینا اس عدالت کے اختیار میں نہیں۔"

اگر دیکھا جائے تو جو کچھ اس ایک فقرہ میں کہہ دیا گیا ہے، اسے ضخیم کتاب میں بھی اس خوبصورتی سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال ضیاء الحق نے مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کا کام خاصا آسان کر دیا ہے۔ مسلمان ہونے کے لیے صرف توحید، رسالت اور ختم نبوّت پر ایمان لانا کافی ہے، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور خاص طور پر حیات بعد الموت پر ایمان لانا ضروری نہیں رہا۔ آج کل سائنسی دنیا میں حیات بعد الموت کا مسئلہ خاصا پیچیدہ ہے دلائل اور براہین سے حیات بعد الموت کو ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصے پہلے پاکستان ٹی، وی پر میرے فاضل دوست

جناب خالد اسحاق ایڈوکیٹ نے آئندہ زندگی کے اثبات میں ایک انتہائی پھسپھسی تقریر کی تھی۔ اس تقریر کے چند روز بعد مجھے آپ سے سندھ ہائی کورٹ بلڈنگ میں ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے ان کے سامنے اپنی الجھن کا اظہار کیا اور یہ بھی بتایا کہ آئندہ زندگی کا تعلق ہمارے عقیدے اور ایمان سے ہے لہٰذا ہمیں اس مسئلے کو من وعن اور بغیر کسی دلیل کے تسلیم کرنا ہے۔ ویسے بھی منطقی انداز سے یہ دعویٰ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ برصغیر کے نامور مفکر مرزا اسد اللہ خان غالبؔ نے ایک عام فہم تمثیل کے ذریعے حیات بعد الموت کے امکان کو سمجھانے کی کامیاب کوشش اپنے اس درج ذیل شعر میں انتہائی خوبصورت انداز میں کی ہے۔

؎ بیضا آسا ننگ بال و پر ہے یہ کنج قفس
از سر نو زندگی ہو گر رہا ہو جایئے

میرے مندرجہ بالا مکالمے پر جناب خالد اسحاق صاحب نے صرف اتنا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی کہ انہیں شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں اس لیے کہ انہوں نے مرزا غالبؔ کا یہ شعر کبھی پڑھا ہی نہیں۔ بہرحال جنرل ضیاء الحق نے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کر دیا ہے تاہم میں علمائے کرام سے ... در دریافت کروں گا کہ ضیاء الحق کا یہ فعل بدعت کی تعریف میں آتا ہے کہ نہیں؟

(iii) تعزیراتِ پاکستان میں ترمیم جنرل ضیاء الحق نے ۱۸/ستمبر ۱۹۸۰ء کو تعزیراتِ پاکستان میں ترمیم کر کے دفعہ ۲۹۸ الف کا اضافہ کر دیا۔ اس قانون کے مطابق جو کوئی شخص تحریری، تقریری یا کسی بھی طرح سے کسی اُم المومنین، اہلبیت یا خلفائے راشدین میں سے کسی بھی خلیفہ یا صحابۂ کرام کی توہین کرے تو اس کو تین سال

قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکتی ہیں۔

اسی طرح ۲۶ اپریل ۱۹۸۴ء کو جنرل ضیاء الحق نے تعزیراتِ پاکستان میں مزید ترمیم کر کے تعزیرات میں دفعات ۲۹۸-ب اور ۲۹۸ ج کا اضافہ کر دیا۔

(۱) دفعہ ۲۹۸ ب :۔ اگر قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ کا کوئی بھی شخص (جو اپنے آپ کو احمدی کہلواتا ہو یا اس کا کوئی اور نام ہو) تحریری، تقریری یا کسی اور طرح سے۔

(الف) کسی شخص کو خلفائے راشدین یا صحابۂ کرام کے علاوہ خلیفۃ المسلمین، خلیفۃ المومنین، صحابی یا رضی اللہ عنہ، کے الفاظ سے خطاب کرے۔

(ب) ازدواجِ مطہرات کے علاوہ کسی خاتون کو اُم المومنین کے الفاظ سے پکارے۔

(ج) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلبیت کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو اہلبیت کہے۔

(د) اپنی عبادت گاہ کو مسجد کہے تو اس کو تین سال کی سزائے قید دی جاسکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(۲) اگر قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ کا کوئی شخص عبادت کی خاطر بلانے کے لیے اذان دیتا ہے یا اس طرح طلب کرنے کو اذان کہتا ہے تو اس کو تین سال تک سزا دی جاسکتی ہے اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(۳) دفعہ ۲۹۸-ج :۔ اگر قادیانی گروپ یا لاہوری گروپ کا کوئی فرد (جو اپنے آپ کو احمدی کہلواتا ہو یا کسی دوسرے نام سے یاد کیا جاتا ہو) اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو اور اپنے مذہب کو اسلام کا نام دیتا ہو یا اپنے عقائد کی اس طرح تبلیغ کرتا ہو کہ جس سے عام مسلمانوں کے عقائد مجروح

ہوتے ہوں تو اس کو تین سال قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کا بھی مستوجب ہوگا۔

(۴) پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس میں ترمیم

۲۶ر اپریل ۱۹۸۴ء کو جنرل ضیاء الحق نے پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کی دفعہ ۲۴ میں ایک ذیلی دفعہ کا اضافہ کر کے قادیانی جماعت کے لٹریچر کی اشاعت پر پابندی لگادی۔

(۵) قادیانی جماعت کیخلاف عملی کاروائی

ضیاء الحق نے قادیانی جماعت کے خلاف قوانین تو بے شک نافذ کر دیئے تھے لیکن عملاً اس کی کاروائیوں کا مرکز اور محور غیر قانونی سرگرمیوں تک محدود رہا۔ ان کاروائیوں میں مساجد کا گرانا، کلمۂ طیبّہ کا مٹانا اور قادیانی جماعت کے سرکردہ افراد کا قتل شامل تھا۔

ضیاء الحق پاکستان کی حکومت کے سربراہ تھے۔ ایک مسلمان مملکت کے حکمران کی حیثیت سے اس ملک کے عوام کی جان و مال اور عزّت و آبرو کی حفاظت کرنا ان کی قانونی، اخلاقی، آئینی اور مذہبی ذمّہ داری تھی۔ نیز ان کا فرض تھا کہ وہ اس ملک کے تمام شہریوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، کیساتھ انصاف کرتے اور ان کے حقوق کی حفاظت بھی ان کی ذمّہ داری تھی۔ اسلامی تعلیمات میں ایسا کوئی حکم نہیں ملتا جس کے مطابق غیر مسلم آبادی کو زندہ رہنے کے حق سے محروم کر دیا جائے یا ان کو اپنی مذہبی عبادت یا رسومات ادا کرنے سے روک دیا جائے۔ اس کے برعکس اسلام مذہبی رواداری اور آزادی کی تعلیم دیتا ہے نیز غیر مسلم آبادی کو تحفّظ دینے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن پاک کی سورۂ بقرہ میں ارشادِ ربّانی ہے کہ :۔

"یہ پیری یہ اسیری"

جنرل ضیاء الحق کی مذہبی تنگ نظری کا شکار، جناب خان محمد صاحب امیر ڈیرہ غازی خان۔

ترجمہ:۔ " دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں"

(۶) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت کے جواب میں عیسائیوں کے ایک وفد نے حضور صلعم کے ساتھ ملاقات میں آپ سے پناہ دینے کی درخواست کی اور جزیہ دینے کا وعدہ کیا۔ رسولِ اکرمؐ نے عیسائیوں کی درخواست منظور کرلی اور عیسائیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

" نجران والوں کو خدا اور محمدؐ رسول اللہ کی حفاظت حاصل ہوگی اور مذہب زمین اور جائیداد کے متعلق ان سب کو جو حاضر ہیں یا غائب ہیں، صاحبِ قبیلہ ہیں یا اتباع کرنے والے ہیں ان کی حالت اور حقوق میں کوئی تغیّر نہ کیا جائے گا اور جو کچھ کم یا زیادہ ان کے قبضہ میں ہے اسے نہیں بدلا جائے گا۔ پچھلے زمانے کی شہادت یا قتل کے تنازعات کے باعث ان پر مقدمات نہیں چلائے جائیں گے نہ وہ بیگار میں پکڑے جائیں گے۔ نہ ہی ان کے علاقے سے فوج گزرے گی۔"

جب یہ وفد واپس جانے لگا تو اس نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے پھر ایک سند حاصل کی جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

"یہ تحریر محمدؐ نبی صلعم کی جانب سے ہے۔ اسقف ابوالحارث کے لیے نجران کے دیگر اسقفوں، کاہنوں، راہبوں، ان کے معتقدوں، غلاموں، اس مذہب والوں پولیس والوں کے متعلق اور ان کم یا زیادہ چیزوں کے متعلق جو ان کے ہاتھ میں ہیں سب کو خدا اور رسولؐ کی حفاظت حاصل ہوگی۔ گرجا کے چھوٹے

"ہائے یہ بھی کرنا تھا مجھے"

قانون کا محافظ کلمہ طیبہ مٹاتے ہوئے، احمدیہ مسجد سر شمیر روڈ فیصل آباد

"خانۂ خدا کی مسماری کی ایک جھلک"

احمدیہ مسجد مردان مکمل طور پر تباہ کر دی گئی۔

بڑے عہدیداروں میں سے کسی کو بدلا نہیں جائے گا۔ کسی کے حق میں یا اختیارات میں مداخلت نہ کی جائے گی۔ ان کی موجودہ حالت میں تغیّر نہ ہو گا بشرطیکہ رعایا کے خیر خواہ اور خیر اندیش رہیں۔ نہ ظالم کا ساتھ دیں اور نہ خود ظلم کریں۔"

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے غیر مسلم آبادی کے تحفّظ کی عملی مثال دیگر مسلم جماعت کو ابد تک سمجھا دیا کہ اولادِ آدم علیہ السّلام کا احترام مسلم جماعت کا بنیادی اصول ہے۔ کسی شخص یا جماعت کو محض اس بنیاد پر ذلیل و خوار یا پریشان نہیں کیا جائے گا کہ اس کے مذہبی عقائد مسلمانوں کے عقائد سے مختلف ہیں لیکن ہر زمانے کے مفاد پرستوں اور طالع آزماؤں نے اپنے مفاد کی خاطر اسلام کے سنہرے اصولوں کو پسِ پشت ڈالنے کی کوششیں کی ہیں۔

(ے) مساجد کی مسماری

قادیانی جماعت کی بہت سی مساجد کو یا تو مسمار کر دیا گیا یا پھر سر بمہر کر دیا گیا۔ ۷ اراگست ۱۹۸۶ء کو قادیانی جماعت کے افراد نمازِ عید ادا کرنے کے لیے مردان کی عید گاہ میں جمع ہوئے۔ پولیس نے تمام افراد کو نمازِ عید پڑھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا اور عید گاہ کو مسمار کر دیا گیا۔ اسی طرح راہوالی، بھکّر، ملتان، گوجرانوالہ اور جھنگ میں قادیانی جماعت کی مساجد کو آگ لگا کر گرا دیا گیا مگر حکومت کی طرف سے مجرموں کیخلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ جبکہ بعض مقامات پر مقامی حکّام کے احکامات کے تحت انکی موجودگی میں کلمۂ طیبّہ کو کھرچ کر مٹا دیا گیا۔ مثال کے طور پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کوئٹہ اور سب ڈویژنل مجسٹریٹ راولپنڈی کے حکم پر قادیانی جماعت کی مساجد سے کلمۂ طیبّہ مٹا دیا گیا۔ اس کے علاوہ کوئٹہ، ساہیوال، گجرات اور دیگر مقامات پر مقامی حکّام کے احکامات کے تحت قادیانی جماعت کی مساجد کو سر بمہر کر دیا گیا۔

کاش !! کوئی جُرم ہم نے بھی کیا ہوتا۔؟

جناب ڈاکٹر عبدالقادر کا بلاجُرم قتل ۱۵؍جون ۱۹۸۴ء فیصل آباد (پنجاب)

جناب پروفیسر عقیل بن عبدالقادر ۹؍جون ۱۹۸۵ء بمقام حیدرآباد سندھ مذہبی منافرت کا شکار ہوئے۔

(۸) بلا جرم قتل قادیانی جماعت کے بہت سے افراد کو بغیر کسی جُرم یا گناہ کے کھلے مقامات پر دن دہاڑے قتل کر دیا گیا لیکن حکومت کی طرف سے مجرموں کو گرفتار کرنے یا فرار واقعی سزا دینے کے لیے قانونی مشینری کو خاموش کر دیا گیا۔ قتل ہونے والوں میں بعض افراد بڑی اہمیّت کے حامل تھے جن میں سے حسبِ ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

(i) پروفیسر عقیل بن عبدالقادر:۔ آپ امراضِ چشم کے ماہر ڈاکٹر اور لیاقت میڈیکل کالج میں شعبۂ امراضِ چشم کے سربراہ تھے آپ کو ۱۹؍جون ۱۹۸۵ء کو حیدرآباد میں قتل کر دیا گیا۔

(ii) ڈاکٹر عبدالقادر:۔ آپ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے سینئر ممبر تھے۔ اور فیصل آباد میں پریکٹس کرتے تھے۔ آپ کو ۱۵؍جون ۱۹۸۴ء کو فیصل آباد میں اپنے گھر میں قتل کر دیا گیا۔

(iii) عبدالحکیم ایڈو:۔ آپ وارہ ضلع لاڑکانہ میں اسکول ٹیچر تھے اور چھ معصوم بچّوں کے باپ اور سرپرست تھے آپ کو ۱۶؍اپریل ۱۹۸۳ء کو رات کے وقت سوتے ہوئے قتل کر دیا گیا لیکن پولیس نے کوئی کاروائی نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس قادیانی جماعت کے بہت سے افراد کے خلاف کلمۂ طیّبہ پڑھنے یا نماز پڑھنے کے جُرم میں مقدمات قائم کر کے انہیں سزائیں دی گئیں۔ ایک وہ زمانہ تھا جب مسلمان کلمۂ طیّبہ کی تبلیغ اور صوم وصلوٰۃ کے قیام کے لیے دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئے تھے۔ اور ایک دن یہ ہے کہ اگر کوئی قادیانی صدقِ دل سے بھی کلمۂ طیّبہ پڑھنا چاہے تو نہیں پڑھ سکتا۔ کیونکہ اس کے لیے کلمۂ طیّبہ پڑھنے پر پابندی ہے۔ بلکہ ایسا کرنا تعزیری جرم بھی ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا کوئی بچّہ سنِ بلوغ کو پہنچ کر قادیانی مسلک کو چھوڑنا بھی چاہے تو وہ ایسا نہیں کر

"جرم تو بتایا ہوتا میرا"
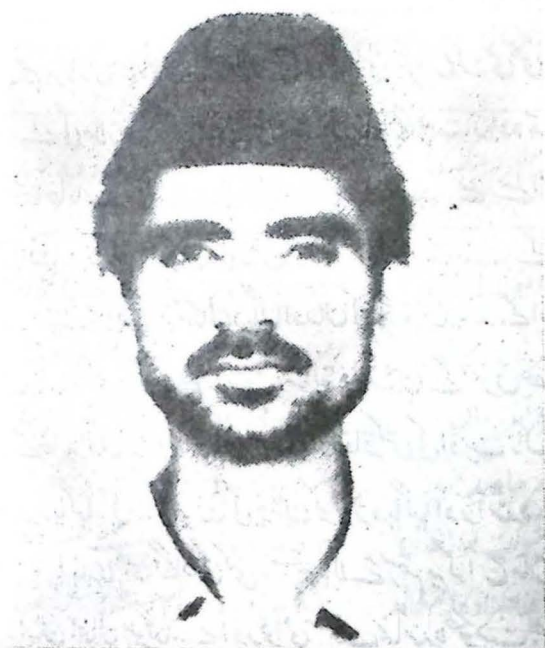
جناب عبدالکریم ابڑو (مدرس) صدر لوکل احمدیہ کمیٹی ۱۶؍اپریل ۱۹۸۳ء
بمقام وارہ ضلع لاڑکانہ سندھ سوتے ہوئے قتل کیا گیا۔

سکتا کیونکہ اسے قادیانی جماعت کے ساتھ منسلک رہنے پر قانوناً مجبور کر دیا گیا ہے۔ ضیاء الحق نے اس کارروائی سے قوم کے اندر مستقل طور پر نفرت و حقارت کو فروغ دینے کے لیے اپنا فریضہ انجام دیدیا ہے۔

(۹) سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں ناانصافی

جنرل ضیاء الحق نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے ملازمین کی چھانٹی شروع کر دی تھی۔ پاکستان میں پی۔آئی۔اے کی ملازمت کو بعض وجوہات کی بناء پر بہت زیادہ ہی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے سب سے پہلے اسی ادارے کو اپنے ستم کا نشانہ بنایا۔ ہزاروں ملازمین کو مارشل لاء احکامات کے ذریعے ملازمت سے دیکھتے ہی دیکھتے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ اپنی پسند کے افراد کو بھرتی کر لیا گیا۔ اس ناروا ظلم و ستم سے نہ صرف سابقہ ملازمین کے حقوق غصب کر لیے گئے بلکہ ان کے خاندانوں کو بھی انتہائی کسمپرسی اور فاقہ کشی کی اذیت ناک صورتحال سے دوچار کر دیا گیا۔ پی۔آئی۔اے کی یونین کو توڑ دیا گیا اور آئندہ کے لیے اس کی تشکیل پر پابندی بھی لگادی گئی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ آج مارشل لاء ختم ہو چکا ہے۔ آئین بحال ہو گیا ہے اور عوامی منتخب نمائندہ حکومت بھی برسرِاقتدار آچکی ہے مگر پی۔آئی۔اے کے ملازمین کی حق تلفی بدستور جاری ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے وزیرِاعظم محمد خان جونیجو نے قومی اسمبلی سے آئین کا آٹھواں ترمیمی ایکٹ منظور کرا کر ضیاء الحق کے سیاہ کارناموں کو آئینی تحفظ فراہم کر دیا ہے۔ جب تک یہ قانون موجود ہے نہ تو پی۔آئی۔اے کے ملازمین اپنے حق کے لیے کوئی یونین بنا سکتے ہیں اور نہ ہی برطرف شدہ افراد اپنی اپنی ملازمتوں کی بحالی کی امید کر سکتے ہیں۔

(۱۰) سول ملازمتوں پر حملہ

ضیاء الحق نے سرکاری ملازمتوں میں بھی اس قسم کی ناانصافیوں کے عمل کو دہرانے میں کوئی جھجک محسوس نہ کی۔ اعلیٰ سول سروس کے افسران کی سینیارٹی اور ترقی کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے فوج کے اعلیٰ افسران کو سول سروس میں کھپانا شروع کر دیا۔ حالانکہ اس کارروائی کا کوئی اخلاقی، آئینی یا قانونی جواز نہیں تھا۔ اس قسم کے تبادلوں کی ایک مختصر سی فہرست درجِ ذیل ملاحظہ فرمائیے:۔

سیریل نمبر	نام اور رینک	ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ میں شمولیت	موجودہ عہدہ
۱۔	میجر افتخار علی شاہ	۸۲-۶-۸	او۔ایس۔ڈی حکومتِ سرحد
۲۔	میجر ندیم منظور	۸۲-۶-۱	ڈپٹی کمشنر ایبٹ آباد
۳۔	میجر قمر زمان	۸۲-۶ ۱	ڈپٹی کمشنر کوہاٹ
۴۔	میجر جاوید مجید	۸۳-۶-۱	اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ کوہاٹ
۵۔	میجر شوکت نواز خان	۸۳-۶-۱	اسسٹنٹ کمشنر ملتان
۶۔	میجر صاحبزادہ ایم خالد	۸۳-۶-۱	اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ زیریں مہمند سرحد
۷۔	میجر اقبال احمد	۸۳-۶-۲۸	اسسٹنٹ کمشنر سکرنڈ
۸۔	میجر محمد نسیم	۸۴-۷-۱۰	اسسٹنٹ کمشنر جہلم
۹۔	میجر پرنس عباس خان	۸۴-۷-۱۰	اسسٹنٹ کمشنر سوات
۱۰۔	میجر ہارون رشید	۸۴-۱۱-۱۸	اسسٹنٹ کمشنر حکومتِ بلوچستان
۱۱۔	فلائٹ لیفٹیننٹ جاوید اقبال	۸۰-۳-۸	ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر ملتان
۱۲۔	کیپٹن ظفر سلیم	۸۰-۳-۸	اسسٹنٹ کمشنر میرپور ماتھیلو

سیریل نمبر	نام اور رینک	ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ میں شمولیت	موجودہ عہدہ
۱۳۔	لیفٹیننٹ محمدؐ عباسی	۸۰-۳-۱۰	ڈائریکٹر لوکل باڈیز ڈیرہ غازی خان
۱۴۔	کیپٹن جاوید عشرت	۸۰-۳-۸	ڈپٹی سیکریٹری انڈسٹریز حکومت بلوچستان
۱۵۔	کیپٹن غلام دستگیر اختر	۸۰-۳-۸	ڈپٹی سیکریٹری پلاننگ ڈویلپمنٹ حکومت سرحد
۱۶۔	میجر عطا اللہ خان	۸۵-۷-۲۱	زیرِ تربیت سی۔ ایس۔ اے لاہور
۱۷۔	میجر طارق مزاری	۸۵-۷-۲۱	زیرِ تربیت سی۔ ایس۔ اے لاہور
۱۸۔	میجر طارق شفیع	۸۵-۷-۲۱	زیرِ تربیت سی۔ ایس۔ اے لاہور
۱۹۔	کیپٹن قیوم نذر	۸۰-۱۲-۳۱	حکومتِ بلوچستان
۲۰۔	کیپٹن خالد سلطان	۸۰-۱۲-۳۱	اسسٹنٹ کمشنر شکر گڑھ
۲۱۔	کیپٹن عظمت حنیف	۸۷-۱۲-۳۱	اسسٹنٹ کمشنر مانسہرہ
۲۲۔	کیپٹن نوید اکرم	۸۰-۱۲-۳۱	اسسٹنٹ کمشنر سوات
۲۳۔	کیپٹن یونس درانی	۸۱-۱۱-۴	ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر حکومت بلوچستان
۲۴۔	کیپٹن نصر حیات	۸۱-۱۱-۴	اسسٹنٹ کمشنر ساہیوال
۲۵۔	کیپٹن ظہور احمد خلیل	۸۱-۱۱-۴	اسسٹنٹ کمشنر خیرپور
۲۶۔	فلائٹ لیفٹیننٹ بھاگو	۸۱-۱۱-۳	اسسٹنٹ کمشنر گھارو ضلع ٹھٹھہ
۲۷۔	فلائٹ لیفٹیننٹ ممتاز الرحمٰن	۸۱-۱۱-۳	اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ درگئی حکومت سرحد
۲۸۔	کیپٹن جمیل امجد	۸۱-۱۱-۴	اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ ڈیرہ بگٹی حکومت بلوچستان
۲۹۔	کیپٹن محمدؐ علی گردیزی	۸۱-۱۱-۴	سینئر ٹریفک مجسٹریٹ کراچی
۳۰۔	کیپٹن شاہد اللہ بیگ	۸۱-۱۱-۴	اسسٹنٹ کمشنر پنڈی بھٹی
۳۱۔	کیپٹن آغا ندیم	۸۱-۱۱-۴	ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر کچھی حکومتِ بلوچستان

سیریل نمبر	نام اور رینک	ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ میں شمولیت	موجودہ عہدہ
۳۲۔	کیپٹن عارف ندیم	۸۲-۱۰-۲۴	اسسٹنٹ کمشنر اسلام آباد
۳۳۔	فلائٹ لیفٹیننٹ منور عباس شاہ	۸۲-۱۱-۷	اسسٹنٹ کمشنر بنوں حکومت سرحد
۳۴۔	کیپٹن محسن رضا	۸۲-۱۰-۲۴	اسسٹنٹ کمشنر اسکردو شمالی علاقہ جات
۳۵۔	کیپٹن منور عباس نقوی	۸۲-۱۰-۲۴	اسسٹنٹ کمشنر دادو
۳۶۔	کیپٹن ظفر اقبال قادر	۸۳-۱۰-۳	اسسٹنٹ کمشنر ژوب بلوچستان
۳۷۔	کیپٹن ایم علی خان	۸۳-۱۰-۲۳	اسسٹنٹ کمشنر خضدار بلوچستان
۳۸۔	کیپٹن رضوان تقی	۸۳-۱۰-۱۳	اسسٹنٹ کمشنر ساہیوال
۳۹۔	کیپٹن رشید بشیر مزاری	۸۳-۱۰-۲۰	اسسٹنٹ کمشنر شکار پور
۴۰۔	کیپٹن خالد پرویز	۷۷-۴-۱۷	اسسٹنٹ کمشنر مردان
۴۱۔	فلائٹ لیفٹیننٹ خالد حنیف	۸۴-۷-۱۰	اسسٹنٹ کمشنر اٹک
۴۲۔	کیپٹن افتخار احمد	۸۴-۱۰-۱۸	سول سروس اکیڈیمی زیر تربیت
۴۳۔	کیپٹن طارق مسعود	۸۴-۱۰-۱۸	سول سروس اکیڈیمی زیر تربیت
۴۴۔	کیپٹن محمد یوسف	۸۴-۱۰-۱۸	〃
۴۵۔	کیپٹن علی رضا خان	۸۴-۱۰-۱۸	〃
۴۶۔	کیپٹن جہاں زیب خان	۸۴-۱۰-۱۸	〃

سیریل نمبر	نام اور رینک	محکمہ پولیس میں تبادلے کی تاریخ	موجودہ عہدہ
۴۷	کیپٹن کلب عباس	۸۰-۱۲-۳۱	اے۔ایس۔پی پولیس

سیریل نمبر	نام اور رینک	محکمۂ پولیس میں تبادلے کی تاریخ	موجودہ عہدہ
۴۸۔	کیپٹن مروت علی شاہ	۸۱-۱۱-۴	اے۔ایس۔پی پولیس
۴۹۔	کیپٹن ظفر احمد قریشی	۸۱-۱۱-۴	اے۔ایس۔پی پولیس
۵۰۔	کیپٹن وسیم افضل خان	۸۱-۱۱-۴	اے۔ایس۔پی پولیس
۵۱۔	کیپٹن جمیل احمد خان	۸۱-۱۰-۲۸	اے۔ایس۔پی پولیس
۵۲۔	فلائٹ لیفٹیننٹ جھٹس خان چاچڑ	۸۱-۱۱-۳	اے۔ایس۔پی پولیس
۵۳۔	کیپٹن محمد زبیر	۸۲-۱۰-۲۶	اے۔ایس۔پی۔پولیس
۵۴۔	کیپٹن عابد قادری	۸۳-۱۰-۲۷	اے۔ایس۔پی۔پولیس
۵۵۔	کیپٹن لیاقت علی خان	۸۴-۱۰-۱۸	اے۔ایس۔پی۔پولیس
۵۶۔	کیپٹن محمد عثمان	۸۴-۱۱-۵	اے۔ایس۔پی۔پولیس
۵۷۔	کیپٹن عامل شمیم	۸۵-۱۱-۳۰	اے۔ایس۔پی۔پولیس
۵۸۔	کیپٹن زبیر محمود	۸۵-۱۱-۳۰	اے۔ایس۔پی۔پولیس
۵۹۔	میجر مظہر قیوم	۷۵-۷-۱	اسسٹنٹ ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو
۶۰۔	میجر ملازم حسین بھٹی	۷۵-۷-۱	ڈپٹی ڈائریکٹر محکمۂ داخلہ
۶۱۔	میجر عظمت ملک	۷۵-۱۲-۲۴	ایس۔پی۔پولیس
۶۲	میجر مختار الملک	۷۶-۱۰-۱	ایس۔پی۔پولیس
۶۳۔	میجر حبیب اللہ نیازی	۷۶-۱۰-۱	ایس۔پی۔پولیس
۶۴۔	میجر اکرم چوہدری	۷۶-۱۱-۴	ایس۔ایس۔پی۔پولیس
۶۵۔	میجر خالد شاہ	۷۷-۵-۱۵	کمانڈنٹ سندھ کانسٹیبلری
۶۶۔	میجر عبدالحفیظ	۸۰-۲-۵	ڈپٹی ڈائریکٹر محکمۂ داخلہ

سیریل نمبر	نام اور رینک	محکمۂ پولیس میں تبادلہ کی تاریخ	موجودہ عہدہ
۶۷۔	میجر لیئق احمد	۸۰-۲-۵	ایس۔پی۔ پولیس
۶۸۔	کیپٹن ہمایوں جوگیزئی	۷۵-۶-۹	ایس۔ایس۔پی۔پولیس
۶۹۔	میجر آغا محبوب علی خان	۸۲-۶-۱	ایس۔پی۔پولیس
۷۰۔	میجر محمد اعظم	۸۲-۶-۱	ایس۔پی۔ پولیس
۷۱۔	کیپٹن ضیاء الدین بخاری	۷۶-۱۰-۱	ڈپٹی ڈائریکٹر صوبائی کنٹرول روم
۷۲۔	کیپٹن شوکت حسین	۷۶-۱۰-۱	ڈی،او،ایف،سی
۷۳۔	کیپٹن ناظر حسین	۷۶-۱۰-۴	ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ داخلہ
۷۴۔	میجر امتیاز حسین	۸۳-۵-۲۷	ایس۔پی۔ پولیس
۷۵۔	کیپٹن سلمان سیّد محمّد	۸۰-۵-۲۲	ایس۔پی۔ پولیس
۷۶۔	کیپٹن فلک خورشید	۷۹-۱-۸	ایس۔پی۔ پولیس
۷۷۔	کرنل شاہ ضیاء الدین	۷۷-۹-۱۹	ڈی،آئی،جی۔پولیس
۷۸۔	لیفٹیننٹ کرنل راجہ اسلم خان	۷۷-۹-۱۸	ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو
۷۹۔	میجر میاں ظہیر احمد	۸۴-۳-۲۰	او،ایس،ڈی اسٹیبلشمنٹ ڈویژن
۸۰۔	میجر خالق یار ٹوانہ	۷۵-۷-۱	ڈائریکٹر فیڈرل سیکوریٹی سیل
۸۱۔	میجر سکندر حیات شاہین	۷۵-۷-۱	او،ایس،ڈی کیبنٹ ڈویژن
۸۲۔	میجر آصف علی شاہ	۷۵-۷-۱	ڈی،آئی،جی۔پولیس
۸۳۔	میجر مشتاق احمد	۷۵-۷-۱	ڈی،آئی،جی۔پولیس
۸۴۔	میجر سید کمال شاہ	۷۵-۸-۹	ڈی،آئی،جی۔پولیس
۸۵۔	میجر ملک آصف حیات	۷۵-۷-۱	ڈی،آئی،جی۔پولیس

سیریل نمبر	نام اور رینک	محکمۂ پولیس میں تبادلہ کی تاریخ	موجودہ عہدہ
۸۶۔	میجر محبوب شاہ	۱-۷-۷۶	ڈپٹی کمانڈنٹ فرنٹیئر
۸۷۔	میجر اسرار محمد	۱-۷-۷۶	ڈی، آئی، جی۔ پولیس
۸۸۔	میجر احسن مختار اشرف	۱-۱۰-۷۶	کمانڈنٹ بی، آر، پی
۸۹۔	میجر سعید احمد	۲-۱۰-۷۶	او، ایس، ڈی اسٹیبلشمنٹ ڈویژن
۹۰۔	میجر شفیق احمد کھر	۲-۹-۷۶	ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو
۹۱۔	میجر فقیر ضیاء معصوم	۷-۹-۷۶	ڈی، آئی، جی۔ پولیس
۹۲۔	میجر ضیاء الحسن	۳۱-۱۰-۷۶	ڈی، آئی، جی۔ پولیس
۹۳۔	میجر حاجی محمد عارف چوہدری	۸-۸-۷۵	ڈی، آئی، جی۔ پولیس
۹۴۔	میجر سلطان علی محمود	۳۱-۱۰-۷۶	ڈی، آئی، جی۔ پولیس
۹۵۔	میجر سکندر محمد ضیاء	۴-۱۰-۷۶	ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو
۹۶۔	میجر ایم حبیب خان	۳۱-۱۰-۷۶	ڈپٹی ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو
۹۷۔	میجر سخی اللہ	۱-۱۰-۷۶	ڈائریکٹر وزارتِ داخلہ
۹۸۔	لیفٹیننٹ کرنل سعادت علی شاہ	۱۹-۹-۷۷	ریٹائرڈ

ضیاء الحق کی ان غیر آئینی کارروائیوں کی وجہ سے سرکاری اور نیم سرکاری ملازموں میں تحفظ و ترقی کے عناصر کو شدید دھچکا لگا اور اس کے برعکس رشوت ستانی، بدعنوانی اور اقربا پروری کو فروغ حاصل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک سے رشوت ستانی اور بدعنوانی کو ختم کرنے کی تمام تر تدابیر بیکار ثابت ہو چکی ہیں۔

جنرل ضیاء الحق کا اسلام

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ارشادِ ربانی ہے کہ:۔

"ہم نے تمھیں تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔"

یو... پ... تمام الن...انوں۔ ... اور اس میں مسلم یا غیر مسلم کی کوئی قید نہیں تھی۔ نیز پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی اور آپ کا طرزِ عمل بنی نوع انسان کے لیے خیر و برکت کا موجب تھا لیکن جنرل ضیاء الحق نے محض اپنی حکمرانی کی خاطر مقاصدِ اسلام کو اس غلط رنگ میں پیش کیا جس کو دیکھتے ہوئے آج کا مسلمان اور دوسرے مذاہب کے عام انسان یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ اسلام محض جبر و تشدد اور ظلم و ستم کا مذہب ہے۔ جنرل ضیاء گیارہ سال تک نفاذِ اسلام کے نعرے لگاتے رہے لیکن آج تک انہوں نے نہ تو کوئی ایسا قانون بنایا جو بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کر سکے، بیروزگاروں کو روزگار فراہم کر سکے یا ان کی مالی امداد کا کوئی ذریعہ ہی فراہم کر سکے۔ اس طرح ان کا قانون مجرم انسانوں کے ساتھ ذلت آمیز طریقے پر کوڑے بازی تو یقیناً کر سکتا ہے۔ انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور تو کر سکتا ہے لیکن انہیں معاشرے میں ایک اچھا اور شریفانہ مقام حاصل کرنے میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ضیاء الحق کے نفاذِ اسلام کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان کا اسلام صرف توپ کے سہارے نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ محمد خان جونیجو کی حکومت عوام کے ووٹ سے منتخب ہو کر برسرِ اقتدار آئی تھی۔ چنانچہ قدرتی طور پر اس حکومت کے لیے ضروری تھا کہ اس کی تمام پالیسیاں عوام کی خواہشات اور امنگوں سے مطابقت رکھتی ہوں۔ اس لیے اس حکومت نے نفاذِ اسلام کے عمل کو بھی ایسے انداز میں جاری رکھا تھا جو تمام فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہو اور ساتھ ہی ساتھ قوم میں اتحاد و اتفاق کا باعث بھی بنے۔ یہ تمام تر باتیں سنجیدہ

غور و فکر کی متقاضی تھیں۔ جبکہ جنرل ضیاء الحق کے لیے ان باتوں کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی۔ لہٰذا انہوں نے جونیجو حکومت کی برطرفی کے لیے لگائے جانے والے الزامات میں ایک الزام یہ بھی شامل کر دیا کہ یہ حکومت نفاذِ اسلام میں کوتاہی سے کام لے رہی تھی۔ گویا اس ملک میں ضیاء الحق ہی واحد مسلمان تھا اور باقی سب لوگ خدانخواستہ غیر مسلم تھے۔

ضیاء الحق نے نفاذِ اسلام کے لیے ملاؤں کو بالعموم اور جماعتِ اسلامی کو بالخصوص اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔ نیز انھوں نے پیروں، سجادہ نشینوں اور مجاوروں کی حمایت بھی حاصل کرلی تھی۔ اس گروہ کی طرف سے انگریز گورنر کی خدمت میں پیش کردہ سپاسنامے کا ذکر ہم اس کتاب کے پچھلے صفحات میں کر چکے ہیں۔ تاہم مزید وضاحت کے لیے صرف اتنا عرض کریں گے کہ ملاؤں کے متعلق پاکستان کے معروف سیاست دان خان عبدالولی خان نے اپنی کتاب "فیکٹس آر فیکٹس" میں ایسی بہت سی تفصیلات درج کر دی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حضرات کس طرح انگریزی حکومت کے ایماء پر چند ٹکوں کے عوض جھوٹے فتوے جاری کیا کرتے تھے اور ان کے دینی معیار اور علمی حدود اربع کے متعلق مسٹر جسٹس ریٹائرڈ قدیر الدین احمد نے بالکل درست فرمایا ہے کہ:۔

"اب علوم اس قدر وسیع ہو گئے ہیں کہ ان (مذہبی) علماء کا علم و فضل بہت ہی محدود اور نامکمل نظر آرہا ہے۔ وہ علمِ اقتصادیات کے ماہر نہیں کہ معاشی مسائل پر حکم لگا سکیں۔ فنِ حرب کے ماہر نہیں کہ جنگ اور صلح کے متعلق رائے دے سکیں۔ علمِ سیاسیات کے ماہر نہیں کہ طرزِ حکومت اور طریقۂ انتظام ملکی میں دخل دے سکیں۔ تاریخ، جغرافیہ، نفسیات، عمرانیات

بشریات، تاریخِ ادیانِ عالم، جدید فلسفہ، جدید منطق، جدید سائنس اور فلکیات ان کے نصاب میں داخل نہیں بلکہ تاریخِ تفسیر اور تاریخِ فقہ بھی ان کے نصاب میں شامل نہیں ہے۔ ان علوم اور مسائل کو وہ تعلیمیافتہ اصحاب جن کی گنتی علماء میں نہیں ہے۔ اکثر علماء سے زیادہ جانتے ہیں۔ اس لیے جب علمائے دین تحکمانہ انداز سے اپنے فیصلے صادر کرتے ہیں تو ان کوسن کر جدید تعلیمیافتہ لوگ دم بخود رہ جاتے ہیں اور وہ سارے مسائل جن پر صحیح اجتہاد درکار ہے، مسلمانی درکتاب کے مصداق ہو جاتے ہیں۔ پھر جدید تعلیمیافتہ لوگوں پر خفگی اور غصّہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان کو مغرب زدہ، راحت طلب، نفس کا غلام اور بہت کچھ کہا جاتا ہے۔ اور یہ تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہر ملک میں قدیم طرزِ تعلیم کی خصوصیت یہی رہی ہے کہ جب کوئی شخص کسی بات کو تسلیم نہ کرے تو اس پر غصّہ کیا جائے۔ تکلیف دہ سوالات کرنے والے کا منہ بند کر دیا جائے۔ ایسے سوالات کو اس طرح طے کر دیا جائے کہ ان کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچ نہ سکے۔"

آیئے اب ذرا مولانا مودودی کے اسلام پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مودودی جماعت کا اسلام

مولانا مودودی مرحوم اور جماعتِ اسلامی کے سیاسی کردار کے متعلق ہم سابقہ ابواب میں حسبِ ضرورت بہت کچھ تحریر کر چکے ہیں لیکن جنرل ضیاء الحق کے اسلام کے حوالے سے نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم جماعت اسلامی کے نظریۂ اسلام کا مختصر تعارف کرا دیں تاکہ یہ سمجھنے میں مدد مل سکے کہ ضیاء الحق کے نفاذِ اسلام کا طریقۂ کار دراصل جماعت کا وضع کردہ تھا۔ اسی سبب کی بناء پر جماعتِ اسلامی مارشل لاء کی بی ٹیم کہلاتی تھی اور وہ ہر مسئلے پر ضیاء الحق کی بھرپور حمایت و تائید

بھی کرنی تھی۔ اسلام کی تبلیغ وسعت اور پھیلاؤ پر غیر مسلم مفکرین کا ہمیشہ یہ اعتراز رہا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ برعکس اس کے مسلمان مفکرین نے اس کی مسلسل تردید کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ اسلام کی نشر و اشاعت کا راز اس مذہب کی سچائی، تعلیمات اور اعلیٰ اخلاقی اصولوں میں مضمر ہے۔ مولانا مودودی کو اسلام کے دینِ فطرت ہونے پر شبہ ہے اور انہوں نے بھی اپنی تعلیمات کے ذریعے اسلام دشمن علماء کا بھرپور ساتھ دیا ہے اس ضمن میں درجِ ذیل چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:۔

مہاتما گاندھی کا کہنا ہے کہ:۔

"اسلام ایسے ماحول میں پیدا ہوا جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔"

ڈوزی کا اندازِ فکر یہ ہے کہ:۔

"محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جرنیل ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن لے کر تلقین کرتے تھے۔" جبکہ جارج سیل کا دعویٰ تھا کہ:۔

"جب آپؐ کی جمعیت بڑھ گئی تو آپؐ نے دعویٰ کیا کہ مجھے ان پر حملہ کرتے اور بزورِ شمشیر بت پرستی مٹا کر دینِ حق قائم کرنے کی اجازت منجانب اللہ مل گئی ہے۔" میزان الحق کا مصنف پادری فنڈر تعصب میں سب سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

"اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تیرہ سال تک نرمی و مہربانی کے وسائل سے اپنے دین کی اشاعت میں کوشش کر چکے تھے۔ لہٰذا اب سے آنحضرت النبیّ بالسّیف، کہلائے یعنی نبیؐ تیغ وزن بن گئے اور اس وقت سے اسلام کی مضبوط ترین و کارگر دلیل تلوار ہی قرار پائی۔" یہی مصنف آگے چل کر رقمطراز ہے کہ:۔

" اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور ان کے تابعین کے چال چلن پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ خیال کرنے لگ گئے تھے کہ عقبہ کے موضوع پر قبول اخلاقی قواعد کی پابندی ان کے لیے ضروری نہ تھی۔ اب خدا ان سے فقط یہی ایک بات طلب کرتا ہے کہ اللہ کی راہ میں لڑیں اور تیغ و تیر اور خنجر و شمشیر سے قتل پر قتل کرتے رہیں۔"

ان اسلام دشمن اور متعصب غیر مسلم مفکرین کے بعد آیئے اب ہم مودودی مرحوم کے افکار کا جائزہ لیں۔ مولانا مرحوم مندرجہ بالا نظریات کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ۱۳ برس تک عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ وعظ و تلقین کا جو مؤثر سے مؤثر انداز ہو سکتا تھا اُسے اختیار کیا۔ مضبوط دلائل دیئے، واضح حجتیں پیش کیں، فصاحت و بلاغت اور زورِ خطابت سے دلوں کو گرمایا۔ اللہ کی جانب سے محیّر العقول معجزے دکھائے۔ اپنے اخلاق اور پاک زندگی سے نیکی کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ اور کوئی ذریعہ ایسا نہ چھوڑا جو حق کے اظہار و اثبات کے لیے مفید ہو سکتا تھا۔ لیکن آپؐ کی قوم نے آفتاب کی طرح آپ کی صداقت روشن ہو جانے کے باوجود آپؐ کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔۔۔ لیکن جب وعظ و تلقین کی ناکامی کے بعد داعیٔ اسلام نے ہاتھ میں تلوار لی تو دلوں سے رفتہ رفتہ بدی و شرارت کا زنگ چھوٹنے لگا۔ طبیعتوں سے فاسد مادے خود بخود نکل گئے۔ رُوحوں کی کثافتیں دور ہو گئیں اور صرف یہی نہیں کہ آنکھوں سے پردہ ہٹ کر حق کا نور صاف عیاں ہو گیا بلکہ گردنوں میں وہ سختی اور سروں میں وہ نخوت بھی باقی نہ رہی جو ظہورِ حق کے بعد انسان کو اس کے آگے جُھکنے سے باز رکھتی ہے۔

عرب کی طرح دوسرے ممالک نے بھی اسلام کو اس سُرعت سے قبول کیا کہ ایک صدی کے اندر چوتھائی دنیا مسلمان ہوگئی تو اس کی وجہ یہی یہی تھی کہ اسلام کی تلوار نے ان پردوں کو چاک کر دیا جو دلوں پر پڑے ہوئے تھے۔"

(الجہاد فی الاسلام، صفحہ ۱۳۷-۱۳۸)

آپ نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے صحابۂ کرام کو بھی اس جنگ بازی کا داعی قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"یہی پالیسی تھی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اور آپؐ کے بعد خلفائے راشدین نے عمل کیا۔ عرب جہاں مسلم پارٹی پیدا ہوئی تھی سب سے پہلے اسی کو زیرِ نگیں کیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے اطراف کے ممالک کو اپنے اصُول اور مسلک کی طرف دعوت دی۔ مگر اس کا انتظار نہ کیا کہ یہ دعوت قبول کی جاتی ہے یا نہیں بلکہ قوّت حاصل کرتے ہی رُومی سلطنت سے تصادم شروع کر دیا۔ آنحضرتؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ پارٹی کے لیڈر ہوئے تو انھوں نے روم اور ایران دونوں غیر اسلامی حکومتوں پر حملہ کیا اور حضرت عمرؓ نے اس حملہ کو کامیابی کے آخری مراحل تک پہنچا دیا۔" (حوالہ "حقیقتِ جہاد" صفحہ نمبر ۶۵)

رسولِ مقبول حضرت محمدؐ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ:۔

"ہر بچہّ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ اُسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔" (حوالہ بخاری شریف)

اسی لیے علمائے اسلام کا دعویٰ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے گویا یہ مذہب فطرتِ انسانی کے عین مطابق خدا پرستی، طہارت، پاکیزگی، امن اور انسان دوستی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام ہرگز قتل و غارتگری یا جبر و تشدّد کی تعلیم نہیں دیتا۔ اسلام میں جہاد کا مفہوم صرف دفاعی جنگ ہے نہ کہ جارحانہ کاروائی اس کا مقصود و مطلوب ہے

اللہ تبارک و تعالیٰ زمین پر فتنہ و فساد کو ہرگز پسند نہیں فرماتا لیکن مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی "صالحین" ہونے کی وجہ سے تیغ زنی کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:۔

"جب ان سے کہا جاتا کہ زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو مصلحین کی جماعت ہیں۔ خبردار! یہی فسادی ہیں مگر مانتے نہیں۔"

(پارہ نمبر ۱۔ سورۂ البقرہ)

اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے بعد پاکستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ "صالحین" کی اس جماعت سے ہوشیار رہیں اور ان کو شر و فساد پھیلانے کی ہرگز اجازت نہ دیں۔

غیر مسلم مفکرین کے خیالات

دنیا کے منصف مزاج غیر مسلم علماء نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ اسلام کی ترویج و اشاعت کا زور اس مذہب کے اعلیٰ اصولوں اور رسولِ مقبول ؐ کی سیرت اور کردار میں مضمر ہے۔ ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو لائیٹنر لکھتا ہے کہ:۔

"فی الواقع ان لوگوں کی تمام دلیلیں اپنا وزن کھو دیتی ہیں جو محض اس بات پر قائم ہیں کہ جہاد کا مقصد تلوار کے ذریعے اسلام کا پھیلانا تھا۔ کیونکہ برخلاف اس کے سورۂ حج میں صاف طور پر لکھا ہے کہ "جہاد کا مدعا مسجدوں اور گرجاؤں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں اور زاہدوں و عابدوں کی خانقاہوں کی بربادی سے محفوظ رکھنا ہے۔" (سورۂ حج آیات نمبر ۳۹۔۴۰)

"ستیا اپدیش" کے ہندو ایڈیٹر نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ایک عالمگیر سچائی کے حوالے سے مولانا مودودی کے نظریۂ جبر کو مکمل طور پر مسترد کر کے مولانا کے تمام دعوؤں کو باطل ثابت کر دیا ہے۔ موصوف لکھتے

ہیں کہ :۔

"لوگ کہتے ہیں کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا ہے ۔ لیکن ہم ان کی اس دلیل سے موافقت نہیں کر سکتے کیونکہ زبردستی سے جو چیز پھیلائی جاتی ہے اگر اسلام کی اشاعت ظلم کے ذریعے ہوئی ہوتی تو آج اسلام کا نام ونشان بھی باقی نہ رہتا۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہے ۔ بلکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسلام دن بدن ترقی پر ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ بانیٔ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر روحانی شکتی تھی۔ منش ماتر (بنی نوع انسان) کے لیئے پریم تھا ۔ اس کے اندر محبت اور رحم کا پاک جذبہ کام کر رہا تھا۔ نیک خیالات اس کی رہنمائی کرتے تھے۔"

آریا سماج کے ایک اور عالم پروفیسر رام دیو نے مولانا مودودی کے نظریہ کو رد کرتے ہوئے مولانا کو نہایت دلچسپ اور معنی خیز چیلنج دیا تھا مگر جماعتِ اسلامی اس چیلنج کو قبول نہ کر سکی ۔ پروفیسر رام دیو لکھتے ہیں کہ :۔

"لیکن مدینے میں بیٹھے ہوئے محمدؐ صاحبؐ نے ان میں جادو کی بجلی بھر دی۔ وہ بجلی جو انسانوں کو دیوتا بنا دیتی ہے۔ یہ غلط ہے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اشاعتِ اسلام کے لیے کبھی بھی تلوار نہیں اٹھائی گئی اگر مذہب تلوار سے پھیل سکتا ہے تو آج کوئی پھیلا کر دکھا دے ۔"

پروفیسر رام دیو نے ایک ایسی سچائی کا اظہار کیا ہے کہ جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ جماعتِ اسلامی کی عمر نصف صدی تک پہنچ چکی ہے۔ مگر مولانا مودودی اور ان کی جماعت کے اکابرین نہ تو اسلامی حکومت قائم کر سکے اور نہ ہی صالحین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافے میں کامیابی حاصل کر پائے۔ جماعت کے کُل ارکان کی تعداد ہزاروں تک بھی نہ پہنچ سکی ۔ یہ کارکردگی ہے اس نام نہاد انقلابی جماعت کی جو نصف صدی کے طویل عرصے میں سر انجام دی

گئی ہے۔

ضیاء الحق مولانا مودودی کے اسلام کا علمبردار تھا۔ اس نے آئینی و جمہوری حکومت کے خلاف بغاوت کرکے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور گیارہ سال تک نفاذِ اسلام کے بلند و بانگ دعوے کرتے ہوئے ڈھونگ رچاتا رہا۔ لیکن ابھی اس کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا کہ اس ملک پر جماعتی بنیادوں پر عام انتخابات ۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کو کرائے گئے اور حکومت کی سربراہی ایک خاتون نے حاصل کر لی۔ ان واضح حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ ضیاء الحق کا حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ضیاء الحق نے محض ظلم و ستم اور جبر و تشدد کو اسلام کا نام دے رکھا تھا اور ظلم و ستم کی یہ حکمرانی ضیاء الحق کے ساتھ ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئی۔

اسلامی شریعت

اسلامی شریعت کے چار ماخذ ہیں۔ یعنی:۔ (۱) قرآن پاک (۲) سُنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم (۳) اجماع اور (۴) اجتہاد۔ لیکن عملی اعتبار سے دو ماخذ یعنی قرآن اور سُنّہ پوری ملّتِ اسلامیہ کے لیے غیر متنازعہ ہیں جبکہ اجماع اور اجتہاد کو یہ رتبہ و مقام حاصل نہیں ہے۔ اس لیے ہم صرف اوّلین دو اہم ماخذوں کا ذکر کرتے ہیں۔ قرآن پاک اللہ تبارک و تعالےٰ کی طرف سے نازل کی جانے والی آخری آسمانی کتاب ہے اور اسوۂ حسنہؐ قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے۔

(۱) قرآنِ پاک اور سیاسی نظام:۔ درحقیقت قرآن مجید بنیادی طور پر بنی نوعِ انسان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کا منابلطہ ہے۔ اس لیے ریاستوں کی تشکیل، آئین کی تدوین یا حکومت کے انتظام و انصرام کے متعلق قرآن پاک میں کوئی حکم موجود نہیں ہے اور یہ بالکل قدرتی بات ہے۔ اس لیے کہ قرآن پاک آسمانی ہدایت کی آخری کتاب ہے اور آسمانی ہدایت کا نصب العین یہ ہے کہ

بنی نوعِ انسان کو اخلاقی و روحانی اعتبار سے انسانیت کے بلند ترین منصب پر فائز کیا جائے۔ ہم نے زیرِ نظر کتاب کی ابتدائی سطور میں یہ بتایا ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ یا نائب ہونے کی وجہ سے مقتدر حیثیت کا مالک ہے اور نظامِ حیات کی تشکیل اس کی صوابدید پر منحصر ہے بشرطیکہ وہ کائنات کی تخلیق کے مقاصد اور خالقِ کائنات کے دیئے ہوئے ضابطۂ اخلاق کی پابندی کرے۔ کسی مسلمان مملکت کا آئین وفاقی ہو یا وحدانی، نظامِ حکومت صدارتی ہو یا پارلیمانی، ملک میں یک جماعتی نظام ہو یا کثیر الجماعتی، انتخابات جماعتی بنیادوں پر ہوں یا غیر جماعتی بنیادوں پر، غرضیکہ اس قسم کے دیگر تمام مسائل کا اللہ تعالیٰ کی آخری آسمانی کتاب قرآن پاک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہر مسلمان ریاست کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مرضی، خواہش اور حالات کے مطابق جو اصول چاہے اختیار کرے۔ البتہ یہاں اس امر کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ قرآن پاک کی حسبِ ذیل آیات کی بنیاد پر پاکستان کے بعض مفاد پرست اور خود غرض عناصر نے اسلامی ریاست کی اصطلاح وضع کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ان دو آیات کے تراجم پیشِ خدمت ہیں:-

ترجمہ:- (۱) "(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر تم تُند خُو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردو پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کردو۔ ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو اور دین کے کام میں ان کو شریکِ مشورہ رکھو۔ پھر تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کے بھروسے پر کام کرتے ہیں"

(حوالہ:- پارہ نمبر ۴ سورۂ آلِ عمران آیت نمبر ۱۵۹)

سورۂ آلِ عمران کے نزول کا زمانہ جنگِ بدر کے فوراً بعد شروع ہونے والے ایّام سے لے کر جنگِ اُحد کے اختتام تک کے عرصے پر محیط ہے۔ یہ سورۂ چار خطبات پر مشتمل ہے اور چوتھا خطبہ جنگِ اُحد کے بعد نازل ہوا تھا۔ اس خطبے میں جنگِ اُحد کے واقعات اور مسلمانوں کی کوتاہیوں پر عمومی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس جنگ کا آغاز اس طرح ہوا کہ شوال تین ہجری میں کفّارِ مکّہ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینہ منوّرہ پر حملہ آور ہوئے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم اور بعض صحابۂ کرام کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر محصور ہوکر مدافعت کی جائے جبکہ نوجوان طبقہ کھلے میدان میں جنگ کرنے پر بضد تھا۔ بالآخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے باہر نکل کر جنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ آپؐ نے اُحد پہاڑی کے دامن میں اپنی فوج کو اس طرح آراستہ کیا کہ سامنے قریش کا لشکر تھا اور عقب میں پہاڑ تھا لیکن عقب سے ایک درّے کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ ہوسکتا تھا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس درّے کی حفاظت کے لیے عبداللہ بن جبیر کی قیادت میں پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ مامور کر دیا۔ جنگ کے آغاز پر مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا اور انہوں نے کفّار کو لوٹنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھتے ہی درّے میں تعیّنات تیر انداز اپنی جگہ چھوڑ کر آ گئے اور وہ بھی مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہوگئے۔ خالد بن ولید نے جو اس وقت کفّار کی فوج کے افسر تھے عقب سے حملہ کرکے مسلمانوں کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ حضورِ اکرمؐ کا دندانِ مبارک شہید ہوگیا۔ کفّار نے شور مچا دیا کہ آنحضورؐ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے اور ان میں بھگدڑ مچ گئی چنانچہ انہوں نے خلفشاری کے عالم میں بھاگنا شروع کر دیا لیکن جیسے ہی مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ اللہ کے نبیؐ زندہ وسلامت ہیں

تو وہ انتہائی سرعت کے ساتھ واپس لوٹ آئے اور انہوں نے کفّار کی فوج کو بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ کے بعض پہلو اور نتائج ایسے تھے کہ جو مسلم جماعت کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر سکتے تھے مثلاً یہ کہ :۔

(i) یہ جنگ نوجوانوں کے مشورے سے کھلے میدان میں لڑی گئی تھی اس لیے مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس سے کئی قسم کی غلط فہمیاں پیدا ہو سکتی تھیں مثلاً یہ کہ مسلمان قابلِ اعتماد نہیں یا پھر مشاورت کی صلاحیت سے ہی عاری ہیں۔

(ii) مسلمانوں کی قیادت اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فرمائی تھی۔ اس لیے تو مسلم حضرات حیران تھے کہ انھیں شکست کیونکر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی کوتاہیوں کا ذکر کر کے ان حضرات کے استعجاب و بدگمانیوں کو دور کر دیا۔

(iii) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درّے میں تعینّات تیر اندازوں سے نافرمانی کا سبب دریافت کیا تو وہ کوئی تسلّی بخش جواب نہ دے سکے۔ اس بات کا اللہ کے نبیؐ کو بہت صدمہ اور ملال ہوا۔ اللہ ربّ العزّت نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوش مزاجی کا ذکر کر کے مسلمانوں کی غلطیاں معاف کرنے، ان کے لیے دعا کرنے اور انہیں دین کے کام میں شریکِ مشورہ رکھنے کی تاکید فرمائی۔ تو گویا اللہ تعالےٰ نے نہ صرف حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے رنج و ملال کا سدِّباب کیا بلکہ مسلمانوں کو بھی احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے بچا لیا۔ اس آیتِ کریمہ سے نظامِ حکومت کا کوئی بھی سیاسی پہلو ہرگز نہیں نکلتا۔ آنحضورؐ مسلمانوں کے مشورے سے باہر نکلنے کا فیصلہ کر چکے تھے جسے اللہ نے بھی پسند فرمایا۔ آپؐ نے یہ مشورہ اللہ کے حکم سے نہیں کیا تھا۔

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس سورۃ یعنی سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر ۶۴ میں اللہ ربّ العزت ارشاد فرماتے ہیں کہ :۔

ترجمہ :۔ کہو، اے اہلِ کتاب ۔ آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے ۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں ۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی بھی اللہ کے سوا کسی کو اپنا ربّ نہ بنا لے ۔ اگر وہ اس دعوت کو قبول کرنے سے منہ موڑ لیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں "۔

اس آیت مبارکہ سے ہی ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی انتہائی غرض و غایت توحید پرستی ہے گویا اسلام کی توجہ کا اصل مرکز خدائے واحد کی بندگی کی تبلیغ کرنا ہے ۔ قرآن حکیم کی دوسری آیت جسے جمہوری نظام کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہے :۔

ترجمہ :۔ " جو کچھ تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی ۔ وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں اور اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہیں ۔ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کرتے ہیں ۔ جو اپنے ربّ کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں ۔ اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں ۔ ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۔"

(پارہ نمبر ۲۵ سورۃ الشوریٰ آیات نمبر ۳۶ تا ۳۸)

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالےٰ نے دنیا و آخرت کا فرق واضح کیا ہے ۔ اور یہ فرمایا ہے کہ دوسری دنیا کا اجرِ عظیم صرف مومنین کے لیے ہے اس کے

بعد مومنین کے اوصاف بتائے ہیں۔ جن میں سے ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ اپنے معاملات مشورے سے طے کرتے ہیں گویا مشاورت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک پسندیدہ وصف ہے اور یہ وصف سیاسی نظام میں بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ دنیا کے تمام آمر حکمران اور مطلق العنان بادشاہ اپنی حکومتیں اُمراء اور وزراء کے مشورے سے چلاتے رہے ہیں۔ مشاورت کے اس اصول سے جمہوری نظامِ حکومت کا تصوّر کسی طرح بھی نہیں اُبھرتا۔ البتہ یہ درست ہے کہ جمہوری نظامِ حکومت چونکہ عوام کی مرضی و منشاء سے قائم ہوتی ہے لہٰذا جمہوریت کا اصول مشاورت کے عین مطابق ہے لیکن اس کے برعکس اگر کوئی ضیاء الحق اقتدار پر قبضہ کر کے اپنے اقتدار کی تائید کے لیے مجلسِ شوریٰ کے نام سے ایک ٹیم بھرتی کرلے تو مشاورت کا مفہوم تو بے شک پورا ہو جائے گا لیکن اس طریقۂ کار کو جمہوریت سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جمہوریت کا بنیادی اصول عوام کی مرضی اور خواہش کا احترام ہے جبکہ اس قسم کی مجلسِ شوریٰ کے قیام سے صرف حکمران کی خواہشات کی عکاسی ہی ہوتی ہے۔

بہرحال مندرجہ بالا دو آیاتِ قرآنی میں مشاورت کو ایک پسندیدہ اصول قرار دیا گیا ہے لیکن سیاق و سباق کے حوالے سے یہ مشاورت نظامِ حکومت یا سیاسی مسائل کے لیے ہرگز مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت عمومی ہے یا پھر دین کے معاملات سے ہے۔ ان حقائق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ قرآن پاک میں نظامِ حکومت و مملکت کے متعلق کوئی حکم موجود ہی نہیں ہے۔

(۲) سُنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم:۔ قرآن پاک کے بعد اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ اسوۂ حسنہ ہے جو دراصل قرآن پاک کی حقیقی اور عملی تفسیر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوّت کی تیئس سالہ مدّت کے

دوران ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ آپؐ نے کبھی بھی اسلامی ریاست کے قیام یا اسلامی مملکت کے سربراہ یا بادشاہ بننے کی خواہش کی ہو یا کوشش کی ہو۔ اس کے برعکس جب آپؐ نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو کفارِ مکہّ نے آپؐ کو اپنے مقصد سے ہٹانے کے لیے طرح طرح کی نت نئی تدبیریں اختیار کیں مگر وہ ناکام و نامراد رہے۔ آخر کار تمام قبیلوں کے سردار اکٹھّے ہو کر آپؐ کے چچا حضرت ابوطالب کے پاس آئے اور آپ سے کہا:۔

"ہم نے آپ کا بہت ادب کیا۔ آپ کا بھتیجا ہمارے ٹھاکروں اور بتوں کو جنھیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے اتنا سخت سُست کہنے لگا ہے کہ اب ہم صبر نہیں کر سکتے۔ آپ اسے سمجھا کر چپُ رہنے کی ہدایت کر دیں ورنہ ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے اور تم اکیلے ہم سب کا کچھ نہیں کر سکو گے۔"

سارے ملک کی عداوت دیکھ کر چچا کا دل درد اور محبت سے بھر گیا۔ انھوں نے نبی صلعم کو بلایا اور سمجھایا کہ بت پرستی کا رُد نہ کیا کرو۔ ورنہ میں بھی تمھاری کچھ مدد نہ کر سکوں گا۔

نبی صلعم نے فرمایا "چچا۔ اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر لا رکھیں اور چاند کو بائیں ہاتھ پر، تب بھی میں اپنے کام سے نہ ہٹوں گا اور خدا کے حکم میں سے ایک حرف بھی کم و بیش نہ کروں گا۔ اس کام میں خواہ میری جان بھی جاتی رہے۔"

اس ناکامی کے بعد قریشِ مکہّ نے مشورت کی کہ محمدؐ کو قوم کے سامنے بلا کر سمجھانا چاہیئے۔ اس مشورت کے بعد انھوں نے نبی صلعم کے پاس کہلا بھیجا کہ سردارانِ قوم آپؐ سے کچھ بات چیت کرنا چاہتے ہیں اور کعبہ کے اندر جمع ہیں۔ نبی صلعم خوش خوش وہاں گئے کیونکہ حضورؐ کو ان کے ایمان لے آنے کی

بڑی ہی آرزو تھی۔ جب آنحضرت صلعم وہاں جا بیٹھے تو انھوں نے گفتگو کا آغاز اس طرح کیا :۔

"اے محمدؐ! ہم نے تمھیں یہاں بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ بخدا ہم نہیں جانتے کہ کوئی شخص اپنی قوم پر اتنی مشکلات لایا ہو جس قدر تو نے اپنی قوم پر ڈال رکھی ہیں۔ کوئی خرابی ایسی نہیں جو تیری وجہ سے ہم پر نہ آچکی ہو۔ اب تم یہ بتاؤ کہ اگر تم اپنے اس نئے دین سے مال جمع کرنا چاہتے ہو تو ہم تمھارے لیے مال جمع کر دیں اتنا کہ ہم میں سے کسی کے پاس بھی نہ ہو"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "تم نے جو کچھ کہا، میری حالت کے ذرا بھی مطابق نہیں۔ جو تعلیم میں لے کر آیا ہوں، وہ نہ طلبِ اموال کے لیے ہے، نہ جلب شرف یا حصولِ سلطنت کے واسطے ہے۔ بات یہ ہے کہ خدا نے مجھے تمھاری طرف اپنا رسولؐ بنا کر بھیجا ہے۔ مجھ پر کتاب اتاری ہے۔ مجھے اپنا بشیر و نذیر بنایا ہے۔ میں نے اپنے ربّ کے پیغام تم کو پہنچا دیئے ہیں اور تمھیں بخوبی سمجھا دیا ہے۔ اگر تم میری تعلیمات کو قبول کرو گے تو یہ تمھارے لیے دنیا و آخرت کا سرمایہ ہے اور اگر رد کرو گے تب میں اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا کہ وہ میرے لیے اور تمھارے لیے کیا حکم بھیجتا ہے"

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جواب میں اپنی نبوّت کے مقاصد کو واضح طور پر بیان فرما دیا ہے۔ اور یہ اعلان بھی کر دیا ہے کہ سلطنت کا حاصل کرنا آپؐ کے مقاصد میں شامل نہیں۔ جب سلطنت کا قیام ہی آپ کے مقاصدِ نبوّت میں شامل نہیں تھا تو پھر امورِ سلطنت اور انصرامِ مملکت کے متعلّق احکامات آپؐ کی نبوّت کے مقاصد میں کیسے شامل ہو سکتے تھے۔ علاوہ ازیں حسبِ ذیل واقعات ثابت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی نبوّت کا مقصد صرف مسلمانوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کرنا تھا نیز ان کے دلوں میں توحید پرستی کو جاگزیں بنانا تھا اور ریاستوں کا قیام ہرگز آپ کے مقاصد میں شامل نہ تھا۔

(۳) **بیعتِ عقبہ اُولیٰ** :۔ اللہ کے نبی محمّد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ اور دعوت کا اثر یہ ہوا کہ یثرب کے باشندے مکّہ معظّمہ میں حاضر ہوئے اور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے دستِ مبارک پر ایمان قبول کیا۔ آپؐ نے ان لوگوں سے جو بیعت لی اس کا خلاصہ درج ذیل پیش کیا جارہا ہے:۔

(۱) ہم خدائے واحد کی عبادت کیا کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں بنائیں گے۔

(۱۱) ہم چوری اور زنا کاری نہیں کریں گے۔

(۱۱۱) ہم اپنی اولاد (لڑکیوں) کو قتل نہیں کریں گے۔

(۱۷) ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہیں لگائیں گے اور نہ ہی کسی کی چغلی کیا کریں گے۔

(۷) ہم نبیؐ کی اطاعت ہر ایک اچھی بات میں کیا کریں گے۔

مندرجہ بالا تمام باتوں کا تعلق حقیقتاً انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاح سے ہے اور ان میں حصولِ اقتدار یا نظامِ حکومت کا کوئی ذکر تک نہیں ہے۔

جمعہ کا پہلا خطبہ :۔ مکّہ سے ہجرت کرکے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۲ ربیع الاوّل بروز جمعۃ المبارک مدینہ منوّرہ پہنچے آپؐ نے بنی سالم کے گھر میں ایک سو مسلمانوں کے ساتھ نمازِ جمعہ ادا کی۔ درحقیقت یہ اسلام میں پہلا جمعہ تھا جو باقاعدہ طور پر پڑھا گیا تھا۔ آپؐ نے جمعہ کا جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا وہ درج ذیل ہے:۔

خطبہ کا متن :۔ "حمد و ستائش خدا کے لیے ہے۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں۔ مدد بخشش اور ہدایت اسی سے چاہتا ہوں۔ میرا ایمان اسی پر

ہے۔ میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور نافرمانی کرنے والوں سے عداوت رکھتا ہوں۔ میری شہادت یہ ہے کہ خدا کے سوا عبادت کے لائق کوئی بھی نہیں۔ وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے۔ اسی نے محمدؐ کو ہدایت، نور اور نصیحت کے ساتھ ایسے زمانے میں بھیجا ہے جبکہ مدتوں سے کوئی رسول دنیا پر نہ آیا، علم گھٹ گیا اور گمراہی بڑھ گئی تھی۔ اسے آخری زمانے میں قیامت کے قرب اور موت کی نزدیکی کے وقت بھیجا گیا۔ جو کوئی خدا اور رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے، وہی راہ یاب ہے اور جس نے ان کا حکم نہ مانا، وہ بھٹک گیا۔ درجہ سے گر گیا اور سخت گمراہی میں پھنس گیا ہے۔ مسلمانو! میں تمہیں اللہ سے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں، بہترین وصیت جو مسلمان، مسلمان کو کرسکتا ہے۔ یہ ہے کہ اللہ اسے آخرت کے لیے آمادہ کرے اور اللہ سے تقویٰ کے لیے کہے۔ لوگو! جن باتوں سے خدا نے تمہیں پرہیز کرنے کو کہا ہے ان سے بچتے رہو۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی نصیحت ہے اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی ذکر ہے۔ یاد رکھو کہ اُمورِ آخرت کے بارے میں اس شخص کے لیے جو خدا سے ڈر کر کام کر رہا ہے۔ تقویٰ بہترین ثابت ہوگا اور جب کوئی شخص اپنے اور خدا کے درمیان کا معاملہ خفیہ و ظاہر میں درست کرے گا اور ایسا کرنے میں اس کی نیت خالص ہوگی تو ایسا کرنا اس کے لیے دنیا میں ذکر اور موت کے بعد (جب انسان کو اعمال کی ضرورت و قدر معلوم ہوگی) ذخیرہ بن جائے گا۔

لیکن اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو اس کا ذکر اس آیت میں ہے) "انسان پسند کرے گا کہ اس کے اعمال اس سے دُور ہی رکھے جائیں۔ خدا تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اور خدا تو اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے"۔ اور جس شخص نے خدا کے حکم کو سچ جانا، اور اس کے وعدوں کو پورا کیا تو اس کی بابت یہ ارشادِ

الہٰی موجود ہے کہ "ہمارے ہاں بات نہیں بدلتی، اور ہم اپنے ناچیز بندوں پر ظلم نہیں کرتے۔"

مسلمانو! اپنے موجودہ اور آئندہ ظاہر اور خفیہ کاموں میں اللہ سے تقویٰ کو پیشِ نظر رکھو کیونکہ تقویٰ والوں کی بدیاں چھوڑ دی جاتی ہیں اور اجر بڑھا دیا جاتا ہے۔ تقویٰ والے وہ ہیں جو بہت بڑی مراد کو پہنچ جائیں گے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو اللہ کی بیزاری، عذاب اور غصّہ کو دور کر دیتا ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو چہرہ کو درخشاں، پروردگار کو خوشنود اور درجے کو بلند کرتا ہے۔

مسلمانو! حظ اٹھاؤ مگر حقوقِ الہٰی میں فروگذاشت نہ کرو۔ خدا نے اسی لیے تم کو اپنی کتاب سکھائی اور اپنا راستہ دکھایا ہے کہ راست بازوں اور کاذبوں کو الگ الگ کر دیا جائے۔ لوگو! خدا نے تمھارے ساتھ عمدہ برتاؤ کیا ہے۔ تم بھی لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرو اور جو خدا کے دشمن ہیں، انھیں دشمن سمجھو اور اللہ کے رستے میں پوری ہمّت اور توجّہ سے کوشش کرو۔ اسی نے تم کو برگزیدہ بنایا اور تمھارا نام مسلمان رکھا ہے تاکہ ہلاک ہونے والا بھی روشن دلائل پر ہلاک ہو اور زندگی پانے والا بھی روشن دلائل پر زندگی پائے۔ اور سب نیکیاں اللہ کی مدد سے ہیں۔ لوگو! اللہ کا ذکر کرو۔ اور آئندہ زندگی کے لیے عمل کرو کیونکہ جو شخص اپنے اور خدا کے درمیان کے معاملے کو درست کر لیتا ہے، اللہ تعالےٰ اس کے اور لوگوں کے درمیان معاملہ کو درست کر دیتا ہے۔ ہاں خدا بندوں پر حکم چلاتا ہے اور اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا۔ خدا بندوں کا مالک ہے اور بندوں کو اس پر کچھ اختیار نہیں۔ خدا سب سے بڑا ہے اور ہم کو (نیکی کرنے کی) طاقت اسی عظمت والے سے ملتی ہے۔

مندرجہ بالا خطبے کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ خطبہ صرف نیک اعمال

عبادت، پرہیزگاری اور تقویٰ اختیار کرنے پر ہی مشتمل ہے اور اس میں نظام حکومت یا سیاسی معاملات کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

(۴) **بادشاہوں کو دعوتِ اسلام** یکم محرم الحرام ۷ ہجری کو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف ملکوں کے بادشاہوں کے نام اسلام قبول کرنے کے لیے دعوت نامے بھیجے۔ حبش کے عیسائی بادشاہ نجاشی نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامہ مبارک ملنے کے بعد آپؐ کو جواب ارسال کیا جس میں اس نے قبولِ اسلام کا اقرار کیا۔ درج ذیل سطور میں ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط نجاشی کے نام اور اس کے جوابی خط کی نقول پیش کر رہے ہیں ملاحظہ فرمائیے:۔

(۴ الف) **اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط نجاشی بادشاہ کے نام:** ”خدا کے نام سے جو بڑی رحمت اور دائمی رحم والا ہے“ یہ خط اللہ کے رسول محمدؐ کی طرف سے نجاشی اصحم بادشاہ حبش کے نام ہے۔ تجھے سلامتی ہو۔ میں پہلے اللہ کی ستائش کرتا ہوں۔ جو ملک، قدوس، سلام، مومن اور مہیمن ہے اور ظاہر کرتا ہوں کہ عیسٰی بن مریم اللہ کی مخلوق اور اس کا حکم ہیں، جو مریم بتول طیبہّ عفیفہ ہے، ایمان لے آ، اور ہمیشہ اسی کی فرمانبرداری میں رہا کر اور میرا اتباع کر اور میری تعلیم کا سچّے دل سے اقرار کر کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔

میں قبل ازیں اس ملک میں اپنے چچیرے بھائی جعفر کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ بھیج چکا ہوں۔ تم اسے بآرام ٹھہرالینا۔ نجاشی تم تکبّر چھوڑ دو کیونکہ میں تم کو اور تمھارے دربار کو خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ دیکھو میں نے اللہ کا حکم پہنچا دیا اور تمہیں بخوبی سمجھا دیا۔ اب مناسب ہے کہ میری نصیحت مان لو۔ سلام اس پر جو سیدھی راہ پر چلتا ہے۔

نجاشی اس فرمانِ مبارک پر مسلمان ہوگیا اور جواب میں یہ عریضہ تحریر کیا:۔

(۴ب) عیسائی بادشاہ نجاشی کا خط بنام حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: اللہ رحمٰن، رحیم کے نام سے، محمد رسول اللہ کی خدمت میں نجاشی اصحم بن ابجز کی طرف سے۔ اے نبی اللہ کے، آپؐ پر اللہ کی سلامتی، رحمت اور برکتیں ہوں۔ اسی خدا کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جس نے مجھے اسلام کی ہدایت فرمائی ہے اب عرض یہ ہے کہ حضور کا فرمان میرے پاس پہنچا۔ عیسیٰؑ کے متعلق جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ بخدائے زمین و آسمان، وہ اس سے ذرّہ برابر بھی بڑھ کر نہیں۔ انکی حیثیت اتنی ہی ہے جو آپؐ نے تحریر فرمائی ہے۔ ہم نے آپؐ کی تعلیم سیکھ لی ہے اور آپ کا چچیرا بھائی اور مسلمان میرے پاس آرام سے ہیں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، سچے ہیں اور راست بازوں کی سچائی ظاہر کرنے والے ہیں۔ میں آپؐ سے بیعت کرتا ہوں۔ میں نے آپؐ کے چچیرے بھائی کے ہاتھ پر حضورؐ کی بیعت اور اللہ تعالےٰ کی فرمانبرداری کا اقرار کر لیا ہے اور میں حضورؐ کی خدمت میں اپنے فرزند ارحا کو روانہ کرتا ہوں۔ میں تو اپنے ہی نفس کا مالک ہوں۔ اگر حضورؐ کا منشا یہ ہوگا کہ میں حاضرِ خدمت ہو جاؤں تو ضرور حاضر ہو جاؤں گا کیونکہ میں یقین کرتا ہوں کہ حضورؐ جو فرماتے ہیں وہی حق ہے۔ اے خدا کے رسولؐ آپؐ پر سلام۔

نجاشی کے قبولِ اسلام کے باوجود آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے نظامِ حکومت میں کسی بھی طرح کی مداخلت پسند نہ کی۔ آپؐ نے اس سے یہ بھی نہ کہا کہ وہ بادشاہ کی بجائے خلیفہ کہلائے یا ملک میں اسلامی نظام نافذ کرنے کا اعلان کرے۔ اسی طرح آپؐ نے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ دعوت نامے کی نقل پیشِ خدمت ہے:۔

"اللہ رحمٰن رحیم کے نام سے۔ محمد رسولؐ اللہ کی طرف سے کسریٰ بزرگ فارس کے نام۔ سلام اس پر جو سیدھے راہ پر چلتا اور خدا اور رسول پر ایمان لاتا۔ اور یہ شہادت ادا کرتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے۔ میں تجھے خدا کے پیغام کی دعوت دیتا ہوں اور میں خدا کا رسولؐ ہوں مجھے جملہ نسلِ آدمؑ کی طرف بھیجا گیا ہے تاکہ جو کوئی زندہ ہے اسے عذابِ الٰہی کا ڈر سنا دیا جائے اور جو منکر ہیں۔ اُن پر خدا کا قول پورا ہو۔ تو مسلمان ہو جا۔ سلامت رہے گا۔ ورنہ مجوس کا گناہ تیرے ذمّہ ہو گا۔"

اس خط میں بھی سرورِ کونین حضرت محمدؐ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خسرو پرویز کو صرف اسلام قبول کرنے کی دعوت ہی دی ہے۔ اسلامی ریاست قائم کرنے کی ہرگز تاکید نہیں فرمائی اور نہ ہی یہ کہا کہ اسلام کا نظامِ سلطنت اس کی فلاح کا موجب ہے نہ ہی آپؐ نے اُسے اسلامی ریاست کا کوئی اصول ذہن نشین کرانے کی کوشش کی۔

(۵) خطبہ حجتہ الوداع

محبوبِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا آخری خطبۂ حج اسلامی تعلیمات اور شریعتِ نبویؐ کا نچوڑ سمجھا جاتا ہے۔ اس خطبے کے فوراً بعد اللہ تعالےٰ کی طرف سے آخری آیت نازل کی گئی۔ جس میں دین کے مکمل ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے کہ :۔

ترجمہ :۔ "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نصیحت کو پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام پسند کیا۔"

(حوالہ۔ سورۂ المائدہ پارہ نمبر ۶ آیت نمبر ۲)

خطبۂ حجتہ الوداع کا ترجمہ درج ذیل پیش کیا جا رہا ہے ملاحظہ فرمائیے :۔

(۵ الف) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ حجتہ الوداع :۔ (۱) لوگو!

میں خیال کرتا ہوں کہ میں اور تم پھر کبھی اس مجلس میں اکٹھے نہیں ہوں گے۔

(۲) لوگو! تمھارے خون تمھارے مال اور تمھاری عزتیں ایک دوسرے پر ایسی ہی حرام ہیں، جیسا کہ تم آج کے دن کی، اس شہر کی، اس مہینہ کی حرمت کرتے ہو۔ لوگو! تمھیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی بابت سوال فرمائے گا۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

(۳) لوگو! جاہلیت کی ہر ایک بات میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔ جاہلیت کے قتلوں کے تمام جھگڑے، ہدیل نے اُسے مار ڈالا تھا، میں چھوڑ رہا ہوں، جاہلیت کے زمانے کا سود ملیا میٹ کر دیا گیا۔ پہلا سود اپنے خاندان کا جو میں مٹاتا ہوں۔ وہ عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے۔ وہ سارے کا سارا چھوڑ دیا گیا۔

(۴) لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا۔ اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لیے حلال بنایا ہے۔

تمھارا حق عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ تمھارے بستر پر کسی غیر کو (کہ اس کا آنا تم کو ناگوار ہے) نہ آنے دیں لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسی مار مارو، جو نمودار نہ ہو۔

عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ تم ان کو اچھی طرح کھلاؤ۔ اچھی طرح پہناؤ۔

(۵) لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے مضبوط پکڑ لو گے تو بھی گمراہ نہ ہو گے۔ وہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔

(۶) لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی جدید امت پیدا ہونے

والی ہے۔ خوب سُن لو۔ کہ اپنے پروردگار کی عبادت کرو، اور پنجگانہ نماز ادا کرو۔ سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو۔ مالوں کی زکوٰۃ نہایت خوش دلی کے ساتھ دیا کرو۔ خانۂ خدا کا حج بجالاؤ۔ اور اپنے اولیائے امور و حکام کی اطاعت کرو۔ جس کی جزا یہ ہے کہ تم پروردگار کے فردوسِ بریں میں داخل ہوگے۔

(۷) لوگو! قیامت کے دن تم سے میری بابت بھی دریافت کیا جائے گا۔ مجھے ذرا بتادو کہ تم کیا جواب دوگے۔؟

سب نے کہا۔ ہم اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ کے احکام ہم کو پہنچا دیئے۔ آپؐ نے رسالت و نبوّت کا حق ادا کر دیا۔ آپؐ نے ہم کو کھوٹے کھرے کی بابت اچھی طرح بتادیا۔

(اس وقت) نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی انگشتِ شہادت کو اٹھایا آسمان کی طرف انگلی کو اٹھاتے تھے اور پھر لوگوں کی طرف جھکاتے تھے (فرماتے تھے) اے خدا سُن لے (تیرے بندے کیا کہہ رہے ہیں) اے خدا گواہ رہنا کہ (یہ لوگ کیا گواہی دے رہے ہیں) اے خدا شاہد رہ (کہ یہ سب کیسا صاف اقرار کر رہے ہیں۔)

(۸) دیکھو جو لوگ موجود ہیں، وہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں ہیں۔ ان کی تبلیغ کرتے رہو۔ ممکن ہے کہ بعض سامعین سے وہ لوگ زیادہ تر اس کلام کو یاد رکھنے اور حفاظت کرنے والے ہوں، جن پر تبلیغ کی جائے۔

اس خطبے میں بھی اسلامی ریاست کے قیام کا کوئی ذکر تک نہیں ملتا۔ نہ ہی ایسا کوئی اشارہ ملتا ہے کہ جس سے قیاس کیا جاسکے کہ مسلمانوں کے لیے کس قسم کا سیاسی نظام اختیار کرنا ضروری ہے۔

(۶) خلافت پر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سکوت

رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سفر آخرت اختیار کرنے سے پہلے نہ تو کسی شخص کو اپنا جانشین نامزد کیا اور نہ ہی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی یا سیاسی نظام کے بارے میں کوئی حکم صادر فرمایا۔ آپؐ کے طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہے کہ آپؐ نے دینِ اسلام کی تبلیغ واشاعت، مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل، خلافتِ رسولؐ سمیت تمام تر معاملات مسلمانوں کی مرضی ومنشا پر چھوڑ دیئے تھے یعنی وہ جس کو چاہیں اپنا امیر بنائیں، جس طرح چاہیں اپنی اجتماعی زندگی کو منظّم کریں۔ گویا ان تمام معاملات کا تعلق نبوّت کے مقاصد سے نہیں تھا۔

(۷) خلافتِ راشدہ

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کے بعد مسلمانوں کے اہلِ الرائے حضرات نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنا امیر یا خلیفۂ رسولؐ منتخب کر لیا۔ آپ نے دنیا سے رخصت ہوتے وقت اہلِ الرائے کے سامنے منصبِ خلافت کے لیے حضرت عمرؓ کا نام تجویز کیا جو منظور کر لیا گیا اور اس طرح حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفۂ دوم بن گئے۔ خلیفۂ دوم نے انتخابِ امیر کے لیے سرکردہ صحابۂ کرامؓ کی ایک کمیٹی تشکیل دی جس نے حضرت عثمانِ غنیؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا اور آپ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ منتخب کر لیے گئے۔ اس کے بعد خلافت بادشاہی میں تبدیل ہو گئی اور حضرت امیر معاویہؓ پہلے مسلمان بادشاہ بن گئے۔ آپ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کر دیا جو بعد میں خود بخود امیرالمومنین بن بیٹھا اور اس طرح تقریباً ایک سو سال تک بنو اُمیّہ کی حکمرانی قائم رہی۔ بعد ازاں ایک کامیاب بغاوت کے ذریعے بنو عباس نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ عباسی خاندان

تقریباً پانچ سو سال تک پوری اسلامی دنیا کا حکمران رہا۔ تاتاریوں کے بادشاہ ہلاکو خان نے عباسی خلافت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ اس کے بعد ترکی میں عثمانی خلافت قائم کی گئی جو ترکی کے قوم پرست لیڈر مصطفٰے کمال پاشا کے ہاتھوں ختم ہو کر تاریخ کے صفحات کا حصّہ بن گئی۔ علامہ اقبال نے ترکی کے اس اقدام پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:۔

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبر
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

(۸) جمہوری نظام کی ابتداء اسلامی دنیا میں مصطفٰے کمال اتاترک پہلا عظیم قائد تھا جس نے نظامِ خلافت کی کمزوری اور جمہوری نظام کی اہمیّت و افادیت کا مکمل ادراک حاصل کیا تھا۔ آپ نے خلافت کو ختم کر کے اسلامی دنیا میں سب سے پہلے مغربی طرز کا جمہوری نظام رائج کیا۔ اس کے بعد سے بیشتر مسلمان ممالک میں مصری طرز کی جمہوری حکومتیں قائم ہوئی ہیں اور اب پوری دنیا کے مسلمان ممالک رفتہ رفتہ جمہوری نظامِ حکومت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

(۹) مذہب اور سیاست کا اُصولی فرق مذہب اور سیاست میں بعض ایسے اُصولی اختلافات ہیں کہ جن کے پیشِ نظر یہ کبھی ایک ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔ اختلافات کی صورت یہ ہے:۔

(۱) مذہب عطیۂ خداوندی ہے اور اس کی بنیاد الہام اور وحی پر ہوتی ہے جبکہ سیاسی نظریات انسان خود تخلیق کرتا ہے اور ان کی بنیاد فلسفہ اور منطق پر ہوتی ہے۔

(۲) مذہب کا تعلق عقیدے اور ایمان سے ہے جو انسان کی رُوح اور وجدان کی تشکیل کرتے ہیں جبکہ سیاست کی بنیاد دلائل اور براہین پر استوار ہوتی ہے۔ جو انسان کی مادّی ضروریات پوری کرتی ہیں۔ شاعرِ مشرق علاّمہ اقبال نے عقل وخرد اور عرفان ووجدان کے درمیان پیدا ہونے والے فرق کو ایک نہایت ہی عمدہ مثال سے اس طرح واضح کیا ہے :۔

ع بُوعلی اندر غبارِ ناقہ گمُ
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

(۳) مذہب کے اصول ازلی وابدی ہوتے ہیں جبکہ سیاست کے اصول حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

(۴) مذہبی عقائد زمان ومکان کی قید سے آزاد ہوتے ہیں جبکہ سیاسی نظریات زمان ومکان کے پابند ہوتے ہیں اور ہر ملک اور ہر قوم اپنے اپنے سیاسی اصول اپنے اپنے گردو پیش کے مطابق وضع کرتے ہیں۔

غرضیکہ سیاست اور مذہب اپنے اپنے مقاصد، نصب العین اور طریقۂ کار کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں اور ان کے درمیان اشتراک کا کوئی امکان نہیں ہے۔ پاکستان میں اسلامی ریاست کی بدعت جماعتِ اسلامی کی اختراع تھی۔ جس کے سہارے یہ جماعت پاکستان پر آمریت مسلّط کرنے کے لیے شرمناک سرگرمیوں میں ملوّث رہی ہے۔ ۱۹۸۸ء کے حالیہ انتخابات سے کلّی طور پر یہ ثابت ہوگیا ہے کہ پاکستان میں عوام دشمن جماعتوں کا کوئی مستقبل نہیں ہے بالآخر یہ جماعتیں از خود صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں گی۔ البتہ یہ درست ہے کہ روائتی طور پر مسلمانوں نے مذہبی خلافتیں قائم کرکے اپنی نسلی اور مطلق العنان حکومتوں کو طول دینے میں خاطر خواہ کامیابیاں حاصل کی تھیں۔

جنرل ضیاءالحق نے بھی اپنی آمریت کو قائم رکھنے کے لیے تاریخی روایات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ اور وہ بھی گیارہ سال سے زائد عرصے تک قوم کے احتساب سے بالاتر ہو کر بلاشرکتِ غیرے اس ملک پر حکمرانی کرتا رہا ہے۔ اسلامی ریاست کا تصور ضیاءالحق کے مقاصد کی بھرپور تائید و حمایت کرتا تھا۔ اس لیے ضیاءالحق بھی اپنے وقت کا بہت بڑا مبلغِ اسلام بن گیا تھا چونکہ اسلامی ریاست میں اقتدار حاصل کرنے یا اقتدار منتقل کرنے کا کوئی اصول نہیں ہے۔ چنانچہ ہر یزید کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے کربلا برپا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے جماعتِ اسلامی کی پشت پناہی پر جنرل ضیاءالحق بھی اسلامی جمہوریت کے نام پر اپنے اقتدار کو مسلسل اور متواتر طول دیتا رہا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اصولی اور قانونی طور پر نہ تو وہ فوج کے سربراہ کے عہدے سے ہٹایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اُسے صدارت کے منصب سے الگ کیا جا سکتا ہے اس کو ہٹانے کے لیے قوم کو ایک طویل، کٹھن اور صبر آزما خانہ جنگی سے گزرنا ہو گا اور اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نے فوج کی قیادت بارہ سال تک اپنے پاس رکھی لیکن اللہ جو بڑا کارساز ہے نے قوم پر اپنا فضل و کرم کیا اور ضیاءالحق کو ابدی نیند سُلا کر اس کے ناپاک عزائم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا دیا۔

(۱۰) اسلامی ریاست

اس حقیقت سے انکار ممکن ہی نہیں کہ روایتی اور نظری اعتبار سے اسلامی نظریہ حیات کو انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا مرکز اور محور سمجھا جاتا رہا ہے۔ خواہ ان کا تعلق سیاسیات سے ہو، عمرانیات سے یا معاشیات سے ہو لیکن اسلام کی فکری اور سیاسی تاریخ پر صرف ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہمارا یہ اعتقاد متزلزل

ہونا شروع ہو جاتا ہے اور یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ عملی اعتبار سے مسلمانوں کا سیاسی نظام ہمیشہ عصری سیاسی تقاضوں اور معروضی حالات کے مطابق استوار ہوتا رہا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہوا ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کے لیے اسلام کے مقدّس نام کو استعمال کرنے سے کبھی بھی دریغ نہیں کیا۔ بعض حکمرانوں نے تو جنرل ضیاء الحق کی طرح ہر برائی کو اسلام کا لیبل لگا کر پیش کرنے سے بھی گریز نہیں کیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔ اس سے بڑھ کر اور ستم ظریفی کیا ہو سکتی ہے کہ مسلسل کئی سال تک بنو امیّہ کی اسلامی خلافت کے زمانے میں مساجد کے محراب و منبر کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذاتِ گرامی اور ان کی آل کے خلاف دشنام طرازی کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔

اس طرح اسلام کی فکری تاریخ میں بھی ہمیں اسلامی ریاست کا کوئی واضح نقشہ نظر نہیں آتا اور نہ ہی قرآن و سُنّت میں اسلام کے سیاسی نظام کی کوئی واضح ہدایات ملتی ہیں۔ اس صورتحال کے پیشِ نظر یہ تسلیم کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی کہ اسلامی ریاست محض ایک تصوّراتی چیز سے بڑھ کر اور کچھ نہیں۔ جس کا اسلام کے نظریاتی یا فکری نظام سے کوئی تعلّق نہیں ہے۔ قومیں اپنے ماضی کے خمیر سے مستقبل کے منصوبے مرتب کرتی ہیں۔ آج نہ صرف پاکستانی قوم بلکہ پوری دنیائے اسلام ایک سنگین قسم کے ذہنی خلفشار اور فکر و عمل کے تضاد کا شکار ہے۔ ایک طرف بنیاد پرست اور قدامت پسند گروہ ہے جو اپنی روایات سے سرمو ہٹنے کے لیے تیار نہیں جبکہ دوسری طرف روشن خیال نئی نسل ہے جو ماضی سے بیزار اور ترقی پسندی کی علمبردار ہے۔ یہ صورتحال سنجیدہ توجّہ کی متقاضی ہے اور ہمارا فرض ہے کہ

ہم جذبات سے ہٹ کر نہ صرف اسلامی بلکہ پوری دنیا کی ذہنی ترقی کا جائزہ لے کر اپنے لیے مستقبل کا لائحہ عمل تیار کریں۔ پاکستان اور پوری اسلامی دنیا کے بنیاد پرست طبقات اس بات پر مصر ہیں کہ اسلام میں سیاسی نظام، دین کا ہی ایک حصّہ ہے جبکہ ترقی پسند عناصر اس نکتۂ نظر کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے خیال میں مذہب اور سیاست کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔ مذہب کے مقاصد اور سیاست کی منازل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ترکی میں عثمانی خلافت کے زوال کے بعد اسلامی دنیا میں ترقی پسند عناصر کو ایک گونہ برتری حاصل ہوئی ہے اور اسلامی نظامِ فکر میں دین اور سیاست کی دوئی کا تصوّر زیادہ معتبر سمجھا جانے لگا ہے۔ ہم سے پہلے سیاست اور مذہب میں تفریق کے نظریات مغرب اور روس میں فیصلہ کن صورت اختیار کر چکے ہیں۔ مغربی دنیا میں پادری کو تمام سیاسی اور سماجی معاملات سے علیحدہ کیا جا چکا ہے۔ پادری کی تمام سرگرمیاں صرف گرجا گھر تک محدود ہیں جبکہ روس میں بالشیوک انقلاب کے بعد خداوند تعالےٰ کے وجود تک کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔
فی الواقع یہ صورتحال وہاں کے مذہبی قائدین کی تنگ نظری، مفاد پرستی، تعصّب، کم ظرفی اور رجعت پسندی کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ آج جب ہم اپنے قدامت پسند طبقات کا مقابلہ مغرب کے پادریوں سے کرتے ہیں تو ہمیں دونوں فرقوں کے طرزِ عمل اور مقاصد میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ ہمارے دینی اور روحانی قائد اسی طرح اقتدار پسندی، جاہ پرستی اور ہوسِ زر میں مبتلا ہیں جس طرح ماضی کے پادری ان بیماریوں میں مبتلا تھے۔ علامہ اقبال نے اس صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :-

ہم کو تو میسّر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن!
شہری ہو دیہاتی ہو مسلمان ہے سادہ
مانندِ بتاں پجتے ہیں کعبے کے برہمن!
نذرانہ نہیں ! سود ہے پیرانِ حرم کا
ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسندِ ارشاد
زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن

ہمارے روحانی قائدین کی جاہ پسندی کی کئی شرمناک مثالیں انگریزی دورِ حکومت کی تاریخ میں صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہم یہاں صرف ایک مثال پر ہی اکتفا کریں گے جس سے اس طبقے کے اصل مقاصد یعنی ملّت فروشی اور دین فروشی پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کا دن ہندوستان کی جنگِ آزادی کا سیاہ ترین دن شمار ہوتا ہے۔ اس دن پنجاب کے عوام نے اپنے قائدین کی گرفتاری کے خلاف جلیانوالہ باغ میں احتجاجی جلسہ منعقد کیا۔ اس موقع پر گورنر پنجاب مسٹر ایڈوائر کے حکم پر مجمع پر گولی چلا دی گئی جس کے نتیجے میں پانچ سو سے زائد بے گناہ افراد ہلاک ہوئے اور زخمیوں کی تعداد اس سے کئی گنا تھی۔ اس سنگین کاروائی کی وجہ سے اہلِ پنجاب کے دلوں میں انگریزی حکومت کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں پہلی جنگِ عظیم کے دوران انگریزوں نے اسلامی دنیا کو مختلف ریاستوں میں تقسیم کر کے خلافت عثمانیہ کے حلقۂ اقتدار سے الگ کر دیا تھا۔ پنجاب کے مسلمان اس کاروائی پر بھی سخت ناراض تھے۔ ان حالات میں پنجاب کے

سجادہ نشینوں اور روحانی قائدین نے گورنر پنجاب مسٹر ایڈ وائر اور سیڈی ایڈوائر کو ایک غیر سرکاری دربار میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بلایا اور ان کی خدمت میں حسبِ ذیل سپاسنامہ پیش کیا :۔

" بحضور نواب ہز آنر سر مائیکل فرانس ایڈ وائر جی ۔ سی ۔ آئی ۔ ای ۔ کے ۔ سی ۔ آئی ۔ ایس گورنر بہادر پنجاب ۔

حضورِ والا ۔ ! ہم خادم الفقراء سجادہ نشنیاں و علماء مع متعلقین شرکائے حاضر الوقت مغربی حصّہ پنجاب نہایت ادب و عجز و انکسار سے یہ ایڈریس لے کر خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے ہیں اور ہمیں یقینِ کامل ہے کہ حضورِ انور جن کی ذاتِ عالی صفات میں قدرت نے دل جوئی ، ذرّہ نوازی اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے ہم خاکسارانِ باوفا کے اظہارِ دل کو توجہ سے سماعت فرما کر ہمارے کلاہ فخر کو چار چاند لگا دیں گے ۔

سب سے پہلے ہم ایک دفعہ پھر حضورِ والا کو مبارکباد کہتے ہیں کہ جس عالمگیر اور خوفناک جنگ کا آغاز حضور کے عہدِ حکومت میں ہوا ، اس نے حضور ہی کے زمانے میں بخیر و خوبی انجام پایا اور یہ بابرکت و باحشمت سلطنت جس پر پہلے بھی کبھی سورج غروب نہیں ہوا تھا اب آگے سے زیادہ روشن اور اعلیٰ عظمت کے ساتھ جنگ سے فارغ ہوئی ۔ جیسا کہ شہنشاہِ معظّم نے اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا ہے ، واقعی برطانوی تلوار اس وقت نیام میں داخل ہوئی جب دنیا کی آزادی امن دامان اور چھوٹی چھوٹی قوموں کی بہبودی مکمل طور پر حاصل ہو کر بالآخر سچائی کا بول بالا ہو گیا ۔

حضور کا زمانہ ایک نہایت نازک زمانہ تھا اور پنجاب کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی عنانِ حکومت اس زمانہ میں حضور جیسے صاحبِ استقلال ، بیدار مغز ، عالی دماغ حاکم کے مضبوط ہاتھوں ، میں رہی جس نے نہ صرف ، اندرونی امن ہی قائم رکھا ، بلکہ

حضور کی دانشمندانہ رہنمائی میں پنجاب نے اپنا ایثار، وفاداری اور جانثاری کا وہ ثبوت دیا جس سے شمشیرِ سلطنت کا قابلِ فخر و عزت لقب پایا۔ بھرتی کا معراج صلیب احمر کی اعجازِ دست گیری، قیامِ امن کی تدبیر، تعلیم کی ترقی سب حضور کی بدولت ہمیں حاصل ہوئیں حضور ہی ہیں کہ جنہوں نے ہر موقع ہر وقت پنجاب کی خدمات و حقوق پر زور دیا۔ صرف جنابِ والا کو ہی ہماری بہبودی مطلوب نہ تھی بلکہ صلیبِ احمر نسواں کے نیک کاموں میں حضور کی ہمدم و ہمراز جنابہ لیڈی ایڈواٹر صاحبہ نے جن کو ہم مروت کی زندہ تصویر سمجھتے ہیں، ہمارا ہاتھ بٹایا اور ہندوستانی مستورات پر احسان کر کے ثوابِ دارین حاصل کیا۔ ہماری ادب سے التجا ہے کہ ہمارا شکریہ قبول فرمائیں۔

حضور انور! جس وقت ہم اپنی آزادیوں کی طرف خیال کرتے ہیں جو ہمیں سلطنتِ برطانیہ کے طفیل حاصل ہوئی ہیں، جب ہم ان دخانی جہازوں کو سطحِ سمندر پر اٹکھیلیاں کرتے دیکھتے ہیں، جن کے طفیل ہمیں اس مہیب جنگ میں امن و امان حاصل رہا۔ جب ہم تار برقی کے کرشموں پر علی گڑھ و اسلامیہ کالج لاہور، پشاور جیسے اسلامی کالجوں اور دیگر قومی درسگاہوں پر نظر ڈالتے ہیں اور پھر جب ہم بینظیر برطانوی انصاف کو دیکھتے ہیں، جس کی حکومت میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں تو پھر ہر طرف احسان ہی احسان دکھائی دے رہا ہے۔

ص بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد
کسے را با کسے کارے نہ باشد

باوجود فوجی قانون کے جو، خود فتنہ پردازوں کی شرارت کا نتیجہ تھا۔ مسلمانوں کے مذہبی احساس کا ہر طرح سے لحاظ رکھا گیا۔ شب برات کے موقع پر انہیں خاص رعائتیں دیں۔ رمضان المبارک کے واسطے حالانکہ اہلِ اسلام کی درخواست یہ تھی کہ فوجی قانون ساڑھے گیارہ بجے شب سے دو بجے تک مسدود کیا جائے۔

لیکن حکامِ سرکار نے یہ وقت بارہ بجے سے دو بجے کر دیا۔ مسجد شاہی جو فی الاصل قلعہ سے متعلق تھی، جو ابتدائی عمل داری سرکار ہی میں واگزار ہوئی تھی۔ اہالیان لاہور نے اس مقدس جگہ کو ناجائز سیاسی امور کے واسطے استعمال کیا۔ جس پر متولیانِ مسجد نے جو خود مفسدہ پردازوں کو روک نہیں سکتے تھے، سرکار سے امداد چاہی، یہی وجہ تھی کہ سرکار نے ایسا ناجائز استعمال بند کر دیا۔ ہم تہہ دل سے مشکور ہیں کہ حضورِ والا نے پھر اس کو واگزار کر دیا ہے۔

سرکار نے حج کے متعلق جو مہربانی کی ہے اس سے ہم ناآشنا نہیں اور مشکور ہیں۔ ہم سچ عرض کرتے ہیں کہ جو برکات ہمیں اس سلطنت کی بدولت حاصل ہوئیں اگر ہمیں عمرِ خضر بھی نصیب ہو تو بھی ہم ان احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کے لیے سلطنتِ برطانیہ ابرِ رحمت کی طرح نازل ہوئی اور ہمارے ایک بزرگ نے جس نے پہلے زمانہ کی خانہ جنگی اور بدامنیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اس سلطنت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا۔

ص ہوئیں بدنظمیاں سب دُور انگریزی عمل آیا
بجا آیا، بہ استحقاق آیا، بر محل آیا

ہم وہ احسان کبھی نہیں بھول سکتے جب ترکوں نے ہمارے مشورے کے خلاف کوتاہ اندیشی سے دشمنوں کی رفاقت اختیار کی تو ہمارے شہنشاہ نے ازراہِ کرم ہم کو یقین دلایا کہ ہمارے مقدس مقامات کی حرمت میں سرِ مُو فرق نہیں آئے گا۔ اس الطافِ خسروانہ نے ہماری وفا میں نئی روح پھونک دی۔ ھَلْ جَزَاءُ الاِحسان اِلَّا الاِحسان (احسان کا بدلہ احسان کے سوا نہیں ہے)

ہم ان احسانوں کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ اب اس جنگ کے خاتمے پر صُلح کانفرنس سلطنتِ ترکیہ کی نسبت جلد فیصلہ ہونے والا ہے۔ ممکن ہے یہ فیصلہ مسلمانوں کی

اُمیدوں کے برخلاف ہو لیکن ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس فیصلے میں سرکارِ برطانیہ اکیلی مختار کار نہیں ہے بلکہ بہت سی طاقتوں کا بھی اس میں ہاتھ ہے۔ شہنشاہِ معظمؔ کے وزراء جو کوششیں ترکی کے حق میں کرتے رہے ہم اس کے واسطے سے ان کے بہرحال مشکور ہیں۔ یہ امر مُسلّمہ ہے کہ یہ جنگ مذہبی اغراض پر مبنی نہ تھی اور اپنے اپنے عمل کا اور اس کے نتائج کا ہر ایک ذمّہ دار ہے۔

ص رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند
گدائے گوشہ نشینی تو حافظاؔ مخروش

مگر ہمیں پوری توقع ہے کہ ہماری گورنمنٹ اس بات کا خیال رکھے گی کہ مقاماتِ مقدّسہ کا اندرونی نظم و نسق مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں رہے اور ہم حضور سے درخواست کرتے ہیں کہ جب حضور وطن کو تشریف لے جائیں تو اس نامور تاجدارِ ہندوستان کو یقین دلائیں کہ چاہے کیسا ہی انقلاب کیوں نہ ہو ہماری وفاداری میں سرِ مُو فرق نہ آیا ہے اور نہ آسکتا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اور ہمارے پیروان اور مُریدان فوجی وغیرہ جن پر سرکارِ برطانیہ کے بے شمار احسانات ہیں ہمیشہ سرکار کے حلقہ بگوش اور جانثار رہیں گے۔

ہمیں نہایت رنج و افسوس ہے کہ ناتجربہ کار نوجوان امیر اللہ خان والئی کابل نے کسی غلط مشورے سے عہد ناموں کے اور اپنے باپ دادا کے طرزِ عمل کی خلاف ورزی کرکے خداوند تعالیٰ کے صریح حکم یعنی:۔
ترجمہ: "وعدے کا ایفا کرو۔ ضرور وعدے کے متعلق پوچھا جائے گا۔" کی نافرمانی کی ہم جنابِ والا کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم امیر امان اللہ کے اس طرزِ عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ہم اہلیانِ پنجاب احمد شاہ کے حملوں اور نادر شاہی قتل و غارت گری کو

نہیں بھول سکتے۔ ہم اس غلط اعلان کی جس میں اس نے سراسر خلافِ واقعہ لکھا ہے کہ اس سلطنت کی مذہبی آزادی میں خدانخواستہ رکاوٹ واقع ہوئی تردید کرتے ہیں۔ امیر امان اللہ خان کا خاندان سرکارِ انگلشیہ کی بدولت بنا اور اس کی احسان فراموشی کفرانِ نعمت سے کم نہیں۔

ہم کوان کوتاہ اندیش دشمنانِ ملک پر بھی سخت افسوس ہے جن کی سازش سے تمام ملک میں بدامنی پھیل گئی اور جنہوں نے اپنی حرکاتِ ناشائستہ سے پنجاب کے نیک نام پر دھبہ لگایا۔ مقابلہ آخر مقابلہ ہی ہے اور کبھی خاموش نہیں رہ سکتا۔ یہ حضور والا ہی کا زبردست ہاتھ تھا جس نے بے چینی و بدامنی کا اپنے حسنِ تدبر سے فی الفور قلع قمع کر دیا۔ ان بدبختوں سے ازراہِ بدبختی فاش غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن حضور ابرِ رحمت ہیں اور ابرِ رحمت زرخیز اور شور زمین دونوں پر یکساں برستا ہے۔ ہم حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان گمراہ لوگوں کی مجنونانہ و جاہلانہ حرکات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے قرآن کریم میں یہی تلقین کی گئی ہے کہ: "دنیا میں فساد اور بدامنی مت پیدا کرو اور بے شک خدا فساد کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔"

حضور انور! اگرچہ آپ کی مفارقت کا ہمیں کمالِ رنج ہے۔

ع
سرِ غم سے جھکے کیوں نہ سردار ہمارا
لو ہم سے چھٹا جاتا ہے سردار ہمارا

لیکن ساتھ ہی ہماری خوش نصیبی ہے کہ حضور کے جانشین سر ایڈورڈ میکلیگن بالقابہم جن کے نام نامی سے پنجاب کا بچہ بچہ واقف ہے، جن کا حسنِ اخلاق رعایا نوازی میں شہرہ آفاق ہے۔ جو ہمارے لیے حضور کے پورے نعم البدل ہیں۔ ہم ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کی خدمت میں یقین دلاتے ہیں کہ ہم مثل سابق اپنی عقیدت و وفاداری کا ثبوت دیتے رہیں گے۔

حضور اب وطن کو تشریف لے جانے والے ہیں۔ ہم دعاگو یاں جناب باری میں دعا کرتے ہیں کہ حضور مع لیڈی صاحبہ و جمیع متعلقین مع الخیر اپنے پیارے وطن پہنچیں، تا دیر سلامت رہیں اور وہاں جا کر ہم کو دل سے نہ اتار دیں۔

ع این دعا از ما و از جملہ جہاں آمین باد

المستدعیاں

مخدوم حسن بخش قریشی، مخدوم غلام قاسم سجادہ نشین خانقاہ، مخدوم شیخ محمد، نواب حسن، مخدوم سید حسن علی، سید ریاض الدین شاہ، پیر غلام عباس شاہ، دیوان سید محمد پاکپتن، خان بہادر مخدوم حسن بخش آف ملتان، میاں نور احمد سجادہ نشین، پیر محمد رشید، شیخ شہاب الدین، خان بہادر شیخ احمد، سید محمد حسین شاہ شیر گڑھ ضلع منٹگمری، مخدوم شیخ محمد راجو آف ملتان، دیوان محمد غوث، محمد مہر علی شاہ جلالپور، پیر محمد خضر حیات شاہ، صاحبزادہ محمد سعد اللہ آف سیال شریف، سید غلام محی الدین خلف الرشید سید مہر علی شاہ آف گولڑہ شریف، سید قطب علی شاہ آف ملتان، پیر چراغ علی آف ملتان، پیر ناصر الدین شاہ آف شاہ پور، پیر غلام احمد شاہ آف شاہ پور مخدوم غلام قاسم سجادہ نشین، سید نوازش حسین شاہ آف شیر گڑھ ضلع منٹگمری، مولوی غلام محمد خادم گولڑہ شریف، سید فدا حسین شاہ ضلع کیمبل پور، محمد اکبر شاہ آف شیر شاہ ملتان، غلام قاسم شاہ آف شیر شاہ ملتان، مولوی سید زین العابدین شاہ آف ملتان، پیر چراغ شاہ کوٹ سدھانہ جھنگ، محبوب عالم خادم گولڑہ شریف، منشی حیات محمد گولڑہ شریف، برہان الدین خادم گولڑہ شریف۔

اس سپاسنامے کو پڑھنے کے بعد ہر مسلمان کے دل میں ان پیروں، سجادہ نشینوں اور روحانی قائدین کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہونا ایک بالکل فطری قدرتی اور طبعی امر ہے۔ ظاہر ہے کوئی بھی پاکستانی ان پیروں کی قیادت میں اپنی

سیاسی منزل متعین نہیں کر سکتا۔ یہی حضرات تھے۔ جنہوں نے جنرل ضیاء الحق کی آمریت کو مضبوط بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور اس کے بدلے ضیاء الحق سے جی بھر کر سیاسی و مالی مفادات حاصل کیے۔ ضیاء الحق سال میں ایک آدھ بار ان سجادہ نشین صاحبان کو صدر ہاؤس میں بلاتے وہاں اُن کی خوب خاطر مدارت کی جاتی اور انہیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا۔ یہ حضرات آئندہ ملاقات تک ضیاء الحق کے قصیدے پڑھتے رہتے تھے۔ جنرل ضیاء الحق نے ہر مجاور کو اس کی سماجی حیثیت کے مطابق سیاسی اور انتظامی معاملات میں نہایت اہم عہدے تقسیم کیے۔ ایک مجاور کو ایک صوبے کا گورنر بنا دیا گیا جبکہ ایک دوسرے صاحب کو بساطِ سیاست کا بادشاہ بنا دیا گیا۔ یعنی ہر اعلیٰ عہدہ ان کے مشورے سے تفویض کیا جاتا تھا لیکن ۱۹۸۸ء کے انتخابات نے ان استخوان کے تاجروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تعویذ گنڈے کی طرف ہی مراجعت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ان بزرگانِ دین کو مغرب کے پادریوں کی طرح ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی سے علیحدہ کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مساجد اور ممبروں کی زینت بنا دیا جائے۔

(۱۱) دین کی تعریف

عربی زبان میں دین اور اسلام کے الفاظ اطاعت و فرمانبرداری کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں دینِ اسلام سے مراد اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات، آسمانی کتابوں، فرشتوں اور روزِ قیامت پر ایمان لانا ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغمبروں کی اطاعت اور پیروی کرنا ہے۔ دنیا بھر کے انبیاء علیہ السلام صرف دینِ اسلام ہی کے پیغمبر تھے یعنی بابائے انسانیت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جتنے بھی انبیاء اس دنیا میں تشریف لائے ہیں ان سب کا مشن اور مقصدِ حیات دینِ اسلام کی تبلیغ کرنا ہی تھا۔ اللہ جل شانہٗ،

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمّت کو حضرتِ ابراہیم علیہ السّلام جو کہ ہمارے نبیؐ کے جدِّ امجد تھے کی شریعت پر چلنے کا حکم دیا۔ ارشادِ ربّانی ہے کہ:۔

ترجمہ:۔ واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم اپنی ذات سے ایک پوری اُمّت تھا۔ اللہ کا مطیع، فرمان اور یکسو۔ وہ کبھی مشرک نہ تھا۔ اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا تھا۔ اللہ نے اس کو منتخب کر لیا اور سیدھا راستہ دکھایا۔ دنیا میں اس کو بھلائی دی اور آخرت میں وہ یقیناً مومنین میں سے ہوگا۔ پھر ہم نے تمہاری طرف یہ وحی بھیجی کہ ایک ہو کر ابراہیم کے طریقے پر چلتے چلو اور وہ مشرکوں میں سے نہیں۔

(۱۶ سورۂ نحل پارہ نمبر ۱۴ آیات نمبر ۱۲۰ تا ۱۲۳)

گویا ہمیں جس طریقے سے چلنے کا حکم دیا ہے اس کا تعیّن حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اللہ تعالےٰ کے حکم کے عین مطابق کیا تھا۔ بہترین اسلام کی ابتدائی اور بنیادی تعلیمات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی حیاتِ طیبّہ، دعوتِ اسلام اور احکامات سے رہنمائی حاصل کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر مختلف انداز میں آیا ہے۔ جس سے آپ کے خاندانی ماحول سماجی معاملات، حالات اور تعلیمات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ علاوہ ازیں تورات اور دیگر آسمانی کتابوں میں آپ کی عظمت اور مشکلات کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ اس ضمن میں اب ہم بائیبل کی درج ذیل آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

بائیبل کی کتاب پیدائش میں کہا گیا ہے کہ:۔

آیت نمبر ۱ ” اور خداوند نے ابراہیم سے کہا کہ تو اپنے وطن، اپنے ناطے داروں کے بیچ سے اور اپنے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا، جو میں تمہیں دکھاؤں گا۔“

آیت نمبر ۲:۔ ” اور میں تمہیں ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام

سرفراز کروں گا۔ سو تُو باعثِ برکت ہے۔"
آیت نمبر ۳ : "جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے۔"
آیت نمبر ۴ : "سو ابراہیم خداوند کے کہنے کے مطابق چل پڑا اور لُوط اس کیساتھ ہو گیا اور ابراہیم پچھتّر برس کا تھا۔ جب وہ حاران سے روانہ ہوا۔"
آیت نمبر ۵ : "اور ابراہیم نے اپنی بیوی سارا اور بھتیجے لُوط کو اور سب مال کو جو انہوں نے جمع کیا تھا اور ان آدمیوں کو جو ان کو حاران میں مل گئے تھے، ساتھ لیا اور وہ مُلکِ کنعان کو روانہ ہوئے اور ملکِ کنعان میں آئے۔"
آیت نمبر ۶ : "اور ابراہیم اس ملک میں سے گذرتا ہوا مقامِ سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا۔ اس وقت مُلک میں کنعانی رہتے تھے۔"
(حوالہ:۔ کتاب پیدائش باب نمبر ۱۲۔ آیات نمبر ۱ تا ۶)
حضرت ابراہیم علیہ السّلام تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح عراق کے صدر مقام اُر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بادشاہِ وقت یعنی نمرود کے دربار میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اُر کی تمام آبادی بُت پرست تھی۔ ان کا سب سے بڑا بُت "ننار" ایک بلند پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اس کے قریب ہی اس بُت کی بیوی "ننگلی" کا معبد تھا۔ اس مندر میں اکثر عورتیں دیوتاؤں کے نام پر وقف ہوتی تھیں۔ مذہبی عقائد کے مطابق سب سے زیادہ معزز اس خاتون کو سمجھا جاتا تھا جو خدا کے نام پر اپنی عصمت لٹاتی تھی۔ یہ خیال عام تھا کہ جب تک کوئی خاتون زندگی میں کم از کم ایک دفعہ اپنے آپ کو کسی اجنبی کے حوالے نہ کر دے اس کی نجات ممکن ہی نہ تھی۔ نمرود خود ان بتوں کی پُوجا کرتا

تھا اور اس کے اختیارِ حکمرانی کا منبع یہ بُت ہی تھے چونکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منصبِ نبوّت پر فائز کیا تھا لہٰذا آپ نے روزِ اوّل سے ہی اپنے باپ کے دین یعنی بُت پرستی کو مسترد کر دیا اور بُت پرستی کے خلاف کھلے عام احتجاج کرنے کی مہم شروع کر دی اور اپنے لیے دینِ اسلام اختیار کرنے کا واضح طور پر اعلان کر دیا۔ قرآنِ پاک میں ارشادِ ربّانی ہے کہ :۔

ترجمہ :۔" ابراہیمؑ کا واقعہ یاد کرو جبکہ اس نے اپنے باپ آزر سے کہا تھا۔" کیا تو بتوں کو خدا مانتا ہے ؟ میں تو تجھے اور تیری قوم کو کھلی گمراہی میں پاتا ہوں " ابراہیمؑ کو ہم اسی طرح زمین اور آسمانوں کا نظام سلطنت دکھاتے تھے اور اس لیے دکھاتے تھے کہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے ۔ چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تارا دیکھا۔ کہا یہ میرا رب ہے۔ مگر جب وہ ڈوب گیا تو وہ بولا ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رَب ۔ مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا اگر میرے رَب نے میری رہنمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا۔ پھر جب سورج کو روشن دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رَب ، یہ سب سے بڑا ہے۔ مگر جب وہ بھی ڈوبا تو ابراہیمؑ پکار اٹھا " اے برادرانِ قوم ! میں ان سب سے بیزار ہوں جنھیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے تو یکسُو ہو کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں "۔ اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا " کیا تم لوگ اللہ کے معاملہ میں مجھ سے جھگڑتے ہو۔؟ حالانکہ اس نے مجھے راہِ راست دکھا دی ہے اور میں تمھارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا ، ہاں اگر میرا رَب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رَب کا علم ہر

چیز پر چھایا ہوا ہے، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے ؟ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جبکہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی واطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ!! اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ حقیقت میں تو امن انہی کے لیے ہے اور راہِ راست پر وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا۔"

(پارہ نمبر ۷ سورۃ الانعام آیات نمبر ۷۴ تا ۸۲)

غرضیکہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے کفر، شرک اور بُت پرستی کیخلاف آواز بلند کی اور اپنی قوم کو توحید پرستی کی دعوت دی۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے اسی نکتۂ نظر کو مرزا اسد اللہ خان غالب نے نہایت ہی خوبصورت انداز میں اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

ص یا من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شُد صاحبِ نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

ترجمہ:۔ "ابّا جان مجھ سے مت لڑو۔ آزر کے بیٹے ابراہیم علیہ السّلام کو دیکھو، ہر شخص جو صاحبِ نظر ہوتا ہے بزرگوں کے دین پر خوش نہیں رہتا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے بُت پرستی کے خلاف زبانی احتجاج کے علاوہ ایک عملی اقدام یہ بھی اٹھایا کہ ایک دن جب شہر کے لوگ ایک میلے میں شرکت کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے موقع غنیمت جان کر تمام بتوں کو توڑ دیا۔ اور کلہاڑہ بڑے بُت کی گردن میں ڈال دیا۔ جب تمام لوگ واپس لوٹے اور اپنے معبودوں کا یہ بُرا حال دیکھا تو فوراً سمجھ گئے کہ

یہ کاروائی صرف حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی ۔ چنانچہ آپ کو طلب کر کے پوچھا گیا کہ یہ سب کچھ کس نے کیا ہے ۔ ؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ : (جسے قرآن پاک نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے :)

ترجمہ : ”بلکہ یہ فعل ان کے اس بڑے نے کیا ہے ۔ ان زخمی بتوں سے پوچھ لو اگر یہ بول سکتے ہیں ۔“ (حوالہ سورۃ الانبیا آیت نمبر ۶۳ پارہ نمبر ۱۷)

اس واقعہ کی شکایت حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے والد آزر نے نمرود سے کی حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو نمرود کے دربار میں طلب کیا گیا اور آپ کے ساتھ نمرود کی جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل ہم اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں بیان کر چکے ہیں ۔ بہر حال نمرود نے اپنی خفت مٹانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو جیل میں بند کر دیا اور چند دنوں کے بعد آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا ۔ جو اللہ تعالےٰ کے حکم سے آپ پر گلزار ہو گئی ۔ اور آپ کو کسی قسم کا کوئی گزند نہ پہنچا ۔ اس واقعہ نے نمرود اور اس کی قوم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ۔ شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال نے اس واقعہ کو ان خوبصورت الفاظ میں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :

ص بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اس واقعہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السّلام تبلیغِ دین کے لیے اپنے گھر سے نکل کھڑے ہوئے ۔ آپ کی بیوی سارا اور بھتیجے حضرت لُوط علیہ السّلام آپ کے ہمراہ تھے ۔ آپ مصر اور اُردن کے راستے فلسطین چلے گئے ۔ اور حاران کے مقام پر قیام پذیر ہو گئے ۔ آپ نے اسی مقام پر ایک سو پچھتّر برس کی عمر میں انتقال فرمایا ۔ اور یروشلم سے تقریباً بیس میل کے فاصلے پر دفن ہوئے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں ۔ ایک حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد ، جو عرب

میں مقیم ہوئی اور دوسری حضرت اسحاق علیہ السّلام کی اولاد جو فلسطین میں قیام پذیر ہوئی۔

حضرت اسحاق علیہ السّلام کی اولاد سے بے شمار پیغمبر پیدا ہوئے جبکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی اولاد سے پیغمبر آخرالزماں حضرت محمّد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منصبِ نبوّت سے سرفراز کیا گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اپنے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی مدد سے خانہ کعبہ مکّہ معظمہ میں تعمیر کیا جب کہ حضرت سلیمان علیہ السّلام نے یروشلم میں بنی اسرائیل کی سب سے بڑی عبادت گاہ "ہیکل سلیمانی" کو تعمیر کیا۔ اس طرح دنیا کے تمام انبیاء میں سے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ دنیا کی چاروں آسمانی کتابیں یعنی توریت، زبور، انجیل اور قرآن پاک آپ کی نسل سے پیدا ہونے والے پیغمبروں پر اتاری گئیں اور دنیا کی مقدّس ترین عبادت گاہیں آپ کے اور آپ کے خاندان کے ہاتھوں ہی پایۂ تکمیل کو پہنچیں۔

مندرجہ بالا واقعات اور حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی حیاتِ طیبّہ اور تعلیمات سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپ کے پیغام کا مقصد صرف اور صرف خدائے وحدہٗ لاشریک کی پرستش کرانا اور کفر و شرک اور بُت پرستی کا سدِّ باب کرنا تھا۔ آپ نے کبھی بھی نمرود کے سیاسی اقتدار اور بادشاہت کو چیلنج نہیں کیا اور نہ ہی کبھی اپنے لیے یا اپنے خاندان کے لیے بادشاہت یا سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا منصب عقیدۂ توحید کی وضاحت کرنا اور عقائد و عبادات کا ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جو منشائے ایزدی کے عین مطابق ہو۔ آپ کو اسی مقصد کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا تھا۔ قرآن پاک نے ان مقاصد کی شہادت حسبِ ذیل الفاظ میں دی ہے :۔

ترجمہ: "وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بُری طرح ناکام کر دیا اور ہم اسے اور لوطؑ کو بچا کر اس سرزمین کی طرف نکال کر لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں اور ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کیا اور ہم نے ان کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعے نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت گذار تھے۔"

(پارہ نمبر ۱۷ سورۃ الانبیاء آیات نمبر ۷۰ تا ۷۳)

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے حوالے سے قرآنِ مجید یا دیگر کسی بھی آسمانی کتاب میں ایسا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السّلام یا اولادِ ابراہیم علیہ السّلام کو کسی بھی ملک کے سیاسی، سماجی، انتظامی یا اقتصادی نظام کو تبدیل کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔ اس کے برعکس یہ حقیقت بھی قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل میں پیدا ہونے والے تمام انبیاء علیہ السّلام صرف عقیدۂ توحید کی تبلیغ اور نشر و اشاعت میں سرگرمِ عمل رہے ہیں اور ان میں سے کسی نے بھی اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کبھی نہ تو کوشش کی اور نہ ہی کبھی ایسا کوئی سیاسی نظریہ وضع کیا۔ ان حقائق سے واضح ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی شریعت میں کسی بھی سیاسی نظامِ فلسفہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۱۲) حضرت یوسف علیہ السّلام

آپ بھی اللہ کے نبی تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے پہلے پیغمبر ہیں جن کا حکومتِ مصر کے سیاسی یا انتظامی معاملات سے کسی قسم کا تعلق رہا ہے۔ آپ کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام بمقامِ حبرون گلہ بانی کرتے تھے حضرت یعقوب علیہ السلام کی چار بیویاں اور بارہ فرزند تھے۔ حضرت یوسف علیہ السّلام

اور بنیامین آپس میں سگے بھائی تھے۔ کنعان کے علاقے میں اس وقت کوئی منظّم ریاست موجود نہیں تھی! اور نہ ہی تہذیب و تمدّن کے کوئی آثار تھے جبکہ پڑوسی علاقے میں مصری ریاست اپنے تہذیبی عروج پر تھی۔ حضرت یوسف علیہ السّلام کا تذکرہ بائیبل کی کتاب پیدائش اور قرآنِ پاک کی سورۂ یوسف میں نہایت تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ نیز تاریخ اور ادبیات کی بیشتر کتابوں میں بھی آپ کے حالات خاص طور پر درج کیے گئے ہیں۔ گویا منصبِ نبوّت کے ساتھ ساتھ آپ نے ایک رومانوی ہیرو کی حیثیت سے بھی بے پناہ شہرت حاصل کی۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم آسمانی کتابوں کے حوالہ جات پیش کرتے ہیں۔ بائیبل اور قرآنِ حکیم میں حضرت یوسف علیہ السّلام کی زندگی اور نبوّت کے واقعات تقریبًا ایک ہی جیسے ہیں اور ان میں کوئی خاص بنیادی فرق نہیں ہے۔

بائیبل کی کتاب پیدائش باب نمبر ۳۷ آیات نمبر ۵ تا ۳۶ میں حضرت یوسف علیہ السّلام کی زندگی کے واقعات اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

آیت نمبر ۵: ”اور یوسف نے ایک خواب دیکھا جسے اس نے اپنے بھائیوں کو بتایا تو وہ اس سے اور بھی بغض رکھنے لگے۔“

آیت نمبر ۶: ”اور اس نے ان سے کہا ذرا وہ خواب تو سنو جو میں نے دیکھا ہے“

آیت نمبر ۷: ”ہم کھیت میں پولے باندھتے تھے اور کیا دیکھتا ہوں کہ میرا پولا اُٹھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا اور تمہارے پولوں نے میرے پولے کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اسے سجدہ کیا۔“

آیت نمبر ۸: ”تب اس کے بھائیوں نے اس سے کہا کہ کیا تو سچ مچ ہم پر سلطنت کرے گا یا ہم پر تیرا تسلّط ہو گا؟ اور انہوں نے اُس کے خوابوں اور اس کی باتوں کے سبب سے اُس سے اور بھی زیادہ بغض رکھا۔“

آیت نمبر ۹: "پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا اور اپنے بھائیوں کو بتایا۔ اس نے کہا دیکھو مجھے ایک اور خواب دکھائی دیا ہے کہ سورج اور چاند اور گیارہ ستاروں نے مجھے سجدہ کیا۔"

آیت نمبر ۱۰: "اور اس نے اسے اپنے باپ اور بھائیوں دونوں کو بتایا۔ تب اس کے باپ نے اُسے ڈانٹا اور کہا کہ یہ خواب کیا ہے جو تُو نے دیکھا ہے۔؟ کیا مَیں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جُھک کر تجھے سجدہ کریں گے۔؟"

آیت نمبر ۱۱: "اور اس کے بھائیوں کو اس سے حسد ہو گیا لیکن اس کے باپ نے یہ بات یاد رکھی۔"

آیت نمبر ۱۲: "اور اس کے بھائی اپنے باپ کی بھیڑ بکریاں چرانے سکم کو گئے۔"

آیت نمبر ۱۳: "تب اسرائیل نے یوسف سے کہا تیرے بھائی سکم میں بھیڑ بکریوں کو چرا رہے ہوں گے۔ سو آ کہ مَیں تجھے ان کے پاس بھیجوں۔ اس نے کہا مَیں تیار ہوں۔"

آیت نمبر ۱۴: "تب اس نے کہا تُو جا کر دیکھ کہ تیرے بھائیوں کا اور بھیڑ بکریوں کا کیا حال ہے اور آ کر مجھے خبر دے۔ سو اس نے اُسے حبرون کی وادی سے بھیجا اور وہ سکم میں آیا۔"

آیت نمبر ۱۵: "اور ایک شخص نے اُسے میدان میں اِدھر اُدھر آوارہ پھرتے پایا۔ یہ دیکھ کر اس شخص نے اس سے پُوچھا کہ تُو کیا ڈھونڈتا ہے۔؟"

آیت نمبر ۱۶: "اس نے کہا میں اپنے بھائیوں کو ڈھونڈتا ہوں ذرا مجھے بتا دے کہ وہ بھیڑ بکریوں کو کہاں چرا رہے ہیں؟"

آیت نمبر ۱۷: "اس شخص نے کہا وہ یہاں سے چلے گئے ہیں کیونکہ میں نے اُن کو

یہ کہتے سُنا کہ چلو ہم دُوتین کو جائیں۔ چنانچہ یوسف اپنے بھائیوں کی تلاش میں چلا اور اُن کو دُوتین میں پایا۔"

آیت نمبر ۱۸: "اور جُوں ہی انہوں نے اُسے دور سے دیکھا تو پیشتر اس سے کہ وہ نزدیک پہنچے اس کے قتل کا منصوبہ باندھا۔"

آیت نمبر ۱۹: "اور آپس میں کہنے لگے دیکھو خوابوں کا دیکھنے والا آرہا ہے۔"

آیت نمبر ۲۰: "آؤ اب ہم اُسے مار ڈالیں اور کسی گڑھے میں ڈال دیں اور یہ کہہ دیں گے کہ کوئی بُرا درندہ اُسے کھا گیا۔ پھر دیکھیں گے کہ اس کے خوابوں کا انجام کیا ہونا ہے۔"

آیت نمبر ۲۱: "تب رُوبن نے یہ سن کر اسے ان کے ہاتھوں سے بچایا اور کہا ہم اس کی جان نہ لیں۔"

آیت نمبر ۲۲: "اور رُوبن نے ان سے یہ بھی کہا کہ خون نہ بہاؤ بلکہ اسے اس گڑھے میں جو بیابان میں ہے ڈالدو لیکن اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے ان کے ہاتھ سے بچا کر اس کے باپ کے پاس سلامت پہنچا دے۔"

آیت نمبر ۲۳: "اور یوں ہوا کہ جب یوسف اپنے بھائیوں کے پاس پہنچا تو انہوں نے اس کی بُوقلموں قبا کو جو وہ پہنے تھا اتار لیا۔"

آیت نمبر ۲۴: "اور اُسے اٹھا کر گڑھے میں ڈال دیا۔ وہ گڑھا سُوکھا تھا اس میں ذرا بھی پانی نہ تھا۔"

آیت نمبر ۲۵: "اور وہ کھانا کھانے بیٹھے اور آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ اسمٰعیلیوں کا ایک قافلہ جلعاد سے آرہا ہے اور گرم مصالحہ اور روغن بلسان اور مُر اونٹوں پر لادے ہوئے مصر کو لیے جا رہا ہے۔"

آیت نمبر ۲۶: "تب یہوداہ نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہم اپنے بھائی کو مار ڈالیں

اور اس کا خون چھپائیں تو کیا نفع ہوگا۔؟"

آیت نمبر ۲۷: "آؤ اسے اسمٰعیلیوں کے ہاتھوں بیچ ڈالیں کہ ہمارا ہاتھ اس پر نہ اُٹھے کیوں کہ وہ ہمارا بھائی اور ہمارا خون ہے۔ اس کے بھائیوں نے اس کی بات مان لی۔"

آیت نمبر ۲۸: "پھر وہ مِدیانی سوداگر اُدھر سے گزرے۔ تب انہوں نے یوسف کو کھینچ کر گڑھے سے نکالا اور اسے اسمٰعیلیوں کے ہاتھ بیس روپے کو بیچ ڈالا اور وہ یوسف کو مصر میں لے گئے۔"

آیت نمبر ۲۹: "جب رُوبِن گڑھے پر لوٹ کر آیا اور دیکھا کہ یوسف اس میں نہیں ہے تو اپنا پیراہن چاک کیا۔"

آیت نمبر ۳۰: "اور اپنے بھائیوں کے پاس اُلٹا پھرا اور کہنے لگا کہ لڑکا تو وہاں نہیں ہے۔ اب میں کہاں جاؤں۔؟"

آیت نمبر ۳۱: "پھر انہوں نے یوسف کی قبا لے کر اور ایک بکرا ذبح کر کے اُسے اس کے خون میں تر کیا۔"

آیت نمبر ۳۲: "اور انہوں نے اس بُوقلمُون قبا کو بھجوا دیا۔ سو وہ اُسے ان کے باپ کے پاس لے آئے اور کہا کہ ہم کو یہ چیز پڑی ہوئی ملی۔ اب تو پہچان کہ یہ تیرے بیٹے کی قبا ہے یا نہیں۔؟"

آیت نمبر ۳۳: "اور اس نے اُسے پہچان لیا اور کہا کہ یہ تو میرے بیٹے کی قبا ہے۔ کوئی بُرا درندہ اسے کھا گیا ہے۔ یوُسف بے شک پھاڑا گیا۔"

آیت نمبر ۳۴: "تب یعقوب نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا۔"

آیت نمبر ۳۵: "اور اس کے سب بیٹے بیٹیاں اسے تسلّیاں دینے جاتے تھے پر اُسے تسلّی نہ ہوتی تھی۔ وہ یہی کہتا رہا کہ میں تو ماتم ہی کرتا ہوا قبر میں اپنے بیٹے سے جا ملوں گا،

گا۔ سو اس کا باپ اس کے لیے روتا رہا۔"

آیت نمبر ۳۶: "اور مدیانیوں نے اسے مصر میں فوطیفار کے ہاتھ جو فرعون کا ایک حاکم اور جلوداروں کا سردار تھا بیچا۔"

قرآنِ پاک میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ دیکھئے۔ ترجمہ سورۂ یوسف پارہ نمبر ۱۲۔ آیات نمبر ۴ تا ۱۷)

ترجمہ: "یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا "اباجان، میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔" جواب میں اس کے باپ نے کہا، "بیٹا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سُنانا ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے، حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے اور ایسا ہی ہو گا (جیسا تُو نے خواب میں دیکھا ہے کہ) تیرا رَب تجھے (اپنے کام کے لیے) منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھائے گا اور تیرے اوپر اور آلِ یعقوبؑ پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا۔ جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں، ابراہیمؑ اور اسحاقؑ پر کر چکا ہے، یقیناً تیرا رَب علیم اور حکیم ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ یوسفؑ اور اس کے بھائیوں کے قصّہ میں ان پُوچھنے والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یہ قصّہ یوں شروع ہوتا ہے کہ اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا "یہ یوسفؑ اور اس کا بھائی، دونوں ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم ایک پورا جتھا ہیں۔ سچّی بات یہ ہے کہ ہمارے ابّا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں۔ چلو یوسفؑ کو قتل کر دو یا اُسے کہیں پھینک دو تاکہ تمہارے والد کی توجّہ صرف تمہاری ہی طرف ہو جائے۔ یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا۔" اس پر ان میں سے ایک بولا "یوسفؑ

کو قتل نہ کرو، اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اُسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا۔" اس قرارداد پر انہوں نے جا کر اپنے باپ سے کہا،" ابا جان، کیا بات ہے کہ آپ یوسفؑ کے معاملہ میں ہم پر بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں۔ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کچھ چر چُگ لے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہلائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں۔" باپ نے کہا،" تمہارا اُسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھ کو اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے جبکہ تم اس سے غافل ہو۔" انہوں نے جواب دیا،" اگر ہمارے ہوتے ہوئے اسے بھیڑیئے نے کھا لیا، جبکہ ہم ایک جتھا ہیں، تب تو ہم بڑے ہی نکمے ہوں گے۔" اس طرح اصرار کر کے جب وہ اسے لے گئے اور انہوں نے طے کر لیا کہ اُسے ایک اندھے کنویں میں چھوڑ دیں، تو ہم نے یوسفؑ کو وحی کی کہ" ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا، یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں۔" شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا" ابا جان، ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسفؑ کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آکر اُسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے چاہے ہم سچے ہی ہوں۔" اور یوسف کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ یہ سُن کر ان کے باپ نے کہا،" بلکہ تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا، صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا، جو بات تم بنا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے۔"

اُدھر ایک قافلہ آیا اور اُس نے اپنے سقّے کو پانی لانے کے لیے بھیجا۔ سقّے نے جو کنویں میں ڈول ڈالا تو (یوسفؑ کو دیکھ کر) پکار اٹھا،" مبارک ہو،

یہاں تو ایک لڑکا ہے۔" ان لوگوں نے اس کو مالِ تجارت سمجھ کر چھپا لیا، حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے تھے خدا اس سے باخبر تھا۔ آخر کار انہوں نے اس کو تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملہ میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے۔

مصر کے جس شخص نے اسے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا "اس کو اچھی طرح رکھنا، بعید نہیں کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۔" اس طرح ہم نے یوسفؑ کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور جب وہ پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوتِ فیصلہ اور علم عطا کیا، اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں۔

جس عورت کے گھر میں وہ تھا وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی "آجا"۔ یوسفؑ نے کہا "خدا کی پناہ، میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی (اور میں یہ کام کروں!) ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔" وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسفؑ بھی اس کی طرف بڑھتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا ہوا، تاکہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں، درحقیقت وہ ہمارے چنے ہوئے بندوں میں سے تھا۔ آخر کار یوسفؑ اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسفؑ کا قمیص (کھینچ کر) پھاڑ دیا۔ دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی، "کیا سزا ہے اس شخص کی جو تیری گھر والی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا

سزا ہو سکتی ہے کہ وہ قید کیا جائے یا اُسے سخت عذاب دیا جائے۔" یوسفؑ نے کہا "یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔" اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے (قرینے کی) شہادت پیش کی کہ "اگر یوسفؑ کا قمیص آگے سے پھٹا ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا۔ اور اگر اس کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچّا۔" جب شوہر نے دیکھا کہ یوسفؑ کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے کہا "یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں، واقعی بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمھاری چالیں۔ یوسفؑ، اس معاملے سے درگزر کر۔ اور اے عورت، تو اپنے قصور کی معافی مانگ، تو ہی اصل میں خطاکار تھی۔"

شہر کی عورتیں آپس میں چرچا کرنے لگیں کہ "عزیز کی بیوی اپنے نوجوان غلام کے پیچھے پڑی ہوئی ہے، محبت نے اُسے بے قابو کر رکھا ہے، ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کر رہی ہے۔" اس نے جو اُن کی یہ مکّارانہ باتیں سُنیں تو اُن کو بلاوا بھیج دیا اور ان کے لیے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک ایک چھُری رکھ دی۔ (پھر عین اس وقت جبکہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں) اس نے یوسفؑ کو اشارہ کیا کہ ان کے سامنے نکل آ۔ جب ان عورتوں کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ دنگ رہ گئیں اور اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں اور بے ساختہ پکار اُٹھیں "حاشاللہ، یہ شخص انسان نہیں ہے، یہ تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے۔" عزیز کی بیوی نے کہا "دیکھ لیا! یہ ہے وہ شخص جس کے معاملہ میں تم مجھ پر باتیں بناتی تھیں۔ بے شک میں نے اسے رِجھانے کی کوشش کی تھی مگر یہ بچ نکلا۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل و خوار ہو گا۔ یوسفؑ نے کہا "اے میرے ربّ،

قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں۔ اور اگر تُو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل رہوں گا۔ اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے دفع کر دیں۔ بے شک وہی ہے جو سب کی سُنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

پھر ان لوگوں کو یہ سُوجھی کہ ایک مدّت کے لیے اُسے قید کر دیں حالانکہ وہ (اس کی پاکدامنی اور خود اپنی عورتوں کے بُرے اطوار کی) صریح نشانیاں دیکھ چکے تھے۔

قید خانہ میں دو غلام اور بھی اس کے ساتھ داخل ہوئے۔ ایک روز اُن میں سے ایک نے اس سے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں شراب کشید کر رہا ہوں" دوسرے نے کہا "میں نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے اُن کو کھا رہے ہیں" دونوں نے کہا "ہمیں اس کی تعبیر بتائیے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں"۔ یوُسفؑ نے کہا:۔

"یہاں جو کھانا تمہیں ملا کرتا ہے اس کے آنے سے پہلے میں تمھیں اِن خوابوں کی تعبیر بتادوں گا۔ یہ علم اُن علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں، اپنے بزرگوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زندان کے ساتھیو! تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرّق رب بہتر ہیں یا

وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ اُس کو چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سِوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباؤاجداد نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے لیے کوئی سَند نازل نہیں کی۔ فرمانروائی کا اقتدار اللہ کے سِوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سِوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی ٹھیٹھ سیدھا طریق زندگی ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اے زندان کے ساتھیو، تمھارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رَب (شاہِ مصر) کو شراب پلائے گا، رہا دوسرا تو اُسے سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ فیصلہ ہو گیا اس بات کا جو تم پُوچھ رہے تھے۔

پھر ان میں سے جس کے متعلق خیال غالب تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے یوسفؑ نے کہا کہ "اپنے رب (شاہِ مصر) سے میرا ذکر کرنا۔" مگر شیطان نے اُسے ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہِ مصر) سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا اور یوسفؑ کئی سال تک قید خانے میں پڑا رہا۔

ایک روز بادشاہ نے کہا "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں، اور اناج کی سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات سُوکھی۔ اے اہلِ دربار مجھے اس خواب کی تعبیر بتاؤ اگر تم خوابوں کا مطلب سمجھتے ہو۔" لوگوں نے کہا "یہ تو پریشان خوابوں کی باتیں ہیں اور ہم اس طرح کے خوابوں کا مطلب نہیں جانتے۔"

ان دو قیدیوں میں سے جو شخص بچ گیا تھا اور اُسے ایک مدّتِ دراز کے بعد اب بات یاد آئی، اس نے کہا "میں آپ حضرات کو اس کی تاویل بتاتا ہوں، مجھے ذرا (قید خانے میں یوسفؑ کے پاس) بھیج دیجیے۔"

اس نے جاکر کہا "یوسفؑ، اے سراپا راستی، مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دُبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی۔ شاید کہ میں اُن لوگوں کے پاس واپس جاؤں اور شاید کہ وہ لوگ جان لیں۔" یوسف نے کہا "سات برس تک لگاتار تم لوگ کھیتی باڑی کرتے رہو گے۔ اس دوران میں جو فصلیں تم کاٹو ان میں سے بس تھوڑا سا حصّہ، جو تمہاری خوراک کے کام آئے، نکالو اور باقی کو اس کے بالوں ہی میں رہنے دو۔ پھر سات برس بہت سخت آئیں گے۔ اس زمانے میں وہ سب غلّہ کھا لیا جائے گا جو تم اس وقت کے لیے جمع کرو گے۔ اگر کچھ بچے گا تو بس وہی جو تم نے محفوظ کر رکھا ہو۔ اس کے بعد پھر ایک سال ایسا آئے گا جس میں بارانِ رحمت سے لوگوں کی فریاد رسی کی جائے گی اور وہ رس نچوڑیں گے۔"

بادشاہ نے کہا اسے میرے پاس لاؤ۔ مگر جب شاہی فرستادہ یوسفؑ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "اپنے رب کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ اُن عورتوں کا کیا معاملہ ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے۔" اس پر بادشاہ نے ان عورتوں سے دریافت کیا "تمہارا کیا تجربہ ہے اس وقت کا جب تم نے یوسفؑ کو رجھانے کی کوشش کی تھی؟" سب نے یک زبان ہو کر کہا "حاشا للہ، ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا۔" عزیز کی بیوی بول اُٹھی "اب حق کھل چکا ہے، وہ میں ہی تھی جس نے اس کو پھسلانے کی کوشش کی تھی، بے شک وہ بالکل سچا ہے۔"

(یوسفؑ نے کہا) "اس سے میری غرض یہ تھی کہ (عزیز) یہ جان لے کہ میں نے در پردہ اس کی خیانت نہیں کی تھی، اور یہ کہ جو خیانت کرتے ہیں

ان کی چالوں کو اللہ کامیابی کی راہ پر نہیں لگاتا۔ میں کچھ اپنے نفس کی برأت نہیں کر رہا ہوں، نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے۔ اِلّا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو، بے شک میرا رب بڑا غفور و رحیم ہے۔

بادشاہ نے کہا "انہیں میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کر لوں۔"

جب یوسفؑ نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا "اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر پورا بھروسا ہے۔" یوسفؑ نے کہا "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے، میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں۔"

اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسفؑ کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں، نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا، اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لے آئے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے۔

یوسفؑ کے بھائی مصر آئے اور اس کے ہاں حاضر ہوئے۔ اس نے انہیں پہچان لیا مگر وہ اس سے ناآشنا تھے۔ پھر جب اس نے ان کا سامان تیار کروا دیا تو چلتے وقت ان سے کہا "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا۔ دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر کر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں۔ اگر تم اُسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمہارے لیے کوئی غلّہ نہیں ہے بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا۔" انہوں نے کہا "ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اُسے بھیجنے پر راضی ہو جائیں اور ہم ایسا ضرور کریں گے۔" یوسفؑ نے اپنے غلاموں کو

اشارہ کیا کہ "ان لوگوں نے غلّے کے عوض جو مال دیا ہے وہ چپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو"۔ یہ یوسفؑ نے اس اُمید پر کیا کہ گھر پہنچ کر وہ اپنا واپس پایا ہوا مال پہچان جائیں گے (یا اس فیاضی پر احسان مند ہوں گے) اور عجب نہیں کہ پھر پلٹیں۔

جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا "ابا جان، آئندہ ہم کو غلّہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے، لہٰذا آپ ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے تاکہ ہم غلّہ لے کر آئیں اور اس کی حفاظت کے ہم ذمّہ دار ہیں۔" باپ نے جواب دیا "کیا اس کے معاملہ میں تم پر ویسا ہی بھروسا کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملے میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔" پھر جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انہیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اُٹھے۔ "ابّا جان، اور ہمیں کیا چاہیئے، دیکھیئے یہ ہمارا مال بھی ہمیں واپس دے دیا گیا ہے۔ بس اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رسد لے آئیں گے، اپنے بھائی کی حفاظت بھی کریں گے اور ایک بارِ شتر اور زیادہ بھی لے آئیں گے، اتنے غلّہ کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا۔" ان کے باپ نے کہا "میں اس کو ہرگز تمھارے ساتھ نہ بھیجوں گا جب تک کہ تم اللہ کے نام سے مجھ کو پیمان نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور واپس لے کر آؤ گے الاّ یہ کہ کہیں تم گھیر ہی لیے جاؤ۔" جب انہوں نے اس کو اپنے اپنے پیمان دے دیئے تو اس نے کہا "دیکھو، ہمارے اس قول پر اللہ نگہبان ہے۔" پھر اس نے کہا "میرے بچّو! مصر کے دار السلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ مختلف دروازوں سے جانا۔ مگر میں اللہ کی مشیّت سے تم کو نہیں

بچا سکتا، حکم اُس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا، اسی پر میں نے بھروسا کیا، اور جس کو بھی بھروسا کرنا ہو اسی پر کرے۔" اور واقعہ بھی یہی ہوا کہ جب وہ اپنے باپ کی ہدایت کے مطابق شہر میں متفرق دروازوں سے داخل ہوئے تو اس کی یہ احتیاطی تدبیر اللہ کی مشیئت کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ آسکی۔ ہاں بس یعقوبؑ کے دل میں جو ایک کھٹک تھی اسے دُور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کرلی۔ بے شک وہ ہماری دی ہوئی تعلیم سے صاحبِ علم تھا مگر اکثر لوگ معاملہ کی حقیقت کو جانتے نہیں ہیں۔

یہ لوگ یوسفؑ کے حضور پہنچے تو اس نے اپنے بھائی کو اپنے پاس الگ بلا لیا اور اسے بتا دیا کہ "میں تیرا وہی بھائی ہوں (جو کھو یا گیا تھا) اب تو ان باتوں کا غم نہ کر جو یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔"

جب یوسفؑ ان بھائیوں کا سامان لدوانے لگا تو اس نے اپنے بھائی کے سامان میں اپنا پیالہ رکھ دیا۔ پھر ایک پکارنے والے نے پکار کر کہا۔ "اے قافلے والو! تم لوگ چور ہو۔" انہوں نے پلٹ کر پُوچھا "تمہاری کیا چیز کھوئی گئی"؟ سرکاری ملازموں نے کہا "بادشاہ کا پیمانہ ہم کو نہیں ملتا" (اور ان کے جمعدار نے کہا) "جو شخص لاکر دے گا اس کے لیے ایک بارِ شتر انعام ہے، اس کا میں ذمّہ لیتا ہوں۔" ان بھائیوں نے کہا "خدا کی قسم، تم لوگ خوب جانتے ہو کہ ہم اس ملک میں فساد کرنے نہیں آئے ہیں اور ہم چوریاں کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔" انہوں نے کہا "اچھا، اگر تمہاری بات جھُوٹ نکلی تو چور کی کیا سزا ہے؟" انُہوں نے کہا "اس کی سزا؟ جس کے سامان میں سے چیز نکلے وہ آپ ہی اپنی سزا میں رکھ لیا جائے، ہمارے ہاں تو ایسے ظالموں کو سزا دینے کا یہی طریقہ ہے۔" تب یوسفؑ نے اپنے بھائی

سے پہلے اُن کی خُرجیوں کی تلاشی لینی شروع کی، پھر اپنے بھائی کی خُرجی سے گم شدہ چیز برآمد کر لی ۔۔۔۔ اس طرح ہم نے یوُسفؑ کی تائید اپنی تدبیر سے کی۔ اس کا یہ کام نہ تھا کہ بادشاہ کے دین (یعنی مصر کے شاہی قانون) میں اپنے بھائی کو پکڑتا، اِلاّ یہ کہ اللہ ہی ایسا چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں، اور ایک عِلم رکھنے والا ایسا ہے۔ جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے۔

ان بھائیوں نے کہا "یہ چوری کرے تو کچھ تعجّب کی بات بھی نہیں، اس سے پہلے اس کا بھائی یوُسفؑ بھی چوری کر چکا ہے"۔ یوُسفؑ ان کی یہ بات سُن کر پی گیا، حقیقت ان پر نہ کھولی، بس (زیرِ لب) اتنا کہہ کر رہ گیا کہ "بڑے ہی برُے ہو تم لوگ، (میرے منہ در منہ مجھ پر) جو الزام تم لگا رہے ہو اس کی حقیقت خدا خوب جانتا ہے۔"

انہوں نے کہا "اے سردار ذی اقتدار (عزیز) اس کا باپ بہت بوڑھا آدمی ہے، اس کی جگہ آپ ہم میں سے کسی کو رکھ لیجئے، ہم آپ کو بڑا ہی نیک نفس انسان پاتے ہیں"۔ یوُسفؑ نے کہا "پناہ بخدا، دوسرے کسی شخص کو ہم کیسے رکھ سکتے ہیں۔ جس کے پاس ہم نے اپنا مال پایا ہے اس کو چھوڑ کر دوسرے کو رکھیں گے تو ہم ظالم ہوں گے"۔

جب وہ یوُسفؑ سے مایوس ہو گئے تو ایک گوشے میں جا کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ ان میں جو سب سے بڑا تھا وہ بولا "تم جانتے نہیں ہو کہ تمھارے والد تم سے خدا کے نام پر کیا عہد و پیمان لے چکے ہیں اور اس سے پہلے یوُسفؑ کے معاملے میں جو زیادتی تم کر چکے ہو وہ بھی تم کو معلوم ہے۔ اب میں تو یہاں سے ہرگز نہ جاؤں گا جب تک کہ میرے والد مجھے اجازت نہ دیں، یا پھر اللہ ہی میرے حق میں کوئی فیصلہ

فرما دے کہ وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ تم جا کر اپنے والد سے کہو کہ "ابّا جان، آپ کے صاحبزادے نے چوری کی ہے۔ ہم نے اُسے چوری کرتے ہوئے نہیں دیکھا، جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے بس وہی ہم بیان کر رہے ہیں، اور غیب کی نگہبانی تو ہم نہ کر سکتے تھے۔ آپ اس بستی کے لوگوں سے پوچھ لیجیے جہاں ہم تھے۔ اس قافلے سے دریافت کر لیجیے جس کے ساتھ ہم آئے ہیں۔ ہم اپنے بیان میں بالکل سچّے ہیں"۔

باپ نے یہ داستان سُن کر کہا "دراصل تمھارے نفس نے تمھارے لیے ایک اور بڑی بات کو سہل بنا دیا۔ اچھا اس پر بھی صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ کیا بعید ہے کہ اللہ ان سب کو مجھ سے لا ملائے، وہ سب کچھ جانتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہیں"۔ پھر وہ ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ "ہائے یوسفؑ!" وہ دل ہی دل میں غم سے گھٹا جا رہا تھا اور اس کی آنکھیں سفید پڑ گئی تھیں.... بیٹوں نے کہا "خدارا! آپ تو بس یوسفؑ ہی کو یاد کیے جاتے ہیں۔ نوبت یہ آ گئی ہے کہ اس کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دیں گے یا اپنی جان ہلاک کر ڈالیں گے"۔ اس نے کہا "میں اپنی پریشانی اور اپنے غم کی فریاد اللہ کے سوا کسی سے نہیں کرتا، اور اللہ سے جیسا میں واقف ہوں تم نہیں ہو۔ میرے بچّو، جا کر یوسفؑ اور اس کے بھائی کی ٹوہ لگاؤ، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں"۔

جب یہ لوگ مصر جا کر یوسفؑ کی پیشی میں داخل ہوئے تو انھوں نے عرض کیا کہ "اے سردارِ با اقتدار، ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مُبتلا ہیں، اور ہم کچھ حقیر سی پُونجی لے کر آئے ہیں، آپ ہمیں بھرپور غلّہ

عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں، اللہ خیرات کرنے والوں کو جزا دیتا ہے۔"
(یہ سُن کر یوسفؑ سے نہ رہا گیا) اُس نے کہا "تمھیں کچھ یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے یوسُفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جبکہ تم نادان تھے"؟
وہ چونک کر بولے "ہائیں! کیا تم یوسُفؑ ہو؟" اس نے کہا ہاں، میں یوسُفؑ ہوں اور یہ میرا بھائی۔ ، ۔ اللہ نے ہم پر احسان کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی تقویٰ اور صبر سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں جاتا۔" انہوں نے کہا "بخدا کہ تم کو اللہ نے ہم پر فضیلت بخشی اور واقعی ہم خطاکار تھے۔" اس نے جواب دیا "آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمھیں معاف کرے، وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ جاؤ، میرا یہ قمیص لے جاؤ اور میرے والد کے منہ پر ڈال دو، اُن کی بینائی پلٹ آئے گی، اور اپنے سب اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔"

جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو اُن کے باپ نے (کنعان میں) کہا "میں یوسُفؑ کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں۔" گھر کے لوگ بولے "خدا کی قسم آپ ابھی تک اپنے اسی پرانے خبط میں پڑے ہوئے ہیں۔"

پھر جب خوشخبری لانے والا آیا تو اس نے یوسُفؑ کا قمیص یعقوبؑ کے منہ پر ڈال دیا اور یکایک اس کی بینائی عود کر آئی۔ تب اس نے کہا "میں تم سے کہتا نہ تھا؟ میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔" سب بول اُٹھے "ابا جان، آپ ہمارے گناہوں کی بخشش کے لیے دُعا کریں، واقعی ہم خطاکار تھے۔" اس نے کہا "میں اپنے رب سے تمہارے لیے معافی کی درخواست کروں گا، وہ بڑا رحم کرنے والا اور

رحیم ہے۔"

پھر جب یہ لوگ یوسفؑ کے پاس پہنچے تو اس نے اپنے والدین کو اپنے ساتھ بٹھالیا اور (اپنے سب کنبے والوں سے) کہا "چلو، اب شہر میں چلو، اللہ نے چاہا تو امن چین سے رہو گے۔"

(شہر میں داخل ہونے کے بعد) اس نے اپنے والدین کو اٹھا کر اپنے پاس تخت پر بٹھایا اور سب اس کے آگے بے اختیار سجدے میں جھک گئے۔ یوسفؑ نے کہا "ابا جان یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے رب نے اسے حقیقت بنا دیا۔ اس کا احسان ہے کہ اس نے مجھے قید خانے سے نکالا اور آپ لوگوں کو صحرا سے لاکر مجھ کو ملایا حالانکہ شیطان میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈال چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا رب غیر محسوس تدبیروں سے اپنی مشیت پوری کرتا ہے، بے شک وہ علیم اور حکیم ہے۔ اے میرے رب تو نے مجھے حکومت بخشی اور مجھ کو باتوں کی تہہ تک پہنچنا سکھایا۔ زمین و آسمان کے بنانے والے، تو ہی دنیا اور آخرت میں میرا سرپرست ہے، میرا خاتمہ اسلام پر کر اور انجام کار مجھے صالحین کے ساتھ ملا۔"

(۱۳) حضرت یوسف علیہ السلام اور رومانوی داستان

فوطیفار کی بیوی کا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ اظہارِ عشق کا تذکرہ آسمانی کتابوں میں موجود ہے لیکن اس داستان نے مشرقی زبانوں میں ایک انتہائی رومانوی شکل اختیار کر لی ہے اور اس کے ساتھ عجیب و غریب واقعات کو منسلک کر دیا ہے۔ پنجابی زبان کے ایک شاعر نے تو باقاعدہ مثنوی کی شکل میں اس داستان کو نظم بھی

کر دیا ہے۔ ان داستانوں میں حضرت یوسف علیہ السّلام کو ایک بلند کردار ہیرو کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ زلیخا کو ایک بدکردار شہوت پرست، جنسی خاتون کے روپ میں اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔
یہاں چند اشعار پیشِ خدمت ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

(۱) ؎ محبت ہے اِک مرہم پاک دل
ہوس اک زلیخائے رنگیں شباب

(۲) ؎ چاک دامانی خلاف پاکدامنی نہیں
صاف ظاہر ہے کہ یوسف پاک داماں ہی رہا

(۳) ؎ خلوتِ شب میں گر آوے وہ زلیخائے بہار
ہم نہیں یوسف کہ عذرِ پاک دامانی کریں

مندرجہ بالا اشعار سے آپ نے ان داستان گو حضرات کی ذہنیت کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود ہمارے داستان گو اور بعض مفسّرین اس بات پر بضد ہیں کہ زلیخا نہ صرف یوسف علیہ السّلام کے عشق میں گرفتار ہونے کے بعد جوان ہو گئی بلکہ بیوہ ہونے کے بعد اُس نے حضرت یوسف علیہ السّلام کے ساتھ شادی بھی کر لی۔ شاعرِ مشرق علامّہ اقبال فرماتے ہیں کہ:۔

؎ غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کُن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کُند چشمِ زلیخا را

معلوم نہیں زلیخا کی آنکھوں میں کونسی روشنی پیدا ہو گئی تھی۔ بہر حال رومانوی داستانیں ہمیشہ فوق الفطری اور مبالغہ آمیز عناصر پر مشتمل ہوتی ہیں اس لیے اس داستان پر زیادہ متعجب ہونا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔۔۔

شہنشاہِ ظرافت حضرت اکبر الہ آبادی نے اس حادثے کا بالکل درست فطری اور منطقی تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ حضرت یوسُف علیہ السّلام اور زلیخا کا کوئی قصور نہیں تھا اصل خطا کار زلیخا کا شوہر تھا جو ایک اجنبی اور حسین نوجوان کو گھر میں لانے کے نتائج کا ادراک ہی نہ کرسکا۔ شاید وہ بھی کوئی پاکستانی سیاستدان ہی تھا۔ اکبر الہ آبادی فرماتے ہیں کہ:۔

ص   یوسُف کو نہ سمجھے کہ حسین بھی ہے جواں بھی
شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

بہر حال مندرجہ بالا تفصیلات اور تاریخی بیانات سے حضرت یوسف علیہ السّلام کی زندگی کے بارے میں حسبِ ذیل نتائج مرتب کئے جاسکتے ہیں:۔

(۱) حضرت یوسُف علیہ السّلام کو بیس درم کے عوض مصر کے بازار میں فروخت کر دیا گیا۔ خریدنے والے کا نام فوطیفار تھا جو شاہی باڈی گارڈ یا بعض روائتوں کے مطابق شاہی خزانے کا ایک اعلیٰ افسر تھا۔ اس کی بیوی کا نام زلیخا تھا۔ اس وقت حضرت یوسُف علیہ السّلام کی عمر سترہ سال تھی وہ ایک خوبصورت اور بھرپور شباب کے مالک نوجوان تھے۔

(۲) فوطیفار نے اپنے گھر کا تمام انتظام حضرت یوسُف علیہ السّلام کے حوالے کر دیا۔ جس کے باعث زلیخا ان سے انتہائی قریب ہوگئی اور اسی قربت کے باعث زلیخا نے حضرت یوسُف علیہ السّلام کو دعوتِ گناہ دی اور اپنے ناپاک مقصد میں ناکام ہونے کے بعد الٹا حضرت یوسُف علیہ السّلام کو موردِ الزام ٹھہرادیا۔ جس کے نتیجے میں حضرت یوسُف علیہ السّلام کو جیل میں قید کر دیا گیا۔

(۳) ایک اتفاقی حادثے نے حضرت یوسُف علیہ السّلام کو بادشاہِ وقت کے قریب پہنچا دیا۔ آپ نے مصر کے بادشاہ یا فرعون سے ملک کے خزانوں کا

نگہبان بننے کی خواہش ظاہر کی جو پوری ہو گئی۔

(۴) حضرت یوسف علیہ السّلام نے اپنے فرائض منصبی نہایت دیانتداری، وفاداری، سمجھداری، محنت اور قابلیت سے انجام دیئے جس کی وجہ سے مملکتِ مصر قحط کے بحران سے محفوظ ہو گئی۔ جس کے باعث اُمرائے مملکت میں آپ کا مرتبہ بلند ہو گیا۔ آپ نے اپنے خاندان کو مصر بلوا کر وہیں آباد کر لیا۔ آپ نے مصر ہی میں شادی کی اور اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر ایک کامیاب و کامران زندگی بسر کرنے کے بعد اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کو چار سو سال بعد یروشلم میں دفن کیا گیا۔

(۱۴) مصر کا سیاسی نظام

یہ بھی ایک مسلّم حقیقت ہے کہ مصر کا سیاسی نظام نسلی بادشاہت پر قائم تھا ہر بادشاہ کا بڑا بیٹا ہی ولی عہدِ سلطنت ہوتا تھا۔ جو باپ کی موت کے بعد بادشاہ بنتا تھا اور اس روایت کو توڑنا عام حالات میں ممکن بھی نہ تھا۔ اس دور کے حالات کے مطابق اہلِ مصر بُت پرستی کرتے تھے اور کسی بھی شخص کو بُت شکنی کی جراُت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ وہاں سورج اور گائے کی پوُجا بھی کی جاتی تھی۔ الغرض ملک میں توحید پرستی مکمل طور پر ناپید تھی۔ مصر کے بادشاہ مکمل طور پر مطلق العنان ہوتے تھے۔

(۱۵) حضرت یوُسف علیہ السّلام اور مصری سیاست

حضرت یوُسف علیہ السلام کا مصر کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی پر کسی قسم کا کوئی اثر نظر نہیں آتا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ مصر کا ریاستی اقتدار بادشاہ یا فرعون کی ذات میں ہی مرتکز ہوتا تھا اور ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے وہ جسے چاہتا انتظامی

اختیارات اپنی مرضی و منشاء سے تفویض کر دیتا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو وزارتِ خزانہ کی ذمہ داری سونپی گئی تھی جو آپ نے نہایت کامیابی سے پوری کی۔ علاوہ ازیں قومی زندگی کے حسبِ ذیل معاملات میں آپ کا کوئی کردار نظر نہیں آتا۔

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے شاہی نظام میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ نے اسلامی ریاست قائم کرنے کی کبھی کوئی خواہش نہیں کی اور نہ ہی جنرل ضیاء الحق کی طرح نفاذِ اسلام کا عمل جاری رکھا۔

(۲) اور نہ ہی حضرت یوسفؑ علیہ السلام نے مصر کے تعزیری اور دیگر قوانین میں کسی قسم کا کوئی ردّ و بدل کیا بلکہ آپنے فرعونی قوانین کے مطابق ہی اپنی ذمہ داریوں کو بطریق احسن پورا کیا۔

(۳) بادشاہِ وقت یا فرعون اور حضرت یوسفؑ علیہ السلام کے درمیان بہترین تعلقات قائم رہے۔ اور آپ بادشاہِ وقت کی مرضی کے خلاف یا رضامندی کے بغیر کوئی کام بھی انجام نہیں دیتے تھے۔ یہاں تک آپ نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی تجہیز و تکفین بھی فرعون کی اجازت سے کنعان جاکر کی تھی۔ انہی اسباب کی بناء پر فرعون اور حضرت یوسفؑ علیہ السلام کے درمیان کسی بھی قسم کی مغائرت، اختلافات یا تصادم کی کبھی بھی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

(۴) اہلِ مصر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت سے قطعاً ناواقف تھے۔ حضرت یوسفؑ علیہ السلام نے اہلِ مصر کو کبھی بھی اس شریعت سے متعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ آپ خود توحید پرست تھے لیکن آپ

نے کبھی بھی اہلِ مصر کو توحید پرستی پر مجبور نہیں کیا۔
(۵) حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت و کردار سے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ :۔
(ا) ریاستی اقتدار اور منصبِ نبوّت دو الگ الگ افراد کی ذات میں مجتمع ہو سکتے ہیں، گویا ریاستی اقتدار میں نہ تو منصب نبوّت کا حصّہ ہونا ہے اور نہ ہی اس کے لیے ایسا ہونا ضروری ہوتا ہے۔
(ب) نبوّت کا منصب بنیادی طور پر بنی نوع انسان کی اخلاقی اصلاح کا طلب گار ہوتا ہے۔ سیاسی اقتدارِ اعلیٰ یا مذہبی ریاست کا قیام مقاصدِ نبوّت میں شامل نہیں ہوتے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے انتقال کے بعد تقریباً چار سو سال تک بنی اسرائیل مصر میں آباد رہے اور خوب پھلے پھولے۔ بنی اسرائیل کی افرادی قوّت نے اہلِ مصر کو فکر مند بنا دیا اور وہ بنی اسرائیل کو اپنے لیے خطرہ سمجھنے لگے۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر فرعونِ مصر نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل سے جبراً بیگار لی جائے تاکہ ان پر حکومت کی طاقت اور قوّت کی دھاک بیٹھ جائے۔ نیز اس نے عبرانی دائیوں کو حکم دیا کہ وہ بنی اسرائیل کے نومولود لڑکوں کو پیدائش کے وقت قتل کر دیا کریں جبکہ لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیا کریں۔ اس طرح فرعونِ مصر نے بنی اسرائیل کیخلاف سنگین قسم کی جارحانہ و ظالمانہ کاروائی شروع کر دی لیکن بنی اسرائیل کے پاس اسے برداشت کرنے کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ تھا کیونکہ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ انہوں نے چار سو سال تک اپنے آپ کو بالکل الگ تھلگ رکھا اور کبھی بھی اپنے آپ کو مقامی آبادی میں سمونے کی کوشش نہیں کی۔ اسی

لیے اہلِ مصر انہیں غیر ملکی سمجھتے تھے۔ ان ہی حالات میں مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ آپ کے اعلانِ نبوت سے بنی اسرائیل ہی نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ کے نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

(۱۶) حضرت موسیٰ علیہ السلام

آپ کو "کلیم اللہ" کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ کتابِ مقدس اور آخری آسمانی کتاب قرآن پاک میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، نبوت اور ہجرت کے واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ نیز مقدس کتابوں اور دیگر روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے کائنات کی ہدایت و رہنمائی کے لیے منتخب کر لیا تھا اور ان کے مستقل قیام کے لیے فلسطین کا خطۂ ارضی بھی مخصوص کر دیا تھا۔ اللہ جلِ شانہٗ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ فلسطین کی سرزمین ان کی اُولاد کو دی جائے گی اسی خیال کے پیشِ نظر تمام انبیائے بنی اسرائیل کو یروشلم میں دفن کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کی حیثیت آج بھی ایک خاندان یا قبیلے کی ہے۔ اور کوئی بھی شخص جو کسی غیر قوم سے تعلق رکھتا ہو، یہودی نہیں بن سکتا۔ نیز چاروں آسمانی کتابیں، توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید اولادِ ابراہیمؑ پر ہی نازل کی گئی ہیں اور دنیا کی مقدس ترین عبادت گاہیں بھی اسی خاندان کی تعمیر کردہ ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی خاندان کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ آپ دینِ اسلام کے پہلے پیغمبر تھے جنہیں حسبِ ذیل وجوہات کی بناء پر بہت بڑی فضیلت حاصل ہے:۔

(۱) آپ پہلے پیغمبر تھے جنہیں اللہ تعالےٰ سے براہِ راست کلام کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی لیے آپ "کلیم اللہ" کہلائے۔

(ii) آپ ہی وہ پہلے پیغمبر ہیں جن پر اللہ کی طرف سے توریت کی شکل میں آسمانی ہدایت نازل کی گئی۔

(iii) آپ کو اللہ کی طرف سے کئی معجزات بھی عطا کیے گئے اور آپ کو اللہ کا دیدار بھی نصیب ہوا۔

(iv) آپ کو اپنے عہد کے سب سے بڑے اور طاقت ور حکمران فرعون کو تبلیغِ حق کرنے کے لیے منتخب کیا گیا۔

جیسا کہ آپ پچھلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ آپ کی پیدائش کے زمانے میں فرعون نے بنی اسرائیل کے نوزائیدہ لڑکوں کو قتل کرانے کا حکم دے رکھا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حفاظت اور پیدائش و پرورش کا تسلّی بخش انتظام کر دیا۔ اس انتظام کا تفصیلی ذکر قرآنِ مجید اور بائیبل کی کتاب 'پیدائش' میں درج کیا گیا ہے۔ آیئے پہلے قرآنِ مجید کا مطالعہ کریں جس میں سورۂ القصص میں ان حالات کا ذکر درج ذیل انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

ترجمہ: ۔" ہم نے موسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا۔ اس کو دودھ پلا۔ پھر جب تجھے اس کی جان کا خطرہ ہو تو اسے دریا میں ڈال دے اور کچھ خوف اور غم نہ کر۔ ہم اُسے تیرے ہی پاس واپس لے آئیں گے اور ان کو پیغمبروں میں شامل کریں گے ۔"

آخر کار فرعون کے گھر والوں نے اُسے دریا سے نکال لیا تاکہ وہ ان کا دشمن اور ان کے رنج کا سبب بنے۔ واقعی فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر بڑے غلط کار تھے۔ فرعون کی بیوی نے کہا یہ میرے اور تیرے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اسے قتل نہ کرو، کیا عجب کہ یہ ہمارے لیے مفید ہو یا

ہم اس کو اپنا بیٹا ہی بنا لیں ۔"

(پارہ نمبر ۲۰ سورۃ القصص آیات نمبر ۷ تا ۹)

غرض یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش اپنی ماں کے دودھ سے فرعون کے محل میں ہوئی، توریت اور تلمود کے بیانات کے مطابق آپ نے مصریوں کے تمام علوم کی تعلیم پائی۔ آپ شہزادوں کی طرح رہتے تھے اور اکثر بنی اسرائیل کی آبادی جشن کا دورہ بھی کرتے تھے۔ آپ نے اپنی آنکھوں سے ان مظالم کو دیکھا جو قبطی حکومت کے اہل کار بنی اسرائیل پر روا رکھتے تھے۔ آپ کی کوششوں سے فرعون نے بنی اسرائیل کے لیے ہفتے میں ایک دن کی چھٹی مقرر کی۔ انہی دنوں آپ ایک حادثے سے دوچار بھی ہو گئے جس کی بناء پر آپ کو مصر سے جلاوطن ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ قرآن شریف میں اس واقعہ کی تفصیل سورۃ قصص میں موجود ہے جبکہ بائیبل میں یہ واقع کتاب خروج باب اوّل میں ملتا ہے۔ مختصراً یہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک قبطی ایک اسرائیلی کو مار رہا ہے۔ اسرائیلی نے آپ کو مدد کے لیے پکارا، آپ نے قبطی کو ایک گھونسا مارا۔ جس سے وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ وہاں کوئی آدمی موجود نہیں تھا اس لیے آپ نے اس قبطی کی لاش ریت میں دبا دی۔ دوسرے دن آپ نے دیکھا کہ وہی عبرانی دوسرے عبرانی سے لڑ رہا ہے آپ نے اسے مار پیٹ کرنے سے منع کیا تو اس نے جواباً کہا۔ کیا آپ مجھے بھی اس مصری کی طرح قتل کرنا چاہتے ہیں۔؟ اس طرح فرعون کو بھی اس واقع کی اطلاع مل گئی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی جان بچا کر مدیان چلے گئے۔ وہاں آپ کو ایک کاہن کے پاس رہنے کو جگہ

مل گئی۔ جس نے آٹھ یا دس سال کے بعد اپنی لڑکی صنورا کی شادی حضرت موسیٰؑ سے کردی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے میزبان کی شخصیت متنازعہ فیہ ہے۔ توریت کی روایت ہے کہ آپ کا نام رعدائل یا میرو تھا اور آپ کاہن تھے۔ تلمود میں آپ کے تین نام بتائے گئے ہیں جبکہ قرآن پاک میں اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ البتہ اسلامی کتب سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ علامہ اقبال نے تو اس دس سالہ رفاقت کے متعلق یہاں تک کہہ دیا ہے کہ :۔

ؔ اگر کوئی شعیب آئے میسّر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

الغرض یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے معاہدے کی مدّت پوری کر کے اہل وعیال کے ساتھ واپس آرہے تھے تو کوہِ طور پر آپ کو ایک آگ نظر آئی یہ پورا واقعہ قرآن پاک کی سورۂ القصص کی آیات ۲۹ تا ۳۵ بالتفصیل اس طرح بیان کیا گیا ہے :۔

"جب موسیٰ علیہ اسلام نے مدّت پوری کر دی اور وہ اپنے اہل وعیال کو لے کر چلا تو طورؔ کی جانب اس کو ایک آگ نظر آئی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا "ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارہ ہی اُٹھا لاؤں جس سے تم تاپ سکو"۔ وہاں پہنچا تو وادی کے داہنے کنارے پر مبارک خطے میں ایک درخت سے پکارا گیا کہ "اے موسیٰ، میں ہی اللہ ہوں سارے جہان والوں کا مالک"۔ اور (حکم دیا گیا کہ) پھینک دے اپنی لاٹھی۔ جونہی موسیٰؑ نے دیکھا کہ وہ لاٹھی سانپ کی طرح بل کھا رہی ہے تو وہ پیٹھ

پھیر کر بھاگا اور اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ (ارشاد ہوا) "موسیٰؑ" پلٹ آ۔ اور خوف نہ کر، تو بالکل محفوظ ہے۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ اور خوف سے بچنے کے لیے اپنا بازو بھینچ لے۔ یہ دو روشن نشانیاں ہیں تیرے رَب کی طرف سے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے پیش کرنے کے لیے، وہ بڑے نافرمان لوگ ہیں۔"

موسیٰؑ نے عرض کیا "میرے آقا، میں تو ان کا ایک آدمی قتل کر چکا ہوں، ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ اور میرا بھائی ہارونؑ مجھ سے زیادہ زبان آور ہے، اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تاکہ وہ میری تائید کرے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں گے۔" فرمایا "ہم تیرے بھائی کے ذریعے سے تیرا ہاتھ مضبوط کریں گے اور تم دونوں کو ایسی سطوت بخشیں گے کہ وہ تمھارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہماری نشانیوں کے زور سے غلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہی ہوگا۔"

قرآن پاک کی سورۂ طٰہٰ آیات نمبر ۹ تا ۵۵ میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی نبوّت کے مقاصد، آپ کا فرعون کے ساتھ مکالمہ، حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرنا، فرعون کا تعاقب کرنا اور سمندر میں غرق ہونا وغیرہ وغیرہ اس طرح بیان کئے گئے ہیں:۔

"اور تمہیں کچھ موسیٰؑ کی خبر بھی پہنچی ہے ؟ جب کہ اس نے ایک آگ دیکھی اور اپنے گھر والوں سے کہا کہ "ذرا ٹھہرو"، میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید کہ تمہارے لیے ایک آدھ انگارہ لے آؤں یا اس آگ پر مجھے (راستے کے متعلق) کوئی رہنمائی مل جائے۔"

وہاں پہنچا تو پکارا گیا "اے موسیٰؑ ! میں ہی تیرا رب ہوں، جوتیاں

اتار دے۔ تو وادیِ مقدس طُویٰ میں ہے اور میں نے تجھ کو چن لیا ہے، سن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، بس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔ قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے۔ میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں، تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے۔ پس کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہشِ نفس کا بندہ بن گیا ہے تجھ کو اس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے، ورنہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا.... اور اے موسیٰؑ، یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے"؟

موسیٰؑ نے جواب دیا "یہ میری لاٹھی ہے، اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں، اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں، اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں"۔

فرمایا "پھینک دے اس کو موسیٰؑ!" اس نے پھینک دیا اور یکایک وہ ایک سانپ تھی جو دوڑ رہا تھا

فرمایا "پکڑ لے اس کو اور ڈر نہیں، ہم اسے پھر ویسا ہی کر دیں گے جیسی یہ تھی اور ذرا اپنا ہاتھ اپنی بغل میں دبا، چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے، یہ دوسری نشانی ہے۔ اس لیے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں۔ اب تو فرعون کے پاس جا، وہ سرکش ہو گیا ہے"۔

موسیٰؑ نے عرض کیا "پروردگار، میرا سینہ کھول دے، اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں، اور میرے لیے میرے کنبے سے ایک وزیر مقرر کر دے، ہارون جو میرا بھائی ہے۔ اس کے ذریعہ سے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اس کو میرے کام میں شریک کر دے، تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور تیرا چرچا کریں۔ تو

ہمیشہ ہمارے حال پر نگراں رہا ہے۔"

فرمایا "دیا گیا جو تُو نے مانگا اے موسیٰ، ہم نے پھر ایک مرتبہ تجھ پر احسان کیا۔ یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا، ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعہ سے ہی کیا جاتا ہے کہ اس بچّے کو صندوق میں رکھ دے، اور صندوق کو دریا میں چھوڑ دے۔ دریا اسے ساحل پر پھینک دے گا اور اسے میرا دشمن اور اس بچّے کا دشمن اٹھا لے گا۔ میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت طاری کر دی اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے۔ یاد کر جبکہ تیری بہن چل رہی تھی، پھر جا کر کہتی ہے، "میں تمھیں اس کا پتہ دُوں جو اس بچّے کی پرورش اچھی طرح کرے؟" اس طرح ہم نے تجھے پھر تیری ماں کے پاس پہنچا دیا تاکہ اس کی آنکھ ٹھنڈی رہے اور وہ رنجیدہ نہ ہو۔ اور (یہ بھی یاد کر کہ) تو نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا، ہم نے تجھے اس پھندے سے نکالا اور تجھے مختلف آزمائشوں سے گزارا اور تُو مدیَن کے لوگوں میں کئی سال ٹھہرا رہا۔ پھر اب ٹھیک اپنے وقت پر تو آ گیا ہے اے موسیٰ۔ میں نے تجھ کو اپنے کام کا بنا لیا ہے جا تُو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ۔ اور دیکھو، تم میری یاد میں تقصیر نہ کرنا۔ جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔"

دونوں نے عرض کیا "پروردگار، ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا۔"

فرمایا "ڈرو مت، میں تمھارے ساتھ ہوں، سب کچھ سُن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے ربّ کے فرستادے

ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہِ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔"

فرعون نے کہا "اچھا تو پھر تم دونوں کا رَب کون ہے اے موسٰی"؟

موسٰیؑ نے جواب دیا "ہمارا رَب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی، پھر اس کو راستہ بتایا"

فرعون بولا" اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں ان کی پھر کیا حالت تھی"؟

موسٰیؑ نے کہا "اس کا علم میرے رَب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رَب نہ چُوکتا ہے نہ بھولتا ہے"

وہی جس نے تمہارے لیے زمین کا فرش بچھایا، اور اس میں تمہارے چلنے کو راستے بنائے، اور اوپر سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعہ سے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔ کھاؤ اور اپنے جانوروں کو بھی چراؤ۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں عقل رکھنے والوں کے لیے۔ اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اسی میں ہم تمھیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔

ہم نے فرعون کو اپنی سب ہی نشانیاں دکھائیں مگر وُہ جھٹلائے چلا گیا اور نہ مانا۔ کہنے لگا "اے موسٰی، کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرے۔؟ اچھا، ہم بھی تیرے مقابلے میں ویسا ہی جادُو لاتے ہیں۔ طے کر لے کب اور کہاں مقابلہ کرنا ہے۔ نہ ہم اس قرارداد سے پھریں گے نہ تُو پھر یو۔ کھُلے

میدان میں سامنے آجا۔"
موسیٰؑ نے کہا "جشن کا دن طے ہوا، اور دن چڑھے لوگ جمع ہوں۔"
فرعون نے پلٹ کر اپنے سارے ہتھکنڈے جمع کئے اور مقابلے میں آگیا۔
موسیٰؑ نے (عین موقع پر گروہِ مقابل کو مخاطب کر کے کہا) "شامت کے مارو، نہ جھوٹی تہمتیں باندھو اللہ پر، ورنہ وہ ایک سخت عذاب سے تمہارا ستیاناس کر دے گا۔ جھوٹ جس نے بھی گھڑا وہ نامراد ہوا۔"
یہ سُن کر اُن میں اختلافِ رائے ہو گیا اور وہ چپکے چپکے باہم مشورہ کرنے لگے۔ آخر کار کچھ لوگوں نے کہا کہ "یہ دونوں تو محض جادُوگر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادُو کے زور سے تم کو تمہاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمہارے مثالی طریقِ زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ اپنی ساری تدبیریں آج اکٹھی کر لو اور ایکا کر کے میدان میں آؤ۔ بس یہ سمجھ لو کہ آج جو غالب رہا وہی جیت گیا۔"
جادوگر بولے، "موسیٰ، تم پھینکتے ہو یا پہلے ہم پھینکیں۔؟"
موسیٰؑ نے کہا، "نہیں، تم ہی پھینکو۔"
یکایک اُن کی رسّیاں اور اُن کی لاٹھیاں اُن کے جادُو کے زور سے موسیٰؑ کو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں، اور موسیٰؑ اپنے دل میں ڈر گیا۔ ہم نے کہا "مت ڈر، تو ہی غالب رہے گا۔ پھینک جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے، ابھی اِن کی ساری بناوٹی چیزوں کو نِگلے جاتا ہے۔ یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں یہ تو جادُوگر کا فریب ہے، اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، خواہ کسی شان سے وہ آئے۔" آخر کو یہی ہوا کہ سارے جادُوگر سجدے میں گِرا دیئے

گئے اور پکار اُٹھے "مان لیا ہم نے ہارونؑ اور موسیٰؑ کے رب کو۔"

فرعون نے کہا "تم ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اس کی اجازت دیتا۔؟ معلوم ہو گیا کہ یہ تمہارا گروہ ہے جس نے تمھیں جادوگری سکھائی تھی۔ اچھا، اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹواتا ہوں اور کھجور کے تنوں پر تم کو سُولی دیتا ہوں۔ پھر تمھیں پتا چل جائے گا کہ ہم دونوں میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیر پا ہے" (یعنی میں تمھیں زیادہ سخت سزا دے سکتا ہوں یا موسیٰ)۔

جادوگروں نے جواب دیا "قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آجانے کے بعد بھی "صداقت" پر تجھے ترجیح دیں۔ تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے۔ تو زیادہ سے زیادہ بس اِسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے، تاکہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اس جادوگری سے، جس پر تُو نے ہمیں مجبور کیا تھا، درگزر فرمائے۔ اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ جو مجرم بن کر اپنے رب کے حضور حاضر ہو گا اُس کے لیے جہنم ہے جس میں وہ نہ جئے گا نہ مرے گا۔ اور جو اس کے حضور مومن کی حیثیت سے حاضر ہو گا، جس نے نیک عمل کئے ہوں گے، ایسے سب لوگوں کے لیے بلند درجے ہیں، سدا بہار باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جزا ہے اس شخص کی جو پاکیزگی اختیار کرے۔

ہم نے موسیٰؑ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ، اور ان کے لیے سمندر میں سے سُوکھی سڑک بنا لے۔ تجھے کسی

کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ (سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے) ڈر لگے۔

پیچھے سے فرعون اپنا لشکر لے کر پہنچا اور پھر سمندر اُن پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔ فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ ہی کیا تھا، کوئی صحیح رہنمائی نہیں کی تھی۔

آخر کار حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر لیجانے میں کامیاب ہو گئے لیکن بنی اسرائیل چالیس سال تک کنعان یا یروشلم تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ اللہ تعالےٰ نے اسرائیلیوں کے لیے من و سلویٰ کی نعمتیں نازل کیں۔ اور ان کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی مگر وہ آگے بڑھنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ بلکہ الٹا سامری جادوگر کے بہکانے پر گائے کی پرستش شروع کر دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے بھائی اور شریکِ نبوت حضرت ہارون علیہ السلام راستے میں ہی انتقال کر گئے ان کی وفات کے بعد بنی اسرائیل اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

(۱۷) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے مقاصد

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمانے کا مقصد اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک میں سورۂ طٰہٰ کی آیات نمبر ۴۷ اور ۴۸ میں درجِ ذیل طریقے پر بیان فرمایا ہے۔

ترجمہ:۔" فرمایا ڈرو مت۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں، جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادہ ہیں۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی

ہے اس کیلئے جو راہ راست کی پیروی کرے۔ ہم کو وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اسکے لیے جو جھٹلائے اور منھ موڑے"۔ یعنی صرف یہ کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم و ستم سے نجات دلا کر فلسطین سے لے جانا۔ اس ذمّہ داری کو پورا کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کئی معجزے عطا کیے گئے اور ان کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔ مگر آپ بصد مشکل اس کام کے لیے تیار ہوئے۔

قرآن پاک یا کتابِ مقدس میں اس قسم کا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا کہ جس سے یہ قیاس کیا جا سکے کہ :۔

(ا) اسلامی ریاست کا قیام حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے مقاصد میں شامل تھا، یا پھر

(ب) فرعون کی غیر اسلامی حکومت کا تختہ الٹ دینا آپ کے فرائض میں شامل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پوری جدّ و جہد اس امر کی غمّاص ہے کہ آپ نے ہمیشہ بنی اسرائیل کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کو اپنا نصب العین بنائے رکھا اور ان کے دلوں میں خدا پرستی کے عقیدے کو راسخ کرنے کی کوشش کی۔ آپ نے کہیں بھی کسی مملکت کے قیام یا کسی ملک کے انتظام و انصرام کو اپنی توجہات و ترجیحات کا مرکز نہیں بنایا۔

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل نے کوہِ طور کے قریب قیام کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن تک کوہِ طور پر مصروفِ عبادت رہے اور اپنی غیر حاضری میں حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ کوہِ طور پر تین اہم واقعات رونما ہوئے جو درجِ ذیل ہیں :۔

(i) حضرت موسیٰ علیہ السلّام اللہ تعالےٰ سے ہمکلام ہوئے۔

(ii) حضرت موسیٰ علیہ السلّام نے اللہ تعالےٰ کے دیدار کی خواہش کی۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا یہ ممکن نہیں اللہ تعالےٰ نے پہاڑ پر تجلّی کی۔ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلّام بے ہوش ہو گئے۔

(iii) اللہ تعالےٰ نے پتھر کی سِلوں پر احکامات لکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلّام کے حوالے کئے۔ قرآن پاک کے پارہ نمبر ۹ سورۃ الاعراف آیات نمبر ۱۴۵ تا ۱۴۷ میں اس واقعہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

" اس کے بعد ہم نے موسیٰؑ کو ہر شعبۂ زندگی کے متعلق نصیحت اور ہر پہلو کے متعلق واضح ہدایت تختیوں پر لکھ کر دی اور اس سے کہا:۔

" ان ہدایات کو مضبوط ہاتھوں سے سنبھال اور اپنی قوم کو حکم دے کہ ان کے بہتر مفہوم کی پیروی کریں۔ عنقریب میں تمھیں فاسقوں کے گھر دکھاؤں گا۔ میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں، وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہ لائیں گے، اگر سیدھا راستہ اُن کے سامنے آئے تو اُسے اختیار نہ کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ نظر آئے تو اس پر چل پڑیں گے، اس لیے کہ انہوں نے ہماری نشانیوں کو جُھٹلایا اور ان سے بے پروائی کرتے رہے ہماری نشانیوں کو جس کسی نے جھٹلایا اور آخرت کی پیشی کا انکار کیا اس کے سارے اعمال ضائع ہو گئے۔ کیا لوگ اس کے سوا کچھ اور جزا پا سکتے ہیں کہ جیسا کریں ویسا بھریں"؟

بائیبل کی کتاب خروج باب نمبر ۳۱ آیت نمبر ۱۸ میں اِن احکامات کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

" اور جب خداوند کوہِ سینا پر موسیٰؑ سے باتیں کر چکا تو اس نے اُسے شہادت کی دو لوحیں دیں۔ وہ لوحیں پتھر کی اور خدا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں"۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام کوہِ طور سے واپس آئے اور دیکھا کہ آپ کی قوم ایک بچھڑے کی پوجا کر رہی ہے تو آپ کو سخت غصّہ آیا۔ اس پر آپ نے حضرت ہارون علیہ السّلام کو خوب ڈانٹ پلائی اور بائیبل کے بیان کے مطابق احکامات کی تختیاں زمین پر دے ماریں اور اُن کو توڑ ڈالا۔ ان تختیوں پر درج شدہ دس احکامات بنیٔ نوعِ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کے لیے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔

وہ دس احکامات حسبِ ذیل ہیں :-

(۱۸) دس احکامات

(i) میرے علاوہ کسی اور کو اپنا خدا نہ بنانا۔

(ii) اپنے لیے کوئی بُت نہ بنانا، نہ اس کے سامنے سجدہ کرنا، نہ ہی اس کی عبادت کرنا۔

(iii) بے کار باتوں میں اپنے خداوند کا نام نہ لینا۔

(iv) سبت کے دن کا تقدّس قائم رکھنے کے لیے اس دن کو یاد رکھنا۔

(v) اپنے باپ اور اپنی ماں کی عزّت کرنا۔

(vi) کسی کو قتل نہ کرنا۔

(vii) زنا نہ کرنا۔

(viii) چوری نہ کرنا۔

(ix) جھوٹ نہ بولنا۔

(x) کسی ایسی چیز کی خواہش نہ کرنا جو تمہارے ہمسائے کی ہو۔

اگر بغور جائزہ لیا جائے تو آج بھی پوری دنیا کے اخلاقی نظام کی بنیاد

انہی دس احکامات یا اصولوں پر استوار کی گئی ہے۔ ان میں سب سے اہم اصول سبت کے دن کا ہے۔ اس دن کی حقیقت کا علم بہت کم لوگوں کو ہے لیکن اس کے باوجود یہ پوری دنیا میں نافذ العمل ہے۔ کتابِ مقدس اور قرآنِ پاک میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کہ اللہ تبارک وتعالےٰ نے کائنات کو چھ دن میں تعمیر کیا اور ساتویں دن آرام کیا۔ یعنی سبت کا سیدھا سادا مفہوم ہفتے میں ایک دن کی چھٹی ہے۔ خواہ یہ چھٹی کسی بھی دن کی جائے اصولی طور پر ہفتے میں ایک دن کی چھٹی پوری دنیا میں منائی جاتی ہے۔

ان احکامات میں ریاستوں کی تشکیل یا اقتدارِ اعلیٰ حاصل کرنے یا منتقل کرنے کے متعلق کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ ظاہر ہوا کہ ملکی سیاست کے اصول طے کرنا مقاصدِ نبوّت میں شامل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ارضِ فلسطین تو بے شک دیدی لیکن وہاں پر اسلامی ریاست قائم کرنے کے متعلق کوئی حکم آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی حکومتوں کی تشکیل اور اعلان سے متعلق جملہ معاملات طے کرنا اللہ تعالےٰ نے بنی نوعِ انسان کی صوابدید پر چھوڑ دیئے ہیں۔

(۱۹) یشوع بن نون کی قیادت

حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور حضرت ہارون علیہ السّلام کے انتقال کے بعد اللہ کی طرف سے بنی اسرائیل کی قیادت یشوع بن نون کے سپرد کی گئی۔ بائیبل کی کتاب یشوع میں اس تقرّری کا ذکر درج ذیل انداز میں کیا گیا ہے:۔

(باب نمبر ۱۔ آیات نمبر ۱ تا ۱۱)

آیت نمبر ۱:۔ "اور خداوند کے بندہ موسیٰؑ کی وفات کے بعد ایسا ہوا کہ خداوند

نے اس کے خادمِ نون کے بیٹے یشوعؔ سے کہا۔"

آیت نمبر۲ :۔ "میرا بندہ موسیٰؑ مر گیا ہے سو اب تو اُٹھ اور ان سب لوگوں کو ساتھ لے کر اس یردن کے پار اُس ملک میں جا جسے میں اُن کو یعنی بنی اسرائیل کو دیتا ہوں۔"

آیت نمبر۳ :۔ "جس جس جگہ تمہارے پاؤں کا تلوا ٹِکے اس کو جیسا میں نے موسیٰؑ سے کہا میں نے تم کو دیا ہے۔"

آیت نمبر۴ :۔ "بیابان اور اس لُبنان سے لے کر بڑے دریا یعنی دریائے فرات تک حتیّوں کا سارا ملک اور مغرب کی طرف بڑے سمندر تک تمہاری حد ہو گی۔"

آیت نمبر۵ :۔ "تیری زندگی بھر کوئی شخص تیرے سامنے کھڑا نہ رہ سکے گا۔ جیسے میں موسیٰ کے ساتھ تھا ویسے ہی تیرے ساتھ رہوں گا۔ میں اور نہ تجھ سے دست بردار ہونگا اور نہ تجھے چھوڑوں گا۔"

آیت نمبر۶ :۔ "سو مضبوط ہو جا اور حوصلہ رکھ کیونکہ تو اِس قوم کو اُس ملک کا وارث کرائے گا جسے میں نے اُن کو دینے کی قسم ان کے باپ دادا سے کھائی۔"

آیت نمبر۷ :۔ "تو فقط مضبوط اور نہایت دلیر ہو جا کہ احتیاط رکھ کر اُس ساری شریعت پر عمل کرے جس کا حکم میرے بندہ موسیٰؑ نے تجھ کو دیا۔ اس سے نہ داہنے ہاتھ مُڑنا اور نہ بائیں تاکہ جہاں کہیں تو جائے تجھے خوب کامیابی حاصل ہو۔"

آیت نمبر۸ :۔ "شریعت کی یہ کتاب تیرے منہ سے نہ ہٹے بلکہ تجھے دن اور رات اِسی کا دھیان ہو تاکہ جو کچھ اس میں لکھا ہے اس پر تو احتیاط کر کے

عمل کر سکے، کیونکہ تب ہی تجھے اِقبال مندی کی راہ نصیب ہو گی اور تو خوب کامیاب ہو گا۔"

آیت نمبر ۹: "کیا میں نے تجھ کو حکم نہیں دیا، سو مضبوط ہو جا اور حوصلہ رکھ۔ خوف نہ کھا اور بیدل نہ ہو کیونکہ خداوند تیرا خدا جہاں جہاں تو جائے تیرے ساتھ رہے گا۔"

آیت نمبر ۱۰: "تب یشوع نے لوگوں کے منصبداروں کو حکم دیا کہ۔"

آیت نمبر ۱۱: "تم لشکر کے بیچ سے ہو کر گزرو اور لوگوں کو یہ حکم دو کہ تم اپنے لیے زادِ راہ تیار کر لو کیونکہ تین دن کے اندر تم کو اس یردن کے پار ہو کر اس ملک پر قبضہ کرنے کو جانا ہے جسے خداوند تمہارا خدا تم کو دیتا ہے تاکہ تم اُس کے مالک ہو جاؤ۔"

یشوع کی قیادت میں بنی اسرائیل نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور یشوع نے یہ علاقہ بنی اسرائیل کے مختلف قبائل میں بانٹ دیا۔ یشوع کا ایک سو دس سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ بنی اسرائیل اس علاقے میں کوئی منظم اور مستحکم حکومت قائم کرنے میں ناکام رہے۔ اس کے برعکس انہوں نے وہاں قبائلی طرز کی ریاستیں قائم کیں اور مقامی آبادی کے ساتھ معاہدے کر لیے۔ یہ قومیں بُت پرست تھیں ان کے سب سے بڑے بُت کا نام بیل تھا۔ اس کو زمین و آسمان کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں ایک شمالی علاقوں کے لیے اور دوسری فلسطین کے لیے۔ یہ دونوں افزائش نسل کی دیویاں تھیں۔ اس قوم کی عبادت گاہیں زنا کاری کا اڈہ تھیں عورتوں کو دیوداسیاں بنا کر عبادت گاہوں میں رکھا جاتا تھا اور ان کے ساتھ بدکاری کرنے کو عین عبادت سمجھا جاتا تھا۔ بنی اسرائیل توحید پرستی کا عقیدہ

لے کر آئے تھے، مگر وہ مقامی حالات سے متاثر ہو کر بُت پرستی میں مصروف ہو گئے۔ بائیبل کی کتاب زبور باب نمبر ۱۰۶ آیات ۳۴ تا ۴۱ میں بنی اسرائیل کے کردار کا تذکرہ درجِ ذیل انداز میں کیا گیا ہے :۔

" انہوں نے ان قوموں کو ہلاک نہ کیا جیسا کہ خداوند نے ان کو حکم دیا تھا بلکہ ان قوموں کے ساتھ مل گئے اور ان کے جیسے کام سیکھ گئے۔ اور ان کے بتوں کی پرستش کرنے لگے۔ جو ان کے لیے پھندا بن گئے بلکہ انہوں نے اپنے بیٹے بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا یعنی اپنے بیٹے اور بیٹیوں کا خون بہایا۔ جن کو انہوں نے کنعان کے بتوں کے لیے قربان کر دیا اور ملک خون سے ناپاک ہو گیا یوں وہ اپنے ہی کاموں سے آلودہ ہو گئے اور اپنے فعلوں سے بیوفا بنے۔ اس لیے خدا کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث سے نفرت ہو گئی اور اس نے ان کو قوموں کے قدموں میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمران ہو گئے ۔"

مفتوحہ قومیں بنی اسرائیل کی دشمن بن چکی تھیں چنانچہ انہوں نے ایک متحدہ محاذ قائم کر کے مختلف معرکوں میں بنی اسرائیل کو بہت بڑے علاقے سے محروم کر دیا۔ حتیٰ کہ ان سے تابوت سکینہ یعنی خداوند کے عہد کا صندوق بھی چھین لیا۔ حالات سے مجبور ہو کر یہ لوگ اپنے نبی سموئیل علیہ السلام کے پاس آئے اور ان سے درخواست کی کہ ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کیا جائے۔ حضرت سموئیل علیہ السلام کو اسرائیلیوں کی یہ بات بُری لگی آپ نے خداوند سے دعا کی۔ اللہ تعالےٰ نے آپ کو ان کی بات مان لینے کا حکم دیا اور یہ بھی کہا کہ ان کو بتا دو کہ جو بادشاہ ان پر

حکومت کرے گا اس کا طریقہ کیسا ہو گا، اس کی تفصیل بائیبل کی کتاب ا۔سموئیل باب نمبر ۸ آیات نمبر ۸ تا ۲۲ میں بیان ہوئی ہے اسے درجِ ذیل ملاحظہ فرمایئے :۔

آیت نمبر ۸:۔ "جیسے کام وہ اس دن سے جب سے میں ان کو مصر سے نکال لایا آج تک کرتے آئے ہیں کہ مجھے ترک کر کے اور معبودوں کی پرستش کرتے رہے ہیں ویسا ہی وہ تجھ سے کرتے ہیں۔"

آیت نمبر ۹:۔ "سو تو اُن کی بات مان تو بھی تو سنجیدگی سے ان کو خوب جتا دے اور ان کو بتا بھی دے کہ جو بادشاہ ان پر سلطنت کرے گا اس کا طریقہ کیسا ہو گا۔"

آیت نمبر ۱۰:۔ "اور سموئیل ان لوگوں کو جو اس سے بادشاہ کے طالب تھے خداوند کی طرف باتیں کہہ سنائیں۔"

آیت نمبر ۱۱:۔ "اور اس نے کہا کہ جو بادشاہ تم پر سلطنت کرے گا اس کا طریقہ یہ ہو گا کہ وہ تمہارے بیٹوں کو لے کر اپنے رتھوں کے لیے اور اپنے رسالے میں نوکر رکھے گا اور وہ اس کے رتھوں کے آگے دوڑیں گے۔"

آیت نمبر ۱۲:۔ "اور وہ ان کو ہزار ہزار کے سردار اور پچاس پچاس کے جمعدار بنائے گا اور بعض سے ہل جُتوائے گا اور فصل کٹوائے گا اور اپنے لیے جنگ کے ہتھیار اور اپنے رتھوں کے ساز بنوائے گا۔"

آیت نمبر ۱۳:۔ "اور تمہاری بیٹیوں کو لے کر گندھن اور باورچن اور نان پز بنائے گا۔"

آیت نمبر ۱۴:۔ "اور تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں اور زیتون کے باغوں کو جو اچھے سے اچھے ہوں گے لے کر اپنے خدمت گاروں کو عطا

کرے گا۔"
آیت نمبر ۱۵: "اور تمہارے کھیتوں اور تاکستانوں کا دسواں حصّہ لے کر اپنے خوجوں اور خادموں کو دے گا۔"
آیت نمبر ۱۶: "اور تمہارے نوکر چاکروں اور لونڈیوں اور تمہارے شکیل جوانوں اور تمہارے گدھوں کو لے کر اپنے کام پر لگائے گا۔"
آیت نمبر ۱۷: "اور وہ تمہاری بھیڑ بکریوں کا بھی دسواں حصّہ لے گا تو تم ان کے غلام بن جاؤ گے۔"
آیت نمبر ۱۸: "اور تم اس دن اس بادشاہ کے سبب سے جسے تم نے اپنے لیے چُنا ہو گا فریاد کرو گے۔ پر اس دن خداوند تم کو جواب نہ دیگا۔"
آیت نمبر ۱۹: "تو بھی لوگوں نے سموئیل کی بات نہ سُنی اور کہنے لگے نہیں ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اُوپر ہو۔"
آیت نمبر ۲۰: "تاکہ ہم بھی اور سب قوموں کی مانند ہوں اور ہمارا بادشاہ ہماری عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہماری طرف سے لڑائی کرے۔"
آیت نمبر ۲۱: "اور سموئیل نے لوگوں کی سب باتیں سنیں اور اُن کو خداوند کے کانوں تک پہنچایا۔"
آیت نمبر ۲۲: "اور خداوند نے سموئیل کو فرمایا تو ان کی بات مان اور ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کر۔ تب سموئیل نے اسرائیل کے لوگوں سے کہا کہ تم سب اپنے اپنے شہر کو چلے جاؤ۔"
قرآن پاک میں اس واقعہ کا ذکر اور اس کے بعد کے نتائج کا بیان پارہ نمبر ۱ سورۂ البقرہ آیات نمبر ۲۴۶ تا ۲۵۷ میں تفصیل کے ساتھ آیا

ہے آیات نمبر ۲۴۶ تا ۲۴۸ کا ترجمہ درج ذیل پیش کیا جارہا ہے :۔

" پھر تم نے اس معاملے پر بھی غور کیا، جو موسیٰ کے بعد سردارانِ بنی اسرائیل کو پیش آیا تھا۔ انہوں نے اپنے نبی سے کہا: ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کرو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے پوچھا: کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ تم کو لڑائی کا حکم دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو۔ وہ کہنے لگے: بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں، جبکہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیئے گئے۔ مگر جب ان کو جنگ کا حکم دیا گیا، تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے، اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔

اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لیے بادشاہ مقرر کیا ہے۔ یہ سن کر وہ بولے: " ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حقدار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مالدار آدمی نہیں ہے "، نبی نے جواب دیا: " اللہ نے تمہارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے اور اس کو دماغی و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں اور اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے، اللہ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے "۔ اس کے ساتھ ان کے نبی نے اُن کو یہ بھی بتایا کہ " خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمہیں واپس مل جائے گا، جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے، جس میں آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں اور جس کو اس وقت فرشتے سنبھالے ہوئے ہیں۔ اگر تم مومن ہو، تو یہ تمہارے

بیلیے بہت بڑی نشانی ہے۔"

ہر چند کہ خداوند تعالےٰ اور سموئیل علیہ السلام نے بادشاہ بنانے کی تجویز کو پسند نہ کیا تاہم اللہ تعالےٰ کے حکم سے حضرت سموئیل علیہ السلام نے قبیلہ بن بنیامین سے ایک تیس سالہ نوجوان کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کر دیا۔ اس شخص کا نام ساؤل تھا۔ یہ بہت ہی خوبصورت اور دراز قد انسان تھا عام آدمی اس کے کاندھوں تک آتے تھے۔ ساؤل گھر سے اپنے باپ کے گمشدہ گدھے کی تلاش میں نکلا تھا۔ وہ جب حضرت سموئیل علیہ السلام کے گھر کے قریب پہنچا تو اللہ تعالےٰ حضرت سموئیل کو اشارہ کیا کہ یہی ہے وہ شخص جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا سموئیل علیہ السلام اسے اپنے گھر لائے۔ تیل کی کپی لے کر اس کے سر پر انڈیلی اور اُسے چوما اور کہا کہ "خداوند نے تجھے مسح کیا تاکہ تو اس کی میراث کا پیشوا ہو۔" اس کے بعد انھوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع کر کے اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ (حوالہ: ۱۔سموئیل باب ۹ اور ۱۰)

پہلے تو بنی اسرائیل نے انتخاب پر اعتراض کیا مگر بعد میں اس کو بادشاہ بنانے پر راضی ہو گئے۔ ساؤل بنی اسرائیل کے لشکر کی قیادت کرتا ہوا فلسطین کے مدِمقابل پہنچ گیا۔ فلسطینیوں کا زبردست پہلوان جالوت میدان میں اترا اور اس نے اسرائیلیوں کو دعوتِ مبارزت دی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اس وقت ایک کمسن نوجوان تھے لیکن بہت ہی بہادر تھے۔ آپ نے جالوت کو قتل کر دیا۔ اسرائیلی فتح سے ہمکنار ہو گئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ بادشاہ ساؤل نے ان سے اپنی لڑکی بیاہ دی اور ساؤل کے بعد آپ بنی اسرائیل کے دوسرے بادشاہ

بن گئے۔

اس طرح ساؤل بنی اسرائیل بلکہ اہل کتاب کے پہلے بادشاہ مقرر ہوئے تھے گویا سیاسی قیادت کو مذہبی قیادت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا اور یہ علیحدگی اللہ تعالٰے کے حکم سے عمل میں لائی گئی تھی اور اس علیحدگی کی کاروائی ایک نبی یعنی حضرت سموئیل علیہ السلام کے ہاتھوں مکمل ہوئی تھی۔ ساؤل نے بنی اسرائیل کی پہلی باقاعدہ ریاست یہودواہ کی بنیاد رکھی۔ حضرت داؤد علیہ السلام دوسرے اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام اس ریاست کے تیسرے بادشاہ تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں یہ ریاست ترقی اور خوشحالی کے اعتبار سے عرُوج پر تھی۔ آپ نے پچاس سال تک حکومت کی۔ اور آپ کی وفات کے بعد یہ ریاست دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں میں نبوّت اور بادشاہت یکجا رہے۔ لیکن اس کے بعد دونوں ادارے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اور اس کے بعد بادشاہت کا ادارہ اتنا مضبوط ہو گیا کہ اسرائیلی بادشاہوں نے بہت سے انبیاء کو یا تو قتل کر دیا یا جِلاوطن ہونے پر مجبور کر دیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوّت کا سلسلہ بنی اسرائیل سے منتقل ہو کر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں آگیا۔ اور اللہ تعالٰے نے آپ کی اولاد سے پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور اپنی آخری کتاب ہدایت یعنی قرآنِ پاک ان پر نازل فرمائی۔ ان حقائق کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی کہ اسلامی ریاست کا تصور محض مفاد پرست عناصر کی اختراع ہے اور اس کا اسلامی نظریۂ حیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

خلافتِ راشدہ

بلاشبہ خلفائے راشدین کا دورِ حکومت دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے ایک مثالی "نظامِ حکومت" خیال کیا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس قسم کا "آیڈیل دورِ خلافت" اب صرف انسانی ذہنوں میں تو قائم ہو سکتا ہے لیکن عملاً اس مادی دنیا میں اس کا قیام پذیر ہونا ممکن نہیں اس لیے کہ اس کی دو بڑی اور اہم درجِ ذیل وجوہات ہیں۔

(۱) معاشرتی پس منظر اسلام سے قبل عرب میں کوئی منظم ریاست موجود نہیں تھی۔ تمام آبادی مختلف قبائل میں منقسم تھی اور ہر قبیلے کی قیادت قبائلی سربراہ کے ذمے ہوتی تھی۔ سربراہ کا انتخاب قبیلے کے افراد کی رضامندی سے کیا جاتا تھا۔ یہ انتخاب اُمیدوار کے شریفانہ خصائل اور ذاتی اوصاف کی بنیاد پر عمل میں آتا تھا۔ قبائلی سردار اپنے قبیلے کے داخلی معاملات اور دوسرے قبائل کے ساتھ تنازعات طے کرانے کا ذمّہ دار ہوتا تھا۔ قبائلی سردار یہ فرائض محض اپنی صوابدید پر یا پھر اپنے مشیروں کی مدد سے سرانجام دیتا تھا۔ پورے ملک میں صرف مکّہ اور مدینہ دو ہی مخصوص شہر تھے۔ مکّہ کو خانۂ کعبہ کی وجہ سے خاص اہمیت حاصل تھی کیونکہ خانۂ کعبہ صرف عبادات کا مرکز ہی نہیں تھا بلکہ یہاں قبائل کے تمام اہم معاملات اور تنازعات کے فیصلے بھی کیے جاتے تھے۔ مکّہ شہر میں کُل بارہ قبائل تھے شہری آبادی کے تمام مسائل اور تنازعات طے کرنے کی ذمّہ داری

مختلف قبائل کے سربراہوں کے سپرد ہوتی تھی چونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام لانے سے قبل اس قسم کی ذمہ داری انجام دیتے رہے تھے چنانچہ اسی معاشرتی پس منظر میں جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مسلم جماعت کا قائد منتخب کیا گیا تو اس انتخاب سے عربوں کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں کوئی بنیادی تبدیلی رُونما نہیں ہوئی تھی کیونکہ خلیفۃ المسلمین ایک عام شہری کی طرح ہی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ اپنی روزی حسبِ سابق خود ہی کماتے اور مسلم ملّت کے معاملات اکابرین کے مشورے سے طے کرتے تھے۔ عرب معاشرے میں تبدیلی کا آغاز خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ حکومت میں ہوا۔ آپ کے عہدِ خلافت میں مسلم ریاست کی حدود نے بے پناہ وسعت اختیار کر لی اور دنیا بھر کے خزائن مدینہ منورّہ کی گلیوں میں سمٹ آئے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عجمی افکار اور نظریات بھی عربی معاشرت میں داخل ہونا شروع ہو گئے یہ انہی حالات کا نتیجہ تھا کہ بالآخر حضرت امیر معاویہؓ نے خلافتِ راشدہ کی روایات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر کے خاندانی بنیاد پر پہلی مسلمان بادشاہت قائم کی تھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ خلافتِ راشدہ اپنے تمام تر فیوض و برکات کے باوجود تیس سال سے آگے نہ بڑھ سکی جبکہ حضرت امیر معاویہؓ کی قائم کردہ خاندانی بادشاہت اپنی تمام تر خرابیوں اور برائیوں کے باوجود آج تک دنیا کے مختلف مسلمان ممالک میں قائم ہے۔ اس صدی میں مسلم ملّت کا سب سے بڑا کارنامہ ایران کا وہ اسلامی انقلاب ہے جس میں ''ولایتِ فقیہہ'' کے اصول پر اسلامی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت اور ایران کی انقلابی حکومت کے تقابلی مطالعہ سے ہر دو حکومتوں کے درمیان پائے جانیوالے مشترک عناصر کو

بخوبی دیکھا، سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

(۲) خلافت حضرت عثمان غنیؓ

اسلامی حکومت کے خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کے دوران عجمی اثرات نے مسلمانوں کے سیاسی نظام میں ٹھوس شکل اختیار کر لی تھی جسے مختصر طور پر حسبِ ذیل واقعات سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

(۱) **بنو امیہ میں عہدوں کی تقسیم:** حضرت عثمانؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں بنو امیہ کو نہ صرف بیت المال کے عطیات سے نوازا بلکہ انھیں بڑے بڑے عہدے بھی دیئے تھے۔ آپ نے کوفے کی گورنری سے سعدؓ بن ابی وقاص کو معزول کر کے ان کی جگہ اپنے سوتیلے بھائی ولید بن عقبہ کو کوفے کا گورنر بنا دیا تھا اسی طرح آپؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بصرے کی گورنری سے ہٹا کر ان کی جگہ اپنے ماموں زاد بھائی عبداللہ بن عامر کو بصرے کا گورنر بنا دیا۔ مصر کی گورنری سے حضرت عمرو بن العاصؓ کو معزول کر کے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن سعد کو مصر کا گورنر بنا دیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت امیر معاویہؓ کو دمشق کا گورنر بنا دیا تھا جبکہ حضرت عثمانؓ نے آپ کو دمشق، حمص، فلسطین اردن اور لبنان کا گورنر بنا دیا۔ علاوہ ازیں آپؓ نے اپنے چچا زاد بھائی مروان بن الحکم کو اپنا سیکریٹری مقرر کر دیا۔ جس نے نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے تمام اختیارات پر قبضہ کر لیا۔

(۲) **بادشاہت کے انداز:** ولید بن عقبہ جب حضرت عثمان غنیؓ سے کوفے کی گورنری کا حکم نامہ لے کر کوفہ پہنچا تو کوفہ کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اس سے کہا کہ:

"معلوم نہیں تو ہمارے بعد زیادہ دانا ہو گیا ہے یا ہم تیرے بعد احمق ہو

گئے ہیں۔"

جواباً ولی عہد عقبہ نے کہا:۔

"ابو اسحاق برافروختہ نہ ہو یہ تو بادشاہی ہے۔ صبح کوئی اس کے مزے لوٹتا ہے تو شام کو کوئی اور۔"

حضرت سعدؓ نے فرمایا:۔

"میں سمجھتا ہوں واقعی تم لوگ اسے بادشاہی بنا کر چھوڑو گے۔"

ولید بن عقبہ شراب پینے کے عادی تھے۔ فرائض کے اعتبار سے نماز کی امامت کرنا گورنر یا خلیفہ کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ ایک روز ولید نے نشے کی وجہ سے صبح کی نماز میں چار رکعتیں پڑھا دیں اور پھر لوگوں سے پوچھا، کافی ہیں۔؟ یا اور پڑھاؤں؟ اس واقعہ کی اطلاع جب حضرت عثمان غنیؓ تک پہنچی تو آپ نے نہ صرف اسے امارت سے ہٹا دیا بلکہ شراب نوشی کے الزام میں حد بھی جاری فرمائی۔

(iii) **خانہ جنگی اور خلفاء کی شہادت**:۔ حضرت عثمان غنیؓ کی خلافت کے دوران مسلم مملکت مختلف وجوہات کی بناء پر داخلی انتشار اور خانہ جنگی کا شکار ہوگئی تھی۔ یہ اسی داخلی انتشار کا نتیجہ تھا کہ دو اکابرین خلفاء یعنی حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ کو خود مسلمانوں نے دن دہاڑے شہید کر دیا۔ امیر المومنین حضرت علیؓ اور امیر شام حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کی وجہ سے مسلم ملت کے درمیان شدید جنگیں ہوئیں، جن میں لاکھوں مسلمان شہید ہو گئے اور آخر کار خلافت کو اموی خاندان کی شہنشاہیت میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان ٹھوس حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اکابرینِ اسلام جن میں صحابہ کرامؓ بھی شامل

تھے، مطلق العنان بادشاہی کے قیام کی مخالفت نہ کر سکے۔

(۱۷) رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیم و تربیت :۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی تعلیم و تربیت سے صحابہؓ کرام کا ایک خاص طبقہ تیار کیا تھا جن کو بلاشبہ ہر اعتبار سے مکمل انسان اور کامل مسلمان کہا جا سکتا ہے بقول شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے :۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

یہ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نظر کا ہی فیض تھا جس کے باعث آنحضورؐ کے صحابہؓ نے فقر و شہنشاہی کی تفریق کو بالکل ختم کر دیا تھا۔ آج کی دنیا میں نہ وہ معلّم ہے اور نہ ہی وہ متعلم۔ اس لیے خلافتِ راشدہ جیسی حکومت کا قائم ہونا عملاً ناممکن ہے۔

(۱۸) حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت :۔ حضرت امیر معاویہؓ کو ۳۵ سال کی عمر میں حضرت عمرؓ نے دمشق کا گورنر بنا دیا تھا۔ آپ نے روزِ اوّل سے ہی شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے اپنی امارت کا آغاز کیا۔ ایک مرتبہ جب حضرت عمرؓ نے دمشق کے قیام کے دوران حضرت امیر معاویہؓ کے طرزِ حکومت پر تنقید کی تو حضرت امیر معاویہؓ نے جواب دیا کہ :۔

"امیر المومنین دشمن یہاں سے بہت قریب ہے اس کے جاسوس اور مخبر بہت سے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ وہ شوکتِ اسلام دیکھیں۔"

اس جواب پر حضرت عمرؓ خاموش رہ گئے اور امیر معاویہؓ کو اپنے طرزِ عمل کی سندِ جواز مل گئی۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں حضرت امیر معاویہؓ کی امارت میں رقبے اور اختیارات کے اعتبار سے بہت زیادہ وسعت

پیدا ہو گئی تھی۔ آپ نے دمشق شہر میں ایک عظیم الشان محل تعمیر کروایا۔ جس کا نام "قصرِ خضریٰ" رکھا گیا۔ حضرت امیر معاویہؓ اپنے علاقے کے مکمل طور پر خود مختار حکمران تھے اور مرکزِ خلافت سے آپ کا تعلق برائے نام تھا یہی وجہ ہے کہ آپ نے نہ صرف امیر المومنین حضرت علیؓ کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا تھا بلکہ آپ کے خلاف صفینؔ کے مقام پر باقاعدہ جنگ بھی کی تھی لیکن ان کی کمزوریوں کے باوجود حضرت امیر معاویہؓ نے کمالِ تدبّر اور حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے ۴۱ھ میں حضرت امام حسنؓ سے صلح کر کے مملکتِ اسلامیہ کی بادشاہت حاصل کر لی اور اس طرح مسلم ملّت کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

(۷۱) **حضرت امیر معاویہؓ کا سیاسی تدبّر:** اس حقیقت میں کوئی شک کی گنجائش نہیں کہ حضرت امیر معاویہؓ کی شخصیت اسلامی دنیا کے لیے بڑی متنازعہ فیہ ہے تقریباً تمام مسلم مؤرخین نے آپ کی ذات اور سیاسی کردار کو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس تنقید کی اصلی بنیادوں کو بنو امیہ اور بنی ہاشم کے درمیان پائی جانے والی قدیم قبائلی عصبیت میں بخوبی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حالات کی تبدیلی نے اِن بنیادوں پر کئی اور رنگ بھی چڑھا دیئے ہیں۔ بہر حال یہ حقیقت بالکل تسلیم شدہ ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ اسلامی دنیا کے پہلے کامیاب سیاستدان اور بیدار مغز سیاسی مفکّر تھے۔ آپ مسلمانوں کے نظامِ خلافت کے داخلی تضادات اور سیاست کے عصری تقاضوں سے یہ نتیجہ نکالنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ نظامِ خلافت میں انتقالِ اقتدار کا کوئی واضح اصول مقرّر نہیں کیا گیا۔ اسی طرح کسی غیر مقبول خلیفہ سے بھی گلو خلاصی حاصل کرتے

کا کوئی طریقہ طے نہیں کیا گیا۔ اس لیے نظامِ خلافت کی اس بنیادی کمزوری کا یہ نتیجہ بالکل قدرتی امر ہوگا کہ ہر خلیفہ کے تقرر یا اسکے منصبِ خلافت سے علیحدگی کے موقع پر مسلمانوں کو خانہ جنگی اور خونریزی کے مراحل سے گزرنا ہوگا اس کے علاوہ آپ نے قرب وجوار کی غیر مسلم مملکتوں کے نظامِ حکومت کو دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ اس دور میں مستحکم اور پائیدار حکومت کا قیام صرف بادشاہت کے ذریعے ہی ممکن تھا چنانچہ آپ نے نہ صرف اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا بلکہ اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد سلطنت بھی مقرر کر دیا عربوں کی تاریخ میں یہ اتنا بڑا کارنامہ تھا کہ جس کی اس سے پہلے کوئی اور مثال موجود نہیں تھی۔ حضرت امیر معاویہؓ نے کمالِ تدبر سے کام لے کر مسلمانوں کے لیے ایک مستحکم اور پائیدار نظامِ حکومت کی بنیادیں فراہم کرکے ان کی سیاسی زندگی میں غیر معمولی کردار ادا کیا لیکن عجمی تعصب اور خاص طور پر ایرانیوں کی عرب دشمنی نے اُموی حکومت کا تختہ الٹ دیا اس طرح حضرت امیر معاویہؓ کے کارناموں کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اس کے باوجود اُموی خلافت کے کھنڈرات پر قائم ہونے والی عباسی خلافت ان راستوں سے سرِ مو انحراف نہ کرسکی جو حضرت امیر معاویہؓ نے مقرر کیے تھے۔

(۱۱۱) <u>ضیاء الحق کے دعوے :۔</u> جنرل ضیاء الحق نے اپنے گیارہ سالہ طویل عہدِ حکومت میں نفاذِ اسلام کے بہت سے بے بنیاد، کھوکھلے اور مضحکہ خیز دعوے کیے جن کا مفصل ذکر ہم اس کتاب کے سابقہ ابواب میں کر چکے ہیں علاوہ ازیں وہ خلافتِ راشدہ کو اپنا پسندیدہ نظامِ حکومت ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا مگر اس نے نہ تو اسلام نافذ کرنے میں ہی کوئی کامیابی حاصل کی اور نہ ہی خلفائے راشدینؓ جیسا چلن ہی پیش کرنے

میں کامیاب ہو سکا۔ البتہ اس نے حضرت امیر معاویہؓ کی سیاسی پالیسی کے بعض اصولوں پر سختی سے عمل کیا مثلاً :۔

نمبر (۱) حضرت امیر معاویہؓ کا قول تھا کہ وہ اپنے مخالفین کو پہلے زبان سے منع کرتے ہیں اگر وہ نہ مانیں تو انھیں مال و دولت دے کر راضی کر لیتے ہیں اگر کوئی مال و دولت سے بھی راضی نہ ہو سکے تو اس کے خلاف طاقت استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ فوجی آمر جنرل ضیاء الحق نے حضرت امیر معاویہؓ کی اس سُنّت پر بخوبی عمل کیا۔

(۲) حضرت امیر معاویہؓ نے اسلام کی تشریح و تعبیر صرف اپنے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ جسے چاہتے مسلمان بنا لیتے اور جس کسی کو چاہتے کافر بنا دیتے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کی ذات اور خاندان کیخلاف دشنام طرازی بھی اسی اندازِ فکر کا شاخسانہ تھی اسی لیے جنرل ضیاء الحق نے بھی اس اصول کو کما حقہ اختیار کر لیا تھا اور وہ بھی گیارہ سال تک اسلام کی تشریح و تعبیر اپنی مرضی و منشا ہی سے کرتا رہا۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اسلام کے دشمنوں کیخلاف حضرت امیر معاویہؓ کا روّیہ بہت سخت ہوتا تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی و عظمت کے سلسلے میں حضرت امیر معاویہؓ کا سب سے بڑا کارنامہ بحری بیڑے کی تیاری ہے۔ اس بحری بیڑے کی وجہ سے حضرت امیر معاویہؓ نے پوری دنیا پر مسلمانوں کی فوجی قوّت اور برتری کی دھاک بٹھا دی تھی۔ اس کے برعکس ضیاء الحق نے اپنی پست ہمتّی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے ہمیں دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دشمن امریکہ کا دست نگر اور محتاج بنا کر رکھ دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم امریکہ کے غلام بن چکے ہیں اور اس کی کالونی کے طور پر پاکستان بظاہر دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ریاست ضرور ہے لیکن

حقیقی طور پر امریکہ کے مذموم سیاسی و فوجی مقاصد کے حصول کے لئے پاکستان مہرے کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے پاکستانی عوام نے امریکہ کو کبھی بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جبکہ جنرل ضیاء الحق نے مکمل طور پہ پاکستان اور اس کی غیور و خوددار قوم کو امریکہ کی جھولی میں اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ڈال دیا ہے جس کا نتیجہ اس طویل ترین عرصے میں قوم نے مختلف انداز سے بھگتا ہے اور آئندہ بھی اس طوقِ غلامی کا اتارنا اور ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے فیصلے آپ کرنا پاکستانی قوم کے لئے اتنا آسان نہیں رہا ہے۔ انسانی تاریخ کے مطالعے سے یہ حقیقت بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنے بندے کو یکسر آزاد پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی رنگ و نسل اور خطے کے امتیاز کے بغیر کسی بھی ماں نے اپنے بچے کو قطعاً آزادانہ طور پر ہی جنم دیا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ روئے زمین پر آزاد پیدا ہونے والے ہر بچے کو ان ہی میں سے ایک نے دوسرے کو غلامی کی زنجیریں پہنا دی ہیں۔ آمریت کا سلسلہ دورِ حاضر میں کوئی نیا نہیں ہے بلکہ ہر دور میں اسکی اقسام مختلف ضرور رہی ہیں۔ چنانچہ اسی مختلف اندازِ غلامی نے فرد کو فرد کا، قوم کو قوم کا غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ لیکن وقت کی تیز رفتاری اور آزادانہ سوچ کی برق شراری نے رفتہ رفتہ افراد و قوم کو طوقِ غلامی اتارنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انشاءاللہ وہ دن دور نہیں جبکہ ہمارا وطن اور قوم بھی سامراجی آقاؤں کے تسلط سے آزاد ہو کر زندگی گزاریں گے اور پھر کسی بھی آمر کو یہ جرأت نہ ہو سکے گی کہ وہ جنرل ضیاء الحق کی طرح اپنے اقتدار کے دوام کے لیے اپنے سامراجی آقاؤں کے مذموم مقاصد کی تکمیل کی خاطر ملک و قوم کی آزادی کا سودا کر سکے۔ کاش کہ یہ لمحات ہماری زندگی میں ہی ملک و قوم کو میسّر آجائیں اور ہم بھی آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی دیرینہ آرزو کی تکمیل کر سکیں۔

امریکی مداخلت

ہم زیرِ نظر کتاب کے اوائل میں اس حقیقت کی جانب اشارہ کر چکے ہیں کہ بعض وجوہات کی بنا پر امریکہ کو برِاعظم ایشیا کے معاملات سے خصوصی دلچسپی تھی جن میں دو امور خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل یہ کہ ایشیا امریکہ کی نظر میں نفع بخش تجارتی منڈی تھی۔ دوئم یہ کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد سوویت یونین سیاسی سطح پر امریکہ کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج بن کر ابھرا تھا۔ لہٰذا امریکہ نے کمیونسٹ نظریات کا سدّباب کرنے کے لیے ایشیائی ممالک کی داخلی سیاست میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ پاکستان کے معاملات میں امریکہ نے روزِ اول ہی سے گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا بعد میں یہ دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی کہ امریکی اشارے پر پاکستان کی حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں۔ پاکستان کی پہلی جمہوری اور منتخب شدہ حکومت جناب ذوالفقار علی بھٹوؔ کی قیادت میں قائم ہوئی تھی چونکہ یہ حکومت عوام کے نمائندوں کی تھی لہٰذا سامراجی طاقت امریکہ کے لیے جناب بھٹوؔ کی شخصیت اور نظریات دونوں ہی کسی طرح بھی قابلِ قبول نہ تھے۔ ہر چند کہ جناب بھٹوؔ نے امریکہ کے ساتھ افہام و تفہیم کے لیے سنجیدہ اور اخلاص سے بھرپور کوششیں کی تھیں مگر امریکہ کے شکوک و شبہات دُور نہ ہو سکے۔ بہر حال امریکہ نے ایک طرف تو بھٹوؔ صاحب کے اقتدار اور شخصیت سے نجات حاصل کر لی جبکہ دوسری طرف وہ اپنے قابلِ اعتماد اور وفادار جرنیل کو برسرِ اقتدار لانے میں کامیاب ہوگیا۔ جنرل ضیاء امریکہ کا ایک ایسا بے مغز مہرہ تھا جسے امریکی پالیسی کے مفاد میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہر جگہ استعمال کیا جا سکتا تھا اور یہ اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ آج امریکی سفیر الطاف حسین جیسے نسلی و علاقائی لیڈر کے گھر پر جا کر ملاقاتیں

کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ امریکہ پاکستان کی داخلی سیاست میں اس حد تک ملوّث ہے کہ اس کا سفیر انتخابات کے دوران قومی اسمبلی کے امیدواروں سے ملاقاتیں کرتا ہے اور روزنامہ نوائے وقت جیسے مؤخر اخبار کو دیئے گئے انٹرویو میں یہاں تک کہنے میں کوئی عار یا جھجک بھی محسوس نہیں کرتا کہ پاکستان کے انتخابات اور انتقالِ اقتدار میں امریکہ نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ گویا پاکستان امریکہ کی نوآبادی ہے اور امریکی سفیر نے ریذیڈنٹ کے فرائض سنبھال رکھے ہیں۔ یہ اسی خارجہ پالیسی کا نتیجہ ہے جو ضیاء الحق نے صاحبزادہ یعقوب خان جیسے سفارتکاروں کے ذریعے نافذ کی تھی اور مزید ستم ظریفی کا عالم یہ ہے کہ نئی منتخب شدہ حکومت بھی صاحبزادہ یعقوب علی خان کو وزارتِ خارجہ سے الگ نہ کر سکی۔ گویا دس کروڑ انسانوں میں صاحبزادہ یعقوب خان کے علاوہ کوئی ایک بھی ایسا شخص موجود نہیں ہے۔ جو وزارتِ خارجہ کی ذمّہ داریاں احسن طریقے سے سنبھال سکے۔ اس صورتحال کا پس منظر یہ ہے کہ دو مسلمان ملکوں یعنی ایران اور افغانستان میں ایسے انقلاب برپا ہوئے جنہوں نے امریکی مفادات کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔ ہر چند کہ متذکرہ دونوں انقلابات باہمی طور پر متصادم تھے لیکن امریکہ دشمنی کا عنصر دونوں میں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان دونوں انقلابات کی وجہ سے تمام تر فائدہ جنرل ضیاء الحق کو پہنچا۔ چنانچہ وہ نہ صرف امریکہ بلکہ پورے مغربی بلاک کی امیدوں کا مرکز بن گیا۔ یہ ضیاء الحق ہی تھا جس کی وجہ سے ایک طرف تو پاکستان روس کیخلاف ایک فرنٹ لائن اسٹیٹ میں تبدیل ہو گیا اور دوسری طرف خلیج میں امریکی مفادات کے تحفّظ کے لیے پاور بیس بن گیا۔

افغان پالیسی

تیس اپریل ۱۹۷۸ء کو ایک خونی انقلاب کے ذریعے افغانستان میں نور محمّد ترہ کئی کی قیادت میں سوشلسٹ حکومت برسرِ اقتدار آگئی۔ انقلابی حکومت نے پاکستان کے ساتھ معمول کے تعلقّات قائم رکھے۔ ۹ ستمبر ۱۹۷۸ء کو جنرل ضیاء نے کابُل کا دورہ کیا اور افغانستان کے صدر سے باہمی دلچسپی کے امُور پر بات چیت کی لیکن افغانستان کے بنیاد پرست عناصر اور ضیاء الحق اس انقلاب کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوسکے اور افغانستان میں بنیاد پرستوں نے انقلاب کی مخالفت شروع کردی اور اپنی مساعی کو جاری رکھنے کے لیے پاکستان میں ہجرت کا آغاز کردیا۔ افغان حکومت نے اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے سوویت یونین سے دفاعی معاہدہ کرلیا۔ اس معاہدے کے تحت ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کو روسی فوج افغانستان میں داخل ہوگئی۔ چنانچہ روس سے ویتنام میں شکست کا انتقام لینے کے لیے اقتصادی اور فوجی امداد کے دروازے کھول دیئے گئے۔ اس کے علاوہ مغربی بلاک نے بھی افغان مہاجرین کو بھرپور امداد دے کر افغانستان میں سوشلسٹ انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے ہر ممکن کوششیں کی ہیں۔ لیکن تاحال ان کی یہ کوششیں بارآور ثابت نہ ہوسکیں اور نہ ہی مستقبل قریب میں ایسے کوئی امکانات نظر آتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر اقوامِ متحدّہ کی زیرِ نگرانی اس مسئلے کے پُرامن حل کے لیے جنیوا معاہدہ طے پاچکا ہے لیکن اس کے باوجود امن کے آثار کہیں دُور دُور تک نظر نہیں آتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان کو آخر کار دو آزاد ریاستوں میں تقسیم کردیا جائے گا۔ افغانستان میں امریکی پالیسی کو کامیاب بنانے کی بنا پر پاکستان کو بیشک امریکہ کی

جانب سے مالی اور فوجی امداد تو ملتی رہی ہے لیکن ہمیں ایسی پالیسی کو جاری رکھنے کی جو سزا مل چکی ہے یا آئندہ ملنے والی ہے اس کے مقابلے میں اس مالی و فوجی امداد کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

افغان پالیسی کے نقصانات

افغانستان کی خانہ جنگی سے ہمارے وطن عزیز پاکستان کو ایک نقصان تو یہ ہوا کہ پاکستان کے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں افراد کو لقمۂ اجل بنایا گیا اور بیش قیمت جائیدادوں کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ دوسرا یہ کہ ملک کے اندر عدمِ استحکام اور عدمِ تحفّظ کے ہر لمحے بڑھتے خطرات کو فروغ ملا۔ لیکن اس پالیسی کا انتہائی خطرناک اور تباہ کُن نقصان یہ ہوا کہ امریکہ نے پاکستان کو ایک بے حس بھکاری اور کاسہ لیس قوم میں تبدیل کر دیا۔ ضیاء الحق کا گیارہ سالہ دورِ اقتدار پاکستان کی تاریخ کا سب سے زیادہ غیر پیداواری اور بنجر دَور ثابت ہو رہا ہے اس پورے عرصے میں ملک میں کسی بھی میدان میں کوڑے بازی کے علاوہ کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ امریکہ ضیاء الحق کی حکومت کو قائم رکھنے کے لیے اسے اقتصادی امداد دیتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہم اس امریکی امداد کے بغیر چل ہی نہیں سکتے۔ جنرل ضیاء الحق اس دنیا سے رخصت ہو گیا اور ملک میں عرصۂ دراز بعد ایک عوامی حکومت برسرِ اقتدار آچکی ہے لیکن ملکی پالیسیوں میں سر دست کوئی بنیادی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ اور نہ ہی مستقبل قریب میں کسی خاص اور بنیادی تبدیلی کا کوئی امکان ہے۔ اس کا حقیقی و بنیادی سبب یہ ہے کہ امریکہ ہمیں اس مقام پر لے آیا ہے کہ امریکی امداد اور تعاون کے بغیر ہماری کوئی بھی حکومت اپنے پاؤں پر اعتماد و یقین کے

ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔

ایران پالیسی

ایران کی پہلوی حکومت کا زوال خلیج میں امریکی مفادات پر ایک کاری ضرب تھی۔ خلیجی تیل کی پیداوار اور سپلائی پر مؤثر کنٹرول امریکی خارجہ پالیسی کا بنیادی عنصر ہے۔ ایران سے ملک بدر ہونے کے بعد امریکہ نے خلیج کے پولیس مین کی ذمہ داری پاکستان کو سونپ دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم یو۔ٹو سے ترقی کر کے پی۔تین تک پہنچ گئے ہیں۔ افغان انقلاب نے بھی خلیج میں امریکی پالیسی میں ایک نیا عنصر یہ شامل کر دیا ہے کہ سوویت یونین کو گرم پانی تک **پہنچنے کا سدِ باب** کیا جائے۔ اس نکتۂ نظر سے اپنے مفادات کے تحت امریکہ کی نظروں میں پاکستان کی قدر و منزلت میں بے پناہ اور نمایاں اضافہ ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ پاکستان کی داخلی سیاست میں بہت زیادہ ملوّث ہے۔ امریکی مفادات کے تحفّظ کے لیے بلوچستان کا صوبہ اور خاص طور پر سات سو ساٹھ کلومیٹر رقبے پر مشتمل ساحلی علاقہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ضیاء الحق نے امریکہ کو صوبۂ بلوچستان میں وسیع پیمانے پر مراعات دے رکھی تھیں۔ اس علاقے میں تئیس ہوائی اڈّے تعمیر ہو رہے ہیں۔ کوئٹہ کے جنوب مغرب میں افغانستان کی سرحد کے قریب چگان کے علاقے میں ایک زبردست ہوائی اڈّے کے رن وے کی لمبائی دس ہزار فٹ کے قریب ہے۔ امریکہ نے اپنی سریع الحرکت فوج کا نام بدل کر یو۔ایس سینٹرل کمانڈ رکھ دیا ہے۔ اس سینٹرل کمانڈ کو اپنی کاروائی کے لیے صرف ایسے مقامات کی ضرورت ہوتی ہے جہاں کہ اسلحے کا ذخیرہ کیا جا سکے اور اس کی نقل و حرکت کے لیے آمد و رفت کی سہولتیں موجود ہوں۔

جنرل ضیاءالحق نے ۱۹۸۳ء میں امریکہ کو جاسوسی طیارے پی۔تین کے ذریعے اس علاقے میں جاسوسی کرنے کی اجازت دی تھی اور اس مقصد کے لیے ماری پور کراچی کا ہوائی اڈہ استعمال کرنے کی سہولت فراہم کی تھی۔ پی۔تین مغربی دنیا کا اینٹی سب میرین وارفیر (اے۔ایس۔ڈبلیو) سمندر کی نگرانی کرنے کے لیے مخصوص طیارہ ہے۔ جبکہ یو ٹو بلندی سے زمین کی جاسوسی کرتا تھا۔ پی۔تین کا تعلق امریکہ کے بحری دفاعی نظام سے ہے۔ یہ طیارہ سوویت بحری بیڑے اور خاص طور پر ایٹمی جہازوں پر نظر رکھتا ہے۔ ۱۹۷۹ء میں امریکہ نے خلیج فارس اور جنوب مغربی ایشیاء میں اس طیارے کے ذریعے جاسوسی کے لیے پاکستان کے ہوائی اڈوں کو استعمال کیا تھا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اِسی لیے ضیاءالحق نے اپنے ایک اخباری بیان میں کہا تھا کہ "جب تک امریکی امداد جاری رہے گی اس علاقے میں امریکی مفادات کا تحفّظ کیا جائے گا۔" امریکہ نے ضیاءالحق کی وساطت سے پاکستان کو اس طرح اپنے جال میں پھانسا کہ اس سے نکل جانا انتہائی دشوار نظر آتا ہے۔

تمت بالخیر

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف
(۱)	قرآنِ مجید	(آخری آسمانی کتاب)
(۲)	کتابِ مقدس	(بائیبل)
(۳)	تفسیرِ حقانی	مولانا عبدالحق
(۴)	تفہیم القرآن	مولانا مودودی
(۵)	اسلامی ریاست	مولانا مودودی
(۶)	رسائل و مسائل	مولانا مودودی
(۷)	الجہاد فی الاسلام	مولانا مودودی
(۸)	مارشل لاء کا سیاسی انداز	ایم۔ اے۔ کے چوہدری
(۹)	مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی	اشرف ظفر
(۱۰)	تحدیثِ نعمت	چوہدری محمد ظفر اللہ خان
(۱۱)	عالمی بِل برائے حقوقِ انسانی	ثناء اللہ نور غوری
(۱۲)	آزادیٔ موہوم	ذوالفقار علی بھٹو
(۱۳)	تیسری دنیا، اتحاد کا تقاضا	ذوالفقار علی بھٹو
(۱۴)	تشکیل جدید الہیاتِ اسلامیہ	علامہ اقبال
(۱۵)	آمر کون ؟	ایس ایم ظفر
(۱۶)	بھٹو کی آواز	ظفر علی الحسن۔ فرخ سہیل گوئندی
(۱۷)	تحریک ریشمی رومال	مولانا حسین احمد مدنی
(۱۸)	نقشِ حیات	مولانا حسین احمد مدنی
(۱۹)	پاکستان کی بنیادیں	محمود علی
(۲۰)	المیہ مشرقی پاکستان	منیر احمد منیر
(۲۱)	مارشل لاء کے قیدی	پروین خان
(۲۲)	ایوانِ صدر میں سولہ سال	م۔ ب۔ خالد
(۲۳)	شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب
(۲۴)	جو میں نے دیکھا	راؤ عبدالرشید
(۲۵)	بلوچستان کا مقدمہ	نادر شاہ عادل

(۲۶) سقوطِ جونیجو — جاوید احمد صدیقی
(۲۷) جنرل ضیاء کے دس سال — بشیر ابنِ عادل
(۲۸) مارشل لاء کا وائٹ پیپر — ستار طاہر
(۲۹) شاہراہِ انقلاب — ڈاکٹر بشر حسن
(۳۰) جی۔ایچ۔کیو۔سیاست — محمد علی خالد
(۳۱) حیات امیرِ شریعت — جانباز مرزا
(۳۲) تاریخِ پاکستان — محمد علی چراغ
(۳۳) پاکستان کی خارجہ پالیسی — زاہد حسین انجم
(۳۴) آئینِ پاکستان — ڈاکٹر صفدر محمود
(۳۵) مسلم لیگ کا دورِ حکومت — ڈاکٹر صفدر محمود
(۳۶) پاکستان کیوں ٹوٹا۔؟ — ڈاکٹر صفدر محمود
(۳۷) پاکستان میں امریکہ کا کردار — قاضی جاوید
(۳۸) ظہورِ پاکستان — چوہدری محمد علی
(۳۹) پاکستان امریکہ کے چنگل میں — اقبال خان
(۴۰) پنجاب کی سیاسی تحریکیں — عبداللہ ملک
(۴۱) رودادِ چمن — پیر علی محمد راشدی
(۴۲) رقصِ مرگ — سید شبیر حسین
(۴۳) افکارِ سیاسی — نسرین معین
(۴۴) جدید اصولِ سیاست — سلطان احمد صدیقی
(۴۵) کیا عورت آدھی ہے۔؟ — پروفیسر وارث میر
(۴۶) اور لائن کٹ گئی — مولانا کوثر نیازی
(۴۷) بھٹو کی سیاست — ذوالفقار علی بھٹو
(۴۸) اسلامی دنیا، اسرائیل اور سپر طاقتیں — شکیل احمد ضیاء
(۴۹) ایوب خان — مشتاق مرزا

(انگریزی کتابیں)

(۵۰) کانسٹیٹیوشنل لاء اینڈ پاکستان افیئرز — جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ
(۵۱) اسلامائزیشن آف لاز ان پاکستان — رشیدہ پٹیل
(۵۲) فیکٹس آر فیکٹس — خان عبدالولی خان

آمریت کے سائے ایک نظر میں

- **بنیادی حقوق اور مارشل لاء!** انسان پیدائشی طور پر حقوق و مراعات کا طالب نظر آتا ہے، جبکہ فرائض کی بجا آوری بھی اس کی جبلت کا خاصہ ہے لیکن بیشتر اوقات وہ ان سے راہِ فرار اختیار کرتا نظر آتا ہے جبکہ مارشل لاء جنگل کا قانون ہے۔ یہاں صرف احکام کی پابندی کرانا مقصود ہوتا ہے برعکس اس کے حقوق کی ادائیگی کا یہاں تصور بھی نہیں ہوتا۔

- **پاکستان کے دساتیر!** ۱۹۵۶ء، ۱۹۶۲ء، ۱۹۷۳ء اور پی سی او ۱۹۸۱ء اولذکر تینوں دساتیر وطنِ عزیز کے جمہوری و نیم جمہوری آئین ہیں اور موخرالذکر آمریت کی بدترین شکل کا آئینہ دار ہے، صرف ۱۹۷۳ء کا آئین ہی متفقہ، جمہوری و اسلامی آئین ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ جس پر آج تک تمام سیاسی جماعتیں متفق ہیں۔

- **ایوب خان کا اقتدار پر قبضہ!** پہلے فوجی آمر کا جمہوریت پر قاتلانہ و بزدلانہ حملہ۔ دراصل یہی دور پاکستان کی سیاسی بنیادوں کو ختم کرنے، جمہوریت کے سیاسی اداروں کے خاتمے کا دور ثابت ہوا۔

- **یحییٰ خان اور صدارت!** پاکستان میں دوسری آمریت کا دور جو ملک کی تقسیم پر منتج ہوا اور ملک و قوم اور تاریخ عالم اسلامی زریں تاریخ کو داغدار کیا گیا، پاکستان کی بہادر مسلح افواج کے ترانوے ہزار جوانوں نے دشمن بھارت کے سامنے ہتھیار ڈالے۔

- **شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات!** بالآخر یہی نکات پاکستان کے دولخت ہونے کا باعث بنے اور انتخابی عمل ناکام کر دیا گیا سیاسی رواداری کا خاتمہ اور انتہا پسندی کا دور دورہ ہوا، اور متحدہ پاکستان اب بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد اپنی اصلی حالت برقرار نہ رکھ سکا۔ یہ تقسیم پاکستان ہی کی نہیں بلکہ مسلم امہ کی تقسیم ثابت ہوئی۔

- **ذوالفقار علی بھٹو کا عہدِ حکومت!** آمریت سے نجات اور عوامی حاکمیت کا زریں دور کا آغاز تھا جس میں ایک اور فوجی آمر جنرل ضیاء الحق نے امریکی سامراج کے اشارے پر رات کی تاریکی میں عوامی، جمہوری و آئینی حکومت کا خاتمہ کر کے ملک پر آمریت قائم کر دی۔

- **جنرل ضیاء الحق کا دورِ اقتدار!** جمہوریت کا قتل، عدلیہ کی تحقیر، بربریت، ظلم و تشدد، مذہبی منافرت، کوڑے بازی، علاقائیت و نسلی زہر کا دور، آئین کا بھونڈے انداز سے مذاق کا دور تھا جو بالآخر المناک و عبرت آمیز موت پر ختم ہوا۔

- **جنرل ضیاء الحق کا اسلام!** مکر و فریب، تنگ نظری، زر پرستی، اقتدار پرستی، جاہ و حشم کا حصول، انا کی تسکین، مذہب کا ذاتی اغراض کیلئے مفاد پرستانہ و خود غرضانہ استعمال محض یہی جنرل ضیاء الحق کا اسلام تھا۔

- **مذہب اور سیاست کا اصولی فرق!** انبیائے کرام علیہ السلام کی تبلیغ دین اور نظامِ سیاست پر یکسر خاموشی، پیغام خداوندی و توحید و رسالت کی دعوت۔ دراصل یہی مقصدِ نبوت بھی تھا نہ کہ نظامِ سیاست کا تعین انبیائے کرام کا مقصود و مطلوب تھا۔

- **خلافتِ راشدہ!** اسلامی تاریخ کا عہدِ زریں جو حضرت علیؓ پر ختم ہوا اور امیر معاویہؓ نے خاندانی بادشاہت کی بنیاد رکھی جو کسی نہ کسی صورت آج بھی اسلامی دنیا میں جاری و ساری ہے۔

- **امریکی و افغان پالیسی!** جنرل ضیاء الحق کا امریکی مفادات کے لئے ملکی مفادات کو قربان کرنا، امریکی مفادات کی جنگ ملک و قوم پر مسلط کرنا اور وطنِ عزیز کو نسلی و علاقائی عصبیت کا شکار کرنا۔